

ڈاکٹر عباس برمانی

غالب

کے زمانے کی دلی



غالب

کے زمانے کی دلی

ڈاکٹر عباس برمانی

سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور

954.023 Burman, Dr. Abbas
 Ghulib Kay Zammatay Ki Dillir
 Dr. Abbas Burman:- Lahore : Sang-e-
 Meel Publications, 2006.
 224pp. with photographs.
 I. Urdu Literature - History - Muslim
 India - Ghulib. I. Title.

اس کتاب کا کوئی بھی حصہ رنگ میل پبلی کیشنز اسمبلی سے باقاعدہ
 تحریری اجازت کے بغیر کسی بھی شائع نہیں کیا جاسکتا اگر اس قسم کی
 کوئی بھی صورت حال تصور نہ رہے توئی کارروائی کا حق محفوظ ہے

2006

نیا زاموے

رنگ میل پبلی کیشنز لاہور
 سے شائع کی۔

ISBN 969-33-1873-6

Sang-e-Meel Publications

25 Shahrah-e-Faridi, Green Mark, P.O. Box 993, Lahore-68000 Pakistan

Phones: 7220100-7228143 Fax: 7245101

http://www.sang-e-meel.com e-mail: smep@sang-e-meel.com

Chowk Urdu Bazar Lahore- Pakistan Phone: 7687976

ملکی طائفہ پرنٹرز لاہور

غالب کے ”ارادت گزین دیریں“
فرزندِ دلی الیگزینڈر سکفر کے نام

اور

محبتِ غالب
کالی داس گپتا رخصا کے نام



غالب

دلی اور غالب

اے جہاں آباد اے گہوارۂ علم و ہنر
ہیں سراپا نالہ خاموش تیرے بام و در
ذرے ذرے میں ترے خوابیدہ ہیں شمس و قمر
یوں تو پوشیدہ ہیں تیری خاک میں لاکھوں گھر
دفن تجھ میں کوئی فخر روزگار ایسا بھی ہے
تجھ میں پنہاں کوئی موتی تابدار ایسا بھی ہے

(علامہ محمد اقبال - بانگِ درا)

فہرست

صفحہ نمبر	مضمون	نمبر شمار
۹	اعلیٰ ہر تفکر	۱۔
۱۱	عرض مؤلف	۲۔
۱۵	عباس برہانی کا دینی تحقیق اور سبک جھٹکن	۳۔
۱۹	غالب ہقلم خود	۴۔
۲۶	سیر دہلی..... کوچہ بازار عمارات	۵۔
۳۰	قلعہ معلیٰ	۶۔
۳۷	دہلی کے ہاؤز جامع مسجد انگریزوں کی چوک کا	۷۔
۵۳	پھول والوں کی سیر	۸۔
۵۸	عیدین بھولی دہلی والی نوروز اور محرم	۹۔
۶۵	دہلی کی زبان اردو بھولی بھولی ہندی اردوئے معلیٰ	۱۰۔
۷۱	انیسویں صدی کی دہلی کے بکھ بڑے شاعر	۱۱۔
۷۸	دہلی کا آخری بادشاہ	۱۲۔
۸۶	نصیر الدین کرل جیس سکریہا اور غالب جنگ..... دہلی اور انگریز	۱۳۔
۹۶	دہلی کے مصور	۱۴۔
۱۰۱	دہلی کے موسیقار اور مرثیہ	۱۵۔
۱۰۵	نکھتا شوہر غالب	۱۶۔
۱۰۸	قلعہ معلیٰ اور شہر دہلی کے مشاعرے	۱۷۔

- ۱۸۔ شہزادہ جہاں بہت کی شادی اور ایک اور بی محرمہ
- ۱۹۔ حکمرانوں کے انقلاب و خطا ہست..... نجم الدولہ و میر الملک اسد اللہ خان بہادر نظام جنگ
- ۲۰۔ دلی کا راج اور دلی سوسائٹی.....
- ۲۱۔ دلی کے کتب خانے کتب ذریعہ مطالعہ غالب تصانیف غالب
- ۲۲۔ دلی اور راجہ مولوی محمد باقر ایک سماجی ایک مجاہد آزادی
- ۲۳۔ غالب پس دلی اور خداں دلی کی انتظامیہ عدلیہ دلی عامہ اور صحافت
- ۲۴۔ کلی قاسم جان فخر الدولہ مسعودی شمس الدین خاں ایک قاتل ایک شہید
- ۲۵۔ بڑی بیگم کے گھر سے سلطان جی تک رسوم دلی کرت ہست
- ۲۶۔ دلی کے پانچ شمس العلماء حضرات..... الطاف حسین حالی محمد حسین آزاد و فیضی خیر احمد ضیاء الدین آزاد کا مکتبہ
- ۲۷۔ سر سید احمد خان: آثار و تصانیف اسباب بقاء ہند
- ۲۸۔ مشاہیر دلی مشرف بہ تلمذ غالب
- ۲۹۔ دلی کے دو صوفی ایک تو مگر ایک قلندر
- ۳۰۔ دی گریٹ گیم..... روس ایران افغانستان..... غالب کی نظر میں
- ۳۱۔ غالب اور غور ۱۸۵۷ء تا ۱۸۵۹ء کی دلی
- ۳۲۔ آہ غالب بمرد
- ۳۳۔ کتابیات

اظہارِ تشکر

میں میم قلب سے شکر گزار ہوں محترم ڈاکٹر انوار احمد صاحب ذہنِ قیلتی آف آرٹس اینڈ سوشل سائنسز بہاء الدین ذکرِ بابہ خود شہسائی ملتان کا جنہوں نے اذرا و عنایت زیرِ نظر کتاب کا مکمل کپیڈ شدہ متن پڑھنے کی رحمت گوارہ کی اور دیا چہ بھی تحریر فرمایا۔ اپنی بہن شہیدہ فاطمہ اور اپنے دوستوں پروفیسر سمیل عباس بلوچ ڈاکٹر طاہر جمیل چودھری شاکر حسین شاکر سید ارشد حسین بخاری اور علی رضا ساہی کا جو مجھے کتب فراہم کرتے رہے۔

اپنے دوستوں ڈاکٹر نجیب حیدر ڈاکٹر محمد نصر اللہ پروفیسر سعید اختر رضی الدین رضیٰ قمر رضا شہزاد اور سعید عامر سمیل کا جنہوں نے مجھے گراں قدر مشورے دیئے اور میرے لیے حوصلہ افزائی کا باعث رہے۔ ڈاکٹر نجیب حیدر اور سعید محمد اقبال صاحب کا جنہوں نے کتاب کے لیے بعض تصاویر فراہم اور تسکین کیں۔

اور

اپنی نصف بہتر اور اپنے بچوں کا جن کے حصے کا وقت میں نے اس کتاب کی تالیف میں صرف کیا۔ اور اپنے ناشرین محترم انضال احمد اور جناب نیاز احمد کا..... یہ ان کی حوصلہ افزائیوں اور مجھے شوق کا نتیجہ ہے کہ مجھ میں اتنا بڑے سفر نامہ نگاری سے نکل کر تحقیق کے بحرِ بیکراں کی غواصی کی جہت پیدا ہوئی۔

ہے۔ غالب اُدوقی مومن مسہابی شیطانی آرزو سید احمد خان حالیؒ نظرِ ابرارِ خدا کا، اللہ تعالیٰ عادلینِ ماسٹر رام چندر ڈاکٹر حسن دلال نیارے دلال آشبِ چنڈت من بھول۔۔۔

دلی کالج اور دہلی سوسائٹی جیسے ادارے قائم ہو رہے تھے۔ درگزرِ سوسائٹی کا مطبع قائم ہو چکا تھا۔ جدید علوم کی کتب ترجمہ ہو کر چھپ رہی تھیں۔ ریاضی، متغیرات، طبیعیات، کیمیا اور فلکیات پر کتابیں تحریر کی جا رہی تھیں۔ سائنسی علوم میں دلچسپی اس قدر بڑھ رہی تھی کہ دہلی کالج کے طلبہ جو تجربے کالج کی تجربہ گاہ میں کرتے وہ گھر جا کر دہراتے اور اعزہ و اقارب اور دوستوں کو حیران کر دیتے۔

ٹینک اور مالیاتی ادارے بن رہے تھے۔ لگان تادان نہیں رہا تھا۔ کرائے کے فوجیوں اور لڑاکوں کی بھائے رہو نہ آفسروں کی مانگ تھی۔ لوگوں کا تعلیم کی جانب میلان بڑھ رہا تھا۔ نوجوان طالع آزمائی کی بجائے علم حاصل کر کے تحصیل دار، منصف اور استاد بن رہے تھے۔ دقوں بعد لوگ ایک ایسی فوج دیکھ رہے تھے جس کے سپاہی شہر میں دکانداروں سے اشیاءِ ادا انگلی کر کے خریدتے تھے اور دیہات میں لوگوں کے گھروں میں گھس کر لوٹ مار نہیں کرتے تھے، کیونکہ انہیں باقاعدگی کے ساتھ مستحق ملحقہ دہلی تھی۔ تہارتی شاہراہیں محفوظ ہونے کی وجہ سے تہارت میں بے پناہ اضافہ ہو گیا تھا۔ ڈاک کا نظام سستا اور قابلِ اعتبار تھا۔ ریل اور ٹیلی گراف آ رہے تھے۔ دریاؤں میں سست رفتار کشتیوں کی جگہ دفعتی جہازوں نے لے لی تھی۔ فاصلے سست رہے تھے۔ دربار کے سکول حراج کی وجہ سے عوام بھی مذہبی تعصبات سے آزاد ہو رہے تھے۔ مسٹر پیئر کھیتے ہیں کہ نصف صدی سے زیادہ پہلے اس دور میں مجھے مذہبی اور فرقہ وارانہ تصادم کا ایک بھی واقعہ تلاش ہمارے ہاں جو نہیں مل سکا۔ پھر ۱۸۵۵ء آتا ہے اور اس زمانہ ان تعلیم و معیشت سب بارود کی نذر ہو جاتے ہیں۔ خون کی ندیاں بہہ جاتی ہیں۔ ٹوٹ ماراں وسیع پیمانے پر ہونے لگتی ہے گویا نوردِ ابدالی روہیلوں اور مرہٹوں کا دور لوٹ آیا ہو۔ ہندوستانی پگھر میں تیزی سے اُٹھتے ہوئے یورپی اپنے قدم روک لیتے ہیں۔ اب وہ شہر اردو اور فارسی کی بجائے ”دلی ٹم کیا نکھا“ ”قسم کی زبان بولنے لگتے ہیں۔ جہاں ہندوستانوں کی حالت سدھارنے اور مصلح شہزادوں کو تعلیم سے آراستہ کر کے اعلیٰ عہدے دینے کے منصوبے بنائے جا رہے تھے وہاں ہندوستانوں کو کچلنے اور شہزادوں کو قہر دم کرنے کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ جہاں شاہ جہان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے غی اور شاہ عمارتوں کی تعمیر اور قدیم عمارتوں کی ترمیم و آرائش اور تعمیر نو کی جا رہی تھی وہاں تاریخی عمارات کو مہدم کرنے کا وسیع پیمانے پر آغاز کیا جاتا ہے۔ ہندوستانوں کو نچلے درجے کی مخلوق قرار دے دیا جاتا ہے۔ (بدھستی سے سرسید جیسے دانشور بھی اپنے نام نہ علم و فضل اور روشن خیالی کے باوجود انگریزوں سے موازنہ کرتے ہوئے ہندوستانوں کو نکھلا رہے کے حیوان کہنے لگے تھے)۔ ہندوستان ہزاروں سالوں سے علم و ادب کی آماجگاہ رہا تھا۔ لیکن یہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انہیں اپنے اندر جذب کر لیتا تھا ہندوستان کی تاریخ میں یہ پہلی بار ہوا تھا کہ حاکم قوم کے خلاف ایک وسیع عوامی بغاوت ابھری تھی چنانچہ بدھادی کی ایک علیحدہ حکام

اور عوام کے درمیان جانگ ہو گئی۔ جنگ آزادی کے نتائج کو دیکھتے ہوئے غالب کی ”ترتیب بے جا“ کی اصطلاح بکھر اُٹتی ہے جا بھی نہیں گنتی۔ اس سے ایک بات یہ بھی سمجھ میں آتی ہے کہ بھڑی کا راستہ ارتقاء اور اصلاح کا ہے۔ انتخاب کا راستہ طبعی و برہادہی کا ہے۔ کسی نظام کو چاہ کرنے کی بجائے اسے اپنا قطری راستہ اختیار کرنے کا موقع دیا جانا چاہیے۔ اگر وہ ناقص ہے تو خود بخود مٹ جائے گا۔ ادواروں کو مضبوط کر کے ہی ریاست کو اور معاشرے کو امن اور خوشحالی کے راستے پر ڈالا جاسکتا ہے۔ یہ تھی اس کتاب کی وجہ تکالیف... اب آئیے حضرت غالب کی انگلی تمام کردلی کی سیر کرتے ہیں۔

محمد عباس بریلوی

۱۱ ستمبر ۲۰۰۵ء

چوٹی زیریں ڈیم، غازی خان

عباس برمانی کا ذوقِ تحقیق اور رنگِ تخلیق

ڈاکٹر انوار احمد ڈاین فیکلٹی آف آرٹس اینڈ سوشل سائنسز ملتان یونیورسٹی

عباس برمانی کو میں سفر نامہ نگار کے طور پر جانتا تھا اور خیال کرتا تھا کہ وہ مستنصر حسین تارڑ سے متاثر ہے زیادہ سے زیادہ اور زیادہ خاندان برآمدان ہو جائے گا اور آخر آخر فرشتے کرانے بیٹھ جائے گا۔ مگر اس نے تو ہر ملاقات میں مجھے حیرت زدہ کرنا شروع کیا، اپنے ذوقِ مطالعہ سے اور اب وہ تہذیبی باورداشت کا ایک اور باب لایا ہے ”عالم کے زمانے کی دلی“..... دلی سے اس کا کیا رشتہ ہے؟ چوٹی زمریں میں بیٹھے عباس برمانی نے ایک مخصوص مہر کی دلی کو اور عالم کے زمانے کو تاریخی و تہذیبی شہادتوں، معالیاتی و بدعنوان اور تخلیقی تحلیل سے کیوں دریافت کرنا چاہا ہے؟ کیا یہ اپنے اجتماعی وجود سے منہا ہونے والے حوالے کی بازیابی کی روانہ کی کوشش ہے؟ پاکستان کے جہاوی مکتب فکر کی جانب سے لال قلعے پر سبز پالی پر چم لہرانے کے خراب یا حکیم کی تہذیب ہے؟ یا پھر منغل چکر کی چمٹ، سامرائی دور نے ”مشرقِ میٹھی اور عالمگیریت کے کثیرالابواب و حلقہ ہائے کھینے کی ایک سنجیدہ کوشش، جس کے مآخذات حیرت انگیز ہیں اور جس سہولت سے وہ حاکم اخذ کرتا ہے، جس اسلوب میں بیان کرتا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ چوٹی زمریں والوں کے اس نقطہ نظر کو بھی جس مصومیت سے وہ بیان کرتا ہے، وہ سب مجھے موقف سے اختلاف کے باوجود حیرت کرتا ہے:

”بھرتی کا راستہ ارتقا، دایور اصلاح کا ہے، انتھاب کا راستہ جانی دیر باوی کا

ہے، کسی نظام کو جا کرنے کی بجائے اسے اپنا فطری راستہ اختیار کرنے کا موقع دیا جاتا

چاہے اگر وہ ناقص ہے تو غور و نحو و مٹ جائے گا۔ دادوں کو مضبوط کر کے ہی ریاست

کو اور معاشرے کو امن اور خوشحالی کے راستے پر ڈالا جاسکتا ہے۔“ (عرضِ مؤلف)

اس تہذیبی و تخلیقی سفر میں وہ جسے غصہ جاتا ہے، وہ عالم ہے، جس کے جہانِ معالی کی نکتہ شناسی

ادبیات کے کسی بھی سنجیدہ طالب علم کی معالیاتی اور فکری تربیت کا لازمہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عالم پر انتھاب

کچھ لکھے جانے کے باوجود لکھا جا رہا ہے، قلمیں اُڑا رہے اور قسطیں دستاویزی سرمانے کو عوامی سطح پر چلا رہی ہیں۔ پندرہ جلدیں ہیں ایسے برائی کی یہ کتاب اس روایت میں جذب ہو کر منفرد قتل بھی بناتی ہے کہ اس میں ایک محقق کی محنت ہے بچا رہی نہیں۔ اس موضوع پر لکھی جانے والی معاصر شاہدوں سے اخذ معنی کی کاوش ہے۔ خوش چینی کی تدوین کاوی نہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنے مسائل تجزیہ اور بیان کو محبت بھری واردات بنا کر ان سب قارئین کو شریک کیا ہے جن میں مجھ ایسے مدرسن بھی ہیں جنہوں نے برس ہا برس طالب علموں کو غالب کے مکاتیب پڑھائے اور بعض مشکل مقامات کو زور بیان کے سہارے عبور کیا، عباس برائی کی اس کتاب سے اندازہ ہوا کہ ان مکاتیب کو حقیقی کاغذ پر فراہم ہوا ہے۔

یہ امر اپنی جگہ دلچسپ ہے کہ آخر ۱۸۵۷ء کے حوالے سے اتنی بہت سی کتابیں کیوں شائع ہو رہی ہیں (دو بارہ سو بارہ بھی) پڑھی بھی جا رہی ہیں اور یہ شاید پہلی مرتبہ ہو رہا ہے کہ صرف آخری مثل فرما کر داکہ مظلومیت کے حوالے سے رقت قلبی پیدا کرنے والے خواہد یا جذبات انگیز بیانات ہی پیش نہیں ہو رہے نہ زوال کے اسباب کو سمجھنے کی بصیرت کو تقویت دینے والی جہم کشا باتیں بھی ہیں۔ عباس برائی نے بھی یہاں شاہ ظفر کی ۱۳۴۱ مثل اولاد کی جو تفصیل دی ہے اور آخری دو شاہیوں کی تفصیل دو اس شہنشاہ کے آخری ایام کے بارے میں فوجوں کی تاثیر لکھا دیتی ہے۔ اس طرح خطوط غالب یا دکن کے ساتھ ساتھ معاشرۂ کروہ تاریخ اور بعض انگریزوں کی یادداشتوں کو لگا کر غالب کی سوانح حیات ہی نہیں دلی شہر اور ایک اجتماعی تہذیب کی شام کی کشش اور زوال کی تاثر پریت کو بیان کیا گیا ہے۔

پھر یہ معاملہ غالب اور اس کے احباب کی مرقع کشی کا نہیں رہتا۔ شہر کے کوچہ و بازار رسومات، دو بڑی قوموں کا باہم ثقافتی اختلاف یا مشترک الفت کے محور و مرکز بھی بیان ہوئے ہیں۔ ۱۸۶۸ء کی مردم شماری اور ۱۸۳۸ء کے بھی اس سلسلے کے اعداد و شمار مسلم دلی کی ماہیت بیان کرتے ہیں کہ ہندو اکثریت میں تھے مگر مسلم ثقافتی رنگ کا غلبہ محض سیاسی اقتدار کا کرشمہ تھا بلکہ خود ہندوؤں کا اپنا ذاتی، بھال تھا جس نے مسلم رسومات کو ایک خاص رنگ دیا تھا۔

خوشنیت سنگھ نے دلی پر جو ناول لکھا اس میں اس کا مخصوص منظر رے دار اسلوب ہے مگر اس نے لکھا کہ ٹیلی ویژن پر دستاویزی پروگرام کے لیے اس نے بہت سی معلومات جمع کیں جنہیں بعد میں اپنے ناول کے خام مواد کے لیے استعمال کیا۔ اسی طرح انتھار سین کے لیے دلی ایک دل کش خواب ہے جسے وہ ہند مسلم تہذیبی خصوصیت کو سمجھنے اور اس کے متوازی ہم آہنگ تہذیبی حاشے کو بھی اس طرح ابھارتا جاتا ہے کہ تاریخ و تہذیب کی تعمیر بھی کرتا جاتا ہے اسی طرح حسن لکھانی نے برسر فراق اشرف صوبی اور شاہد احمد دہلوی کا یاس انگیز مہالہ ایک اور رنگ پیدا کرتا ہے۔ عباس برائی کا رنگ جدا ہے اس کا انداز معروضی تو نہیں اس کا اس دور اس دور کی خصوصیتوں، مقامات اور واقعات سے ایک خاص طرح کا لگاؤ ہے مگر اس پارے سے کہے میں وہ کوشش



غالب کی مہر

کہتا ہے کہ اس کے ماخذات ہی راوی بن جائیں اور جب بیشتر مقامات پر کتابی معلومات حکم مناظر تکمیل دیتی ہیں تو اعزاز ہوتا ہے کہ یہ محض لذت مطالعہ کی شرکت کی آرزو مند کی نہیں تھی جس نے اس سے یہ کتاب کھسولی۔

عالم دلی میں پیدا نہیں ہوا تھا۔ دلی کا داماد تھا لیکن اس نے اپنی شخصیت اور نظم و نثر سے اسے جہان و مگر بنا دیا ہے۔ یہاں مجھے دلی کے ایک مسلمان رجسٹرار سے حالیہ ملاقات یاد آ رہی ہے کہ جب میں نے دلی زبان میں مسلمان ہندو اپنی دلی اور اردو کی حالتِ ذار کے بارے میں چند افسردہ مشاہدات کا تذکرہ کیا تو انہوں نے مسکرا کر کہا ”میں اس مسلمان ہندوستان کے داماد ہیں ان کی ناز برداری کرنا ہندوستان کی بھجوری ہے۔“ سو عالم کے بارے میں سب افسار ہے ہیں۔ ہم اس برہمنی نے بھی اس عہد کی دلی کے ناظر اور شاہد کے طور پر عالم کو نہیں دیکھا بلکہ عالم کی زندگی کے مختلف ادوار اور مراحل کے بیان میں تہہ طیبوں کی زد میں آئی دلی کی مرقع کشی کی ہے اور عالم کی آخری سانسوں کے ساتھ ہی یہ کھا ختم کی ہے گو یادہ عالم کو اس عہد کی دلی کا مرکزی کردار ہی نہیں تہہ جی ہم زاد اور بغض شناس بھی خیال کرتا ہے۔ تاہم یہ خیال ضرور آتا ہے کہ سفر نامہ نگار ہم اس برہمنی نے دلی کے دو چار سفر بھی کیے ہوتے اور وہ واردات بھی اس کتاب شناس کے اظہار میں شامل ہو جاتی تو شاید معنویت کی ایک اور سطح بھی اس کتاب میں پیدا ہو جاتی کیا جا اس نے یہ سطر کیے ہوں عالم خیال میں جانچ بچ کر ہے مخصوص انکسار کے سبب اس کا ادغام سب خیال نہ کیا ہو۔

انوار احمد

۲۳ مارچ ۲۰۰۶ء

غالب بقلم خود

اسد اللہ خاں غالب ٹھکس عرف مرزا نوشہ قوم کا ترک سلجوقی سلطان برکیارق سلجوقی کی اولاد میں سے۔ اس کا دادا قوچان بیگ خان شاہ عالم کے عہد میں سرحد سے دلی میں آیا۔ پچاس گھوڑے اور خوارہ نشان سے بادشاہ کا نوکر ہوا۔ پچاس کا پرگنہ جواب سرحد بیگم کو سرکار سے ملا تھا وہ اس کی چاداد میں مقرر تھا۔ باپ اسد اللہ خاں مذکور کا عبداللہ بیگ خان دلی کی ریاست چھوڑ کر اکبر آباد میں چار باب اسد اللہ خاں اکبر آباد میں پیدا ہوا۔ سال ولادت ۸ رجب ۱۲۱۲ ہجری بروز یک شنبہ عبداللہ بیگ خان الوری میں راکڑا جاتھا اور سنگھ کا نوکر ہوا اور وہاں ایک لڑائی میں بڑی بہادری سے مارا گیا۔ جس حال میں کہ اسد اللہ خاں مذکور پانچ چھ برس کا تھا۔ اس کا حقیقی چچا نصر اللہ بیگ خاں مرہٹوں کی طرف سے اکبر آباد کا صوبے دار تھا۔ ۱۸۰۳ء میں جب جنرل بیگ صاحب اکبر آباد پر آئے تو نصر اللہ بیگ خاں نے شہر پر دھڑک دیا اور اخلاصت کی۔ جنرل صاحب نے چار سو سواروں کا بریگیڈ بٹری کیا اور ایک ہزار سات سو کی فوج مقرر کی۔ پھر جب اس نے اپنے زور بازو سے سوکھ سونادو پر گئے ہجرت پر کے قریب ہو کر کے سواروں سے جھین لیے جنرل صاحب نے وہ دونوں پر گئے بہادر موصوف کو یہ طریق احترام عطا فرمائے مگر خاں موصوف جاگیر مقرر ہونے کے دس مہینے کے بعد ناگاہ ہاتھی سے گر کر مر گیا۔ جاگیر سرکار میں باز یافت ہوئی اور اس کے عوض نقدی مقرر ہو گئی اور شرکا، کودے، دلا کر ساڑھے سات سو روپے سال اس شخص کی ذات کو اس زر معافی میں سے ملتے ہیں۔ اس نے شاعری میں بڑا کمال پیدا کیا۔ نہ فقط شعر بلکہ نثر میں بھی دستگاہ رکھتا تھا۔ نثر کی تین کتابیں ہیں۔ سچ آجنگ ’میر غلام دودھ حسن‘ فارسی زبان کا کلیات دس جزا بیت کا بالفعل ’لوحہ اخبار‘ لکھنؤ میں چھاپا ہوا ہے۔ گورنمنٹ میں اس کی بڑی عزت ہے۔ اشرفیوں کے عوض قصیدہ مدح تذریعہ ہے اور سات پارے غنیمت ’سراج موتیوں کی مالا قطعہ‘ پانچ ہے۔ اب کی بار جملا ہو رہی لارڈ صاحب کا دربار ہوا تو موافق سابق کے دو ہار دواؤں کی فہرست کے صاحب کشتہ بہادر حصار نے گورنمنٹ والا قائم مقام صاحب کشتہ دلی بھی ہیں مثل اور دیکھوں کے اور دیکھوں کے ان کے اس کو بھی خط لکھا۔ ہے چارہ یہ سبب تھی دلی اور بے مقصدی کے لاہور نہ جاسکا۔ اس شخص نے ۱۸۵۵ء کے آخر

میں تفسیرِ مدح و تحکیم معظمہ ولایت کو بہ کسبِ ذاک لارڈ ایلن براؤن اور سابق کی معرفت بھیجا ہے۔^۱

میرے والد اور دادا انھوں سے تھے اور میرے باپ کی ولایت دہلی میں ہوئی اور میں آگرے میں پیدا ہوا۔^۲
جن لوگوں نے خانِ غلام حسین (دادا) کو دیکھا ہے وہ کہتے تھے کہ وہ بات چیت ترکی میں کرتے
تھے اور انھیں ہندوستانی زبان نہیں آتی تھی مگر اصرار میں ہوں کہ ترکی کے حروفِ گلی سے بھی واقف نہیں۔^۳

میرے چچا نصر اللہ بیگ خان کے وارثوں میں یوسف علی خاں میرا بھائی ہے جو مرحوم کا بچپن ہے۔
نیز آپ کا یہ درخواست گزار ہے۔ میرا نام محمد اسد اللہ خاں ہے اور عرف مرزا نوٹ۔^۴

میں نے آج تک اپنے والد مرحوم کے ترکے کو بیچ کر زندگی بسر کی ہے۔ اس کے علاوہ میرے ناتا
خواجہ غلام حسین نے بھی کچھ جاوا چھوڑی تھی۔ وہ آگرہ کے چوٹی کے محلہ میں سے اور نواب نجف خان کے
دربار کے مشہور امراء میں سے تھے۔ میں نے ہسراوات کے لیے والد اور ناتا کی مترکہ جاوا بیچ ڈالی اور اس
کے بار جو مجھ پر آج میں ہزار کا قرض ہے۔^۵

پانچ برس کی عمر میں میری کہ میرا باپ عبداللہ بیگ خاں عرف مرزا دولہا میرا چچا تھا اور غلجہ کی رفاقت
میں مارا گیا۔ سرکار سے میرے باپ کی تحفہ میرے نام پر جاری ہوئی اور ایک گاؤں جس کا نام انام ہے مجھ کو
برائے دوام ملا۔ چار برس کے بعد نصر اللہ بیگ خاں میرا چچا مر گیا۔ نو برس کی عمر میں سرکار انگریزی سے چ
عوض چچا کی جاگیر کے نقدی منتظر ہوئی۔ ابھی تک اس پر معاش کا مدار ہے۔ عمر بھر نوکری کی تو بہا اور شاہ سے غم
الدولہ دیر الملک نظام جنگ کا خطاب پایا۔

کچھ دنوں بادشاہ کا مصاحب رہا پھر استاؤ کو بلا یا۔ اب ایک کم متر برس کی عمر ہے۔ کانوں سے بھرہ
ہو گیا ہوں۔ بغیر انھی کے چل نہیں سکتا۔ نگہیہ یا دیوار کے آسرے کے بغیر بیٹھ نہیں سکتا۔ دنیا دار نہیں فقیر ہوں۔
انگریز کا بخش دار اور خیر خواہ بعد غدر کے بخشن جاری گوشت و گوشت اور حکام وئی سے ملاقاتیں بدستور خطوط کی
آمد و رفت جانتین سے بدستور۔^۶

باپ میرا عبداللہ بیگ خاں بہادر تھنوں میں جا کر نواب آصف الدولہ کا نوکر رہا بعد چند روز
جیداً باد جا کر نواب نظام علی خاں کا نوکر ہوا۔ وہ نوکری خانہ جنگی کے ایک کھیزے میں جاتی رہی۔ والد نے
گھبرا کر الور کا قصد کیا۔ راؤ راجہ بھٹا درنگھ کا نوکر ہوا۔ وہاں کسی لڑکی میں مارا گیا۔

[illegible]

دینا ہے اور شہزادہ جلیغ سرخ کو تیرے مالا غلت لہائی ایک بار جو ~~جلیغ~~ جلیغ بنی لڑو جلیغ
 دربار تھا تو موافق سابق کے دربارہ اورنگ زیب کے صاحب کھنیز بہار صفا لڑو لڑو
 قایم مقام صاحب کھنیز دجا بہر بنی مثل اور ریسونک اور تیس زافونک اسکی ہر خط لکھا
 بجایو بسبب تہدست اور عقیدہ اور سلطنت اور نجاسکا جسے کہنا تھا سترہ کا آدمی
 سکا کونست ہر امنہ اور اکثر بیمار تھا منہ بیکنے اگر میر کسی دوسرے جو نا تو میں ان عوارض کو
 نہ تھا اور جنگ لڑو غیب کے دربار میں حاضر ہونا خیر آخر عمر میں یہ اکتفا غصت رہا
 حق بات کو غلط ہر نکرنا خدا پرست اور حق شناس کے خلاف ہم اسی شخص نے مشہور
 کے آخر میں قصیدہ مع ملک مظہر ولایت کو بسیل ڈاک ~~لکھا~~ لکھا و اتنی مرا گور بنی
 کے معرفت ہر جہاں اور اوایل مشہور میں تین خط انگریز تہذیب واسطہ انڈیا گورنمنٹ
 ولایت اسکو ڈاک میں آئے ہیں اب ہم ان تیلوں خطوں کے خلد سے لکھ کر اسکا
 ذکر کر ختم کرتے ہیں

اور ایک شاعر نے یہ بیت بھی
 صفت لکھ کر لکھا ہے
 مکتوب

شہزادہ مظہر جلیغ سرخ
 صاحب
 جلیغ سرخ

آپ حضرات والدہ صاحبہ قلیلہ و کثیرہ حضرت عزت النساء بیگم صاحبہ مدظلہ العالی کے ساتھ حویلی کے دہن اور قرض کے لین دین کے معاملے میں کسی امر یا گزیر کی صورت میں میری جانب سے دل جمعی چاہتے ہیں۔ لہذا قریب کیا جاتا ہے کہ خدائے جہاں آفریں بیگم صاحبہ یعنی والدہ صاحبہ کو ویرگاہ سلامت رکھے۔ وہ دونوں حویلیوں کی تنہا مالک ہیں۔ اگر خدا عزت امر یا گزیر کہ لازم ذرات انسان ہے نہیں آتا ہے تو جو بھی مملوک مملوکہ و عقیدہ جناب ممدوح اس گنہگار کے تصرف میں آئیں گی پہلے آپ صاحبان کا قرض ادا کیا جائے گا۔۔۔ خیال رہے کہ جناب والدہ صاحبہ لکھنؤ چلنا چاہتی ہیں لہذا ہر وہ تمسک جو ممدوح کے دستخلاف کے بغیر ہوگا پایہ اعتبار سے ماقصد قرار پائے گا۔

میرے چچا کے کوئی اولاد نہ تھی، وفات کے وقت ان کے درجہ حسب ذیل تھے (۱) میں (۲) میرا چھوٹا بھائی (۳) میری دادی (۴) میری تین چھو بہنیاں۔ اس وقت میری عمر نو برس کی تھی اور میرے بھائی کی سات، میری دادی ستر برس کو پہنچ چکی تھیں۔

اس واقعہ کی حقیقت مجھ سے پوچھو کہ۔۔۔ سات بچے پیدا ہوئے لڑکے بھی اور لڑکیاں بھی اور کسی کی عمر پندرہ مہینے سے زیادہ نہ ہوئی۔^{۱۰}

میں نے ایام دبستان نشینی میں ”شرح مائدہ عامل“ تک پڑھا بعد میں اس کے بعد ادب اور آدھے بڑا کرفس و فوج رویش و طرب میں مہلک ہو گیا۔ فارسی زبان سے نگاہ اور شعر و سخن کا ذوق فکری و طبعی تھا۔ ناگاہ ایک شخص۔۔۔ کہ ساسان ہجیم کی نسل میں سے سہلذہن و فلسفہ میں مولوی فضل حق مرحوم کا نظیر اور مومن و صوفی سانی تھا میرے شہر میں وارد ہوا اور لکھنؤ فارسی بحث اور غرضات فارسی آئینہ پڑھ کر اسی اس سے میرے حال ہوئے سونا سوئی پڑ چکا۔^{۱۱}

تہہ را طیلہ کچہ کرتہا رے کشیدہ و قامت ہونے پر مجھ کو رشک نہ آیا کس واسطے کہ میرا قد بھی درازی میں انگشت نما ہے۔ تہہ را رے گندی رنگ پر رشک نہ آیا کس واسطے کہ جب میں جیتا تھا تو میرا رنگ چمکی تھا اور دیدہ و دلگاہ اس کی متافق کیا کرتے تھے۔^{۱۲}

شاعری میں تمیز الرحمن ہوں اور معنی کی تار کی کو اپنے گویا استعداد کی روشنی سے دور کرتا ہوں۔ عدم سے تشکیل پایا ہوا میرا تمداد شادی قرض کی طرح میرے لیے ہار کراں نہیں اور نہ ہی میں کسی اتالیق کے

احساس کے بوجھ تلے دبا ہوا ہوں^{۱۵}۔

میں اور وہ ہم عصر تھے۔ شاید فحشی غشی دھر مجھ سے ایک دو برس بڑے ہوں یا چھوٹے ہوں یا ہم
 طہر نج اور اشک ط اور صحت آدمی آدمی رست گزر جاتی تھی چونکہ گھرانہ کا بہت دور تھا اس واسطے جب چاہتے
 تھے چلے جاتے تھے۔ ایک کڑا کشمیر داٹا کھلاتا تھا۔ اس کڑے کے ایک گوشے پر میں چنگ اڑایا کرتا تھا اور
 راجا بلوان سنگھ سے چنگ لاکرتے تھے^{۱۶}۔

بارہ برس کی عمر سے قلم و نثر سے کاغذ ماندا ہے تا مہ اعمال کے سیاہ کر رہا ہوں یا سطر جس کی عمر ہوئی
 پچاس برس اس شہرے کی ورزش میں گزرے۔ اب جسم و جاں میں تاب نہیں۔ نثر فارسی لکھنی یک قلم
 موقوف اور دوسواں میں بھی عبارت آرائی متروک جو زبان پر آوے وہ قلم سے نکلے^{۱۷}۔

چند برس کی عمر سے کچھ برس کی عمر تک مضامین خطابی لکھا کیا۔ دس برس میں بڑا دیوان جمع ہو
 گیا۔ آخر جب قیصر آئی تو اس دیوان کو دور کیا۔ اور اق ایک قلم چاک کیے۔ دس چھوٹے شعر واسطے نمونے کے
 دیوان حال میں رہتے رہے^{۱۸}۔

میں مسعود خالص اور مومن کامل ہوں۔ زبان سے لا الہ الا اللہ کہتا ہوں اور دل میں لا موجد والہ اللہ
 لا موجد فی الوجہ والا اللہ کہتے ہوئے ہوں۔ انھیاسب واجب التعظیم اور اپنے اپنے وقت میں سب مفترض الطاعت
 تھے۔ محمد علیہ السلام پر نبوت قسم ہوئی۔ یہ خاتم المرسلین اور رحمت اللعالمین ہیں۔ مطلق نبوت کا مطلق امامت اور
 امامت نہ اجتماعی بلکہ من اللہ ہے اور امام من اللہ علیہ السلام ہے۔ قم حسن قم حسین اسی طرح مسعودی مسعود
 علیہ السلام

بریں دستم ہم بریں کجورم

ہاں اتنی بات اور ہے کہ باہت اور زندہ کو مردہ اور شراب کو حرام اور لپے کو حاشی سمجھتا ہوں۔ اگر
 مجھ کو دوزخ میں ڈالیں گے تو خیر اچھا نامقصود ہوگا بلکہ دوزخ کا اندھن ہوں گا اور دوزخ کی آج کو تیز کروں
 گا تاکہ مشرکین و کفریہ نبوت مصطفوی اور امامت مرتضوی اس میں جلیں^{۱۹}۔

دس بارہ برس سے اس تنگنا میں رہتا تھا۔ سات برس تک ماہ بہ ماہ چار روپے دیا گیا۔ اب تین برس کا
 کر لیا کچھ اور سو روپے ایک مشت دیا گیا۔ مالک نے مکان بیچ ڈالا جس نے لیا اس نے مجھ سے پیام لکھا ابراہم

Shahjahan's city in the early
19th century



نقشه شاه جهان آباد

کیا کہ مکان خالی کرو مکان کہیں ملے تو؟^{۱۸}۔

دو قسم کی انگریزی شراب ایک تو کاس ٹین اور ایک اولڈ ٹام ہے میں ہمیشہ پی کرتا تھا اور یہ دونوں قسم میں روپے حد چوبیس روپے درجن آتی تھی۔ اب یہاں پہلے تو نظر نہیں آتی تھی اب بھاس اور ساٹھ روپے درجن آتی ہے۔ وہاں تم دریافت کرو کہ اس کا نرخ کیا ہے اور یہ بھی معلوم کرو کہ بطریق ذاک پہنچ سکتی ہے یا نہیں؟ یہ دونوں امر مجھے دریافت کر کے جلد لکھو۔ اگر یہ قیمت مناسب ہاتھ آئے اور اس کا بھیجنا ممکن ہو تو یہاں سے روپے بکی ہفتوی بھیج دوں اور تم خرید کر قتل گاڑی کی ذاک چروانہ کرو۔

جاڑوں میں مجھ کو بہت تکلیف ہے اور یہ گز پھال کی شراب میں نہیں چتا مجھ کو مسرت کرتی ہے اور مجھے اس سے نفرت ہے ضروری جواب طلب.... از غالب جاں بلب^{۱۹}۔

بے تکلف عرض کرتا ہوں اے آم کھاتا تھا کہ پیٹ بھر جاتا تھا اور دم پیٹ میں نہ ساتا تھا۔ اب بھی اسی وقت کھاتا ہوں مگر دم بارہ۔ اگرچہ غری آم بڑے ہوئے تو پانچ سات۔

دریغ	کہ	مہم	جوانی	گزشت
جوانی	کنو	زندگانی	گزشت	^{۲۰}

میں اب اجتماع عمر ناپائیدار کو پہنچ کر آفتاب بام اور ہجوم امراض جسمانی و آلام روحانی سے زندہ و گور ہوں کچھ باوجود ابھی چاہیے انکم و ستر کے ٹکڑوں کا انتظام ہائے دوا و دوا کی غناہ سے خوب ہو چکا۔ اگر اس نے چاہا تو قیامت تک میرا نام دستان باقی رہے گا^{۲۱}۔

ہرگز میں ایسا نہیں کہ خدا نے مجھ سے پہلے کوئی ایسا پیدا نہ کیا ہو۔ قایت مانی الباب یہ ہے کہ سنو ران گذشت کا طرز شہاس اور ان کی نازک خیالیوں کا بھر دوں۔ مبدع قیاض سے مجھ کو ان کی تکلیف میں پایے تحقیق ملا ہے اور میں صاحب طرز جدید ہوں۔ (مکتوب بنام مولوی انصاری احمد)

وائے مہری مولود سامانی.... آ زاووں کی طرح درویشانہ زندگی گز اور ہاتھ کر ذوقی سخن نے رجزنی کی اور مجھے یہ سمجھایا کہ آئینے کو چکا کر صورت معنی کو چکا تا بھی بڑا کام ہے۔... مجبوراً میں نے اپنا سفینہ بحر شعر میں ڈال دیا جو کہ نہیں سراپ ہے۔ قلم میرا حکم بن گیا مگر شاید میرے زمانے میں دیدہ وری تھی ہی نہیں یا تھی تو میرے جیسے کی نہیں تھی میرے کلام کی عدت زمانے سے بچھی رہی۔ (پیش آہنگ غالب)

بندہ پرورد میں قوی آدم کو مسلمان یا ہندو یا نصرانی عزیز دکھتا ہوں اور اپنا بھائی گنتا ہوں دوسرا مانے یا نہ مانے²¹۔ (ہام مرگوپال قصہ ۲۳ دسمبر ۱۸۵۹ء)

جس میں یہ دو صفات ملتی ہیں ہوں کی یعنی حقیقتہً زبان فارسی سے آگئی اور انصاف کا ملکہ منع ہوا۔ یہ دو صفات سلیبی بھی معا موجود ہوں گی یعنی مردہ پرست نہ ہوگا اور حسد پر مشہ نہ ہوگا تو وہ غالب کی قدر جائے گا اور اس حقیقہ پر حق کے قول کو مانے گا اور ایسے لوگ دنیا میں کم ہوں گے پس صغریٰ و کبریٰ کا نتیجہ یہ نکلا کہ حضرت غالب کے منافقین و منکرین ہزار ہزار پیدا ہو جائیں گے۔ ہر چند اعلیٰ حق انہیں سمجھا نہیں کے لیکن وہ انکار سے باز نہ آئیں گے۔ جہل مرکب کا علاج محال ہے۔ (لطائف شبی: غالب)

روح سخن کی جستجو میں میری عمر کے ہاوان برس گزر چکے ہیں اور اب میری عمر چھ یا ستر کی ہو چکی۔ میں اس وقت کلام عطا کرنے والے خداوند کریم کا شکر گزار ہوں کہ کمال سائنس سے نوازنے والے مالک نے ان ہاوان برسوں میں مجھ پر کیسے اعلیٰ خیالات اور معنویت کے دروازے کھول دیئے ہیں اور میرے غم و غیال کی کبریٰ کو معرفت و آگئی کی کس بلندی پر جگہ دی ہے وہ بیان نہیں کر سکتا۔ انوس تو یہ ہے کہ میرے دور کے لوگوں نے میری مثال عراز نہیں کیوں پچھانے۔ ایسے لوگوں کی کج فہمی اور کوتاہ نظری سے میرا دل جل رہا ہے۔ نظری روشنی بخشنے والے کمالات کو جن کو میں نے اپنی قلم و قریب میں صرف کیا ہے ان کی خوبیوں کو دیکھ کر یہ لوگ سچ و حجاب میں پڑ گئے۔ (دکھن کا دیوانی: غالب)

حوالہ جات

- 1- مرزا غالب کی خود نوشتیں سوانح عمری کاہرتی... مجموعہ نثر مرتبہ غالب ضمیمہ الرضیٰ دار اکوڑی۔
- 2- دکھن کا دیوانی مجموعہ مکمل الطابع ۱۸۶۵ء ترجمہ کالی داس گپتا رنشا۔
- 3- ایضاً
- 4- عرضی دعویٰ بخش۔ فسانہ غالب: مالک رام۔
- 5- ایضاً
- 6- خط ہام مرگوپال خان ۱۸۶۳ء خطوط غالب مرتبہ ہام رسول مر۔

- 7- خط بنام میر حبیب اللہ ڈکاہ فروری ۱۸۶۷ء۔ خطوط غالب۔ مرتبہ قلام رسول میر۔
- 8- متن دستاویز از فسانہ غالب از مالک رام۔ ترجمہ مہاس برائی۔
- 9- عرض و محوی نقشن 28 اپریل 1828ء۔ فسانہ غالب از مالک رام۔
- 10- مکتوب بنام مہیاں داؤد خاں سیاح ۲۵ اگست ۱۸۶۷ء خطوط غالب۔ مرتبہ قلام رسول میر۔
- 11- خط بنام مولوی ضیاء الدین خان ضیاء الدین فروری ۱۸۶۶ء خطوط غالب۔ مرتبہ قلام رسول میر۔
- 12- مکتوب بنام مرزا حاتم علی بیگ میر اپریل ۱۸۵۹ء خطوط غالب مرتبہ۔ مرتبہ قلام رسول میر۔
- 13- مرزا غالب۔ تالیما پرانی نگارینا ترجمہ سامعہ فاروقی۔
- 14- مکتوب بنام مفتی شیونہ رائن آ رام ۱۹ اکتوبر ۱۸۵۸ء خطوط غالب۔ مرتبہ قلام رسول میر۔
- 15- مکتوب بنام قلام حسین قادر بنگرانی ۲۳ فروری ۱۸۰۷ء خطوط غالب۔ مرتبہ قلام رسول میر۔
- 16- خط بنام عبدالرزاق شاہ کریم اگست ۱۸۵۶ء خطوط غالب۔ مرتبہ قلام رسول میر۔
- 17- مکتوب بنام ملاؤ الدین احمد خان ملائی جولائی ۱۸۶۲ء خطوط غالب۔ مرتبہ قلام رسول میر۔
- 18- مکتوب بنام مفتی ہر کوپال تفتہ ۲۰ جولائی ۱۸۶۰ء خطوط غالب۔ مرتبہ قلام رسول میر۔
- 19- مکتوب بنام مفتی ہر کوپال تفتہ ۲۰ دسمبر ۱۸۵۹ء خطوط غالب قلام رسول۔ مرتبہ قلام رسول میر۔
- 20- مکتوب بنام چوہدری عہد افضل سرور ۱۸۶۰ء خطوط غالب۔ مرتبہ قلام رسول میر۔
- 21- مکتوب بنام عبدالرزاق شاہ کریم خطوط غالب۔ مرتبہ قلام رسول میر۔
- 22- خطوط غالب قلام رسول میر۔

سیر دلی... کوچہ و بازار عمارات

”دروہی پاسا اللہ رسد“ کافی ہے محراب لال کنواں دکھا کر محلہ علی مارا کھاکرو۔“ (ہام نقد)^۱
 ”میں بھی ماراں میں رہتا ہوں۔ اُلی کا محلہ یہاں سے بے مبالغہ آدھ کوں ہے۔“ (ہام نقد)۔
 ”سورہ پے کی ہڈی اُٹل جو کچھ کہیے وہ ملا ایک آدی رسید میری لے کر نفل کے کڑے میں چلا گیا۔
 سورہ پے چورہ شاہی لے آیا۔“ (ہام نقد)^۲

”بساوں کی نگلی میں جو کھیسوں کی نگلی کے قریب ہے جواش صاحب کی کوٹھی انہوں نے مول لی ہے۔“ (ہام نقد)^۳

”دوہر کے وقت شیخ مشرف علی رہتے والے استاد حامد کے کوچہ کے میرے پاس آئے اور انہوں نے تمہارا لکھا ہوا خط ۱۵ جواوی الٹا فی کاویا۔“ (ہام میر مہدی)^۴

”میرزا قربان علی بیک کے مکان میں مولوی مظہر علی رہتے ہیں میرے ان کے مسکن میں ایک میر خیراتی کی حویلی درمیان میں ہے۔“ (ہام میر مہدی)^۵

”جامع مسجد کے گرد بکچس بکچس گزروں میدان نکلے گا۔ دکا میں حویلیاں ڈھالی جائیں گی۔ خان چند کا کوچہ شاہو لا کی بڑھک اُچھے گا۔“ (ہام میر مہدی)^۶

”ٹار خاں کے چھتے کی سڑک خان چند کے کوچہ کی سڑک دیکھ جاؤ بلاقی بیگم کے کوچہ کا ڈھانسن جاؤ۔ درہ اور چاؤڑی اور اجمیری دروازے کے بازار اور بلاقی بیگم اور خان دوراں کی حویلی کے کھنڈر کھتے پھرو۔“ (ہام میر مہدی)^۷

”یہ نہیں جانتا کہ آغا جان کہاں رہتے اب میرا محل کی بی بی پاس جیش خاں کے چاکر آدی بھیجوں گا۔“^۸

”مولوی مظہر علی صاحب لاہوری دروازہ کے باہر صدر بازار تک ان کو پہنچانے گئے۔“ (ہام میر مہدی)^۹

”جامع مسجد و گزشت ہوئی۔ چلی قبر کی طرف بیڑھوں پر کھائیوں نے دکائیں جائیں۔“¹⁰

”قاری کا کنواں بند ہو گیا لاڈل ڈکی کے کنوئیں ایک قلم کھاری ہو گئے۔ جامع مسجد سے راج گھاٹ تک کا بے سہارا کھراقل ورتی ہے۔ مرزا کوہر کے باٹھے کے اس جانب کوئی کوس خلیب تھا۔ وہ اب باٹھے کے محن کے برابر ہو گیا۔ یہاں تک کہ راج گھاٹ کا دروازہ بند ہو گیا۔“¹¹

”کشمیری دروازے کا حال تم دیکھ گئے ہو۔ اب آٹمی سڑک کے واسطے نکتہ دروازے سے کالی دروازے تک میدان ہو گیا۔ پنجابی کٹرلا چوٹی دارا رام جی گنج سعادت خاں کا کٹرلا جرنیل کی بیوی کی حوٹلی رام جی داس گودام والے کے مکانات صاحب رام کا بارغ حوٹلی ان میں سے کس کا پتہ نہیں ملتا..... اردو بازار خدہ... اردو کہاں“ (خاتم میر مہدی)¹²

”روشن اللہ وال کا درہ جو مقب کوٹوالی چھترہ ہے وہ اور خواجہ قاسم کی حوٹلی جس میں منٹل علی خان مرحوم رہتے تھے وہ اور خواجہ صاحب کی حوٹلی یہ الماک حضرت کالے صاحب کی اور کالے صاحب کے بعد میاں نظام الملک جی کی قرار پا کر ضبط ہو گئی۔“ (خاتم میر مہدی)¹³

”لیل خانہ فلک پر اکال ڈکی کی کھانسی کے مکانات سب گرائے گئے ہیں۔“ (خاتم صغین مرزا)
”بھائی فطوط عرب سرا میں رہتے ہیں۔ پرسوں سے آئے ہیں عرضیاں دیتے پھرتے ہیں کوئی سنتا نہیں۔“ (خاتم صغین مرزا)¹⁴

”بڑے بڑے نامی بازار خاص بازار اردو بازار اور خانم کا بازار کہ ہر ایک بجائے خود ایک تھبہ تھا اب پتہ بھی نہیں کہ کہاں تھے۔“ (خاتم عبد الغفور سرور)¹⁵

”قلعے کے آگے جہاں لال ڈکی ہے ایک میدان نکالا جائے گا خوب کی دکائیں پہلے ل کے گھر لیل خانہ بلاق حکم کے کوپے سے خاص بازار تک یہ سب میدان ہو جائے گا۔ یوں گھمو کہ اسو جان کے دروازے سے قلعے کی خندق تک.....“ (خاتم یوسف میرزا)¹⁶

”دریہ کا دروازہ اٹھایا گیا۔ قافلہ حصار کے کوپے کا بقیہ مٹایا گیا۔ کشمیری کٹرے کی مسجد زمین کا پتہ ہو گئی۔ سڑک کی وسعت دو چند ہو گئی۔ فضل اللہ خان گلش کی حوٹلی پر جو گلہ تھے ہیں جن کو عوام گمزی کہتے ہیں انھیں ہلا ہلا کر ایک ایک کی بنیاد ڈھا دی۔“¹⁷

”قاسم جان کی گل میر خیراتی کے پھانک سے فتح اللہ یک خان کے پھانک تک بے چراغ ہے۔ ہاں اگر آبادی ہے تو یہ کہ غلام حسین خان کی حوٹلی میں ہسپتال ہے۔“ (خاتم عزیز الدین بدایونی)¹⁸

غالب نے اپنے مکاتیب میں دلی کے بازاروں کی کوچوں، عمارات، باغات، کنوؤں، بادلیوں اور حوٹلیوں کا ذکر کیا ہے۔ کٹر فطوط خدہ کے بعد کے ہیں اور ان میں عمارات و اماکن کی برہادی اور گلوں کے بے چراغ ہونے کا ذکر ہے۔ کبھی یہ کوپے شاد و آباد تھے۔ چائے تھے۔ روشن ہوتے تھے۔ بازاروں میں کھوے

سے نکھوڑا چھلکا تھا۔ دو نفیس قمیص۔ آبیے ان دلوں کی دہلی کی سیر کریں۔

”دہلی کے شمال میں ضلع کرنال ہے۔ مشرق میں دریائے جمنا اسے بحرِ خور اور بلندِ خور سے جدا کرتا ہے۔ جنوب میں ریخت اور مغرب میں گڑگانواں ہے۔ ۱۸۶۸ء کی مردم شماری کے مطابق ضلع دہلی کی آبادی ۶ لاکھ ۲۷ ہزار ۷۸۵ سو پچاس نفوس پر مشتمل تھی۔ جن میں چار لاکھ اڑتیس ہزار ۷۵۰ اور ایک لاکھ تیس ہزار ۷۳۵ مسلمان تھے جبکہ دہلی شہر کی آبادی ایک لاکھ چوں ہزار چار سو سترہ تھی۔ ضلع کا رقبہ ۱۲۳۷ مربع میل تھا۔“ ... مرزا حیرت دہلوی¹⁹

اس مردم شماری سے تیس سال قبل دہلی شہر کی آبادی ۳۶۶۲۳۶ تھی۔ حیرت کی بات ہے کہ تیس برسوں میں شہر کی آبادی میں صرف ۳۱ ہزار کا اضافہ ہوا۔ لیکن ایک وقت ایسا بھی تھا جب شہر کی آبادی کم ہو گئی تھی۔ یعنی نادر اور مایند جب بھول غالب دہلی شہر نہ تھا ایک کسب تھا۔... اور مسلمانوں میں صرف اہلِ حرفہ اور حکام کے شاگرد پیشہ شہر میں باقی رہے تھے اور پھر دہلیاں ملک نے بہ اہتمام شہر کو سمار بھی کیا تھا۔ ”جب مسلمان“ (وصوطے کو نہ ملتا تھا۔“

اکتوبر کی مردم شماری کے مطابق آبادی کے آنکڑے کچھ یوں تھے۔²⁰

مسلمان بالغ	مرد	عورتیں
۲۱۸۶۵	۲۳۳۱۱	
۱۰۰۹۸	۸۸۹۰	
۲۳۳۳۹	۲۳۳۱۱	
۹۸۱۶	۷۹۸۹	
۶۶۱۵۸	۶۳۵۰۳	

یہ آبادی ۶۸۰۰۰۶ گھروں میں رہائش پزیر تھی۔

(ASIATIC INTELLIGENCE CALCUTTA)

۱۸۱۳ء میں اس شہر کی آبادی میں ایک معتز فرد کا اضافہ ہوا جب غالب آگرہ سے سکونت ترک کر کے دہلی میں آئے۔ اس سے ۳ سال قبل غالب اس شہر کے حاملہ بنے تھے²¹ جبکہ ۱۰ سال قبل یہاں انگریزوں کی آمد ہوئی تھی۔

۱۹ ستمبر ۱۸۰۳ء کو انگریز دہلی میں داخل ہوئے۔ وہ جیتائی سے محروم معزود بادشاہ شاہِ عالم کی دعوت پر آئے تھے۔ بادشاہ نے مرہٹوں کا مقابلہ کرنے کے لیے انگریزوں سے مدد مانگی تھی۔ پتہ چر سچ کی لڑائی میں لارڈ لیک نے سندھیا کے لشکر کو شکست سے دو چار کیا۔ فاتحین نے شاہِ عالم کو ملاحتی بادشاہ کے طور پر باقی رکھا۔ دہلی میں رہنے لیس کاظم ہوئی۔ مرزا یوڈا ازلوئی المعروف بہ اختر لونی صاحب پہلے ریڈیٹ بنے۔ جمنا کے

دائیں کنارے پر واقع کچھ علاقہ شاہی خاندان کے اخراجات کے لیے بادشاہ کو دیا گیا اور فیصلہ کیا گیا کہ ان زمینوں کا انصرام ریٹ فیڈٹ کرے گا اور پیداوار کا محصول بادشاہ کو دیا جائے گا۔ برطانوی قوانین کے تحت شاہ کے نام پر عدل و انصاف کا نظام قائم کیا جائے گا۔ دو عدالتیں دیوانی اور فوج داری قائم کی جائیں گی۔ سزائے موت پر بادشاہ کی منظوری کے بغیر عمل درآمد نہیں ہو سکے گا اور امضاء قلع کرنے کی سزا بند کر کے قید میں تبدیل کر دی جائے گی۔²³

بادشاہ اپنی زمینوں کے معاملات پر نظر رکھنے کے لیے گلگت کے دفتر میں ایک دیوان اور چند ادنیٰ اہلکار مقرر کرے گا۔ بادشاہ اور شاہی خاندان کے افراد کے وظائف مقرر کیے گئے۔ انگریزوں نے اپنی ضرورت کے مطابق شاہ جہاں آباد کے اندر کشمیری دروازہ اور دریا گنج کے قریب غاراتیں تعمیر کیں اور فیصل شہر کے باہر بھی۔

شاہ عالم کی وفات کے بعد ۱۸۰۶ء میں اکبر شاہ ثانی بادشاہ بنے اور ۱۸۳۷ء تک رہے۔ ۱۸۰۹ء میں دلی کو صوبہ بنا دیا گیا تھا۔²⁴

دلی کی غاراتوں کے بارے میں لکھی جانے والی سب سے پہلی کتاب ”سیر المنازل“ ہے جو ۱۸۳۳ء میں لکھی گئی یعنی ”آثار الصداویہ“ سے کوئی ۲۳ برس قبل۔ اس کے مصنف تھے مرزا عظیم بیگ اور یہ کتاب انہوں نے چارلس تھیوفیلس سٹاک اور مسٹر ولیم فریزر کے کہنے پر لکھی۔ اہم بات یہ ہے کہ انہوں نے غارات کے ساتھ ساتھ دلی کے کوچہ و بازار کا ذکر بھی کیا۔ جامع مسجد کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں²⁵۔

”مسجد مذکور کے تین طرف بیڑیوں کی تعداد اس طرح ہے۔ مشرق کی طرف ۳۵۰ فٹ کی طرف ۳۹ اور جنوب کی طرف ۲۳۔ مشرقی بیڑیوں پر روزانہ تیسرے پہر کوتر اور ہر قسم کے جانور ہر موسم میں شوقینوں اور بچوں کے لیے بیچے جاتے ہیں۔ شمالی بیڑیوں کے نیچے شام کے وقت ایک داستان گواہ ہے اور قصبے سا ہے۔ جنوبی بیڑیوں پر تیسرے پہر کتا ہیں، تھیلار اور ہر قسم کی دوسری اشیاء بکتی ہیں۔ مسجد کے پیچھے مغرب کی طرف دال نزدشوں منکرات مثلاً الخنوع وغیرہ بیچنے والوں کی گھنٹی اور میدہ گروں کی دکانیں ہیں اور چاندنی کے نام سے ایک مشہور بازار ہے۔ چاندنی بازار کے شمال میں دارالشفاء کی غارات ہے۔ اسے شاہ جہاں بادشاہ نے چار مسافروں اور طالب علموں کے لیے تعمیر کرایا تھا۔ یہاں ان کا علاج ہوتا تھا اور انہیں شفا حاصل ہوتی تھی۔ یہاں بہادر علی خاں کی حویلی کا دروازہ چھٹا شاہ نظام الدین کے دروازے کا راستہ ان کی حویلیاں محلہ روشن پورہ اور نواب والا جناب اعظم الدولہ عین الملک نواب محمد امیر خان بہادر قصور جنگ کا اصطبل واقع ہیں۔ یہاں بزرگ کا ایک درخت ہے جو بڑا شاہ بدلا کے نام سے مشہور ہے۔ شاہ بدلا شاہجہاں بادشاہ کے زمانے میں ایک درویش تھے۔ ان کی قبر اسی جگہ واقع ہے۔ یہاں کوچہ نائی داڑہ بھی ہے۔ اس کوچہ سے کوچہ چرخ والا تک کسمیروں کی دکانیں ہیں جہاں تانبے جھنک کے برتن بکتے ہیں۔ بازار کے پتوں میں ایک کساری کنواں

ہے۔ اس بازار میں قطعی پنجم اور حکیم بھائی حویلیاں اور اللہ آباد کی پولیس چوکی کی عمارت ہے۔ یہاں بازار کے درمیان میں حوض قاضی ہے۔ یہاں سرکی دالوں کی دکانیں ہیں۔ حویلی نواب ترک جنگ اور حویلی قطعی پنجم کے عقب میں ایک کوچہ ہے اور شاہ تارا کی گلی ہے۔ یہاں رعایا کے مکانات ہیں۔ یہاں سے شہر چٹاہ کے اجمیری دروازے تک جوتے بنانے والے سوچوں کی دکانیں ہیں۔ اجمیری دروازے کے متصل شہر چٹاہ کی فیصل کا راستہ ہے اور گول اندازوں کے بارگ ہیں۔ چاوڑی بازار سے اجمیری دروازے تک جنوب کی طرف دارالہقاہ کی عمارت واقع ہے۔ یہ عمارت شاہجہان بادشاہ غازی نے فقراء مساکین اور ضرورت مند مسافروں میں صدقہ و خیرات کی تقسیم کے لیے تعمیر کرائی تھی۔ اس کے بعد چٹاہ دروازہ ہے جس میں عام لوگوں کے مکانات ہیں۔ اس کا ایک دوسرا راستہ بادشاہ محمد اکبر شاہ غازی کے ماسوں میر جوسا کی حویلی کی طرف جاتا ہے۔

چٹاہ دروازے سے اہل حرفہ اور کاغذیوں کی دکانیں ہیں۔ کوچہ میر عاشق اور کوچہ تٹاشے والا ان ہے۔ راجا کیدار ناتھ کی حویلی کی طرف ایک گلی ہے۔ اس میں بھالوں اور لوہے والوں کی دکانیں اور کوچہ مرغٹاں ہے۔ اس کا دوسرا راستہ اٹلی کے محلے میں نکلتا ہے۔ اس جگہ سے مذکورہ بالا حوض قاضی تک اللہ آباد پولیس چوکی کے سپاہیوں کی عمارت، پنجابی گاڑی بانوں کا کنڑا محمد شاہ کے وزیر نواب قمر الدین خان کی حویلی، کٹراڑ کی پکھری کی عمارت اور ٹھٹھے اور دتت پنچوں کی دکانیں ہیں۔ یہاں محلہ جٹواڑہ بھی ہے۔ شہر چٹاہ کے اجمیری دروازے کے نزدیک فیصل اللہ خان کی مسجد واقع ہے۔

تشریح حوض قاضی



حوض قاضی کے شمال میں ریوڑی والے کی دکان راجا سید محل کی حویلی راجا بے سنگھ کی حویلی نواب ترک جنگ، ہیدل جنگ خان مرحوم کی حویلی اور حافظ عبدالرحمن خان کی حویلی کا دروازہ ہے۔ حافظ عبدالرحمن خان مرشد زاوۃ برادر حضور دلا یعنی مرزا نیلی کے عطاء سرکار ہیں۔ اس حویلی کے نزدیک مسماہ بختا طوائف کا مکان ہے۔ یہ طوائف محرم کے ایام عشرہ میں دیو کا ایک بت بنا کر اپنے دروازے پر کھڑا کرتی ہے۔ اسی راستہ میں تانپے کے برتن بنانے والوں کی دکانیں اور شادلی خان مرحوم کی حویلی ہے۔ اس کے بعد

نور اللہ خان کا مکان اور کوچہ چنڈت ہے۔ کوچہ چنڈت میں شاہ پند خان اور سر پند خان کی حویلی امر زینت بیگ خان اور عام لوگوں کے مکانات ہیں۔ یہاں سے ایک راستہ مذکورہ بالا کوچہ شاہ جارا میں بھی جاتا ہے۔

کوچہ چنڈت کے مقابلہ میں جان صاحب مرحوم کی مسجد اور مکان ہے۔ چوڑی گروں کی دکانیں لکھڑوں کا کڑا سبز مسجد اور کنواں اور آدینہ بیگ کا کڑا بھی اسی علاقے میں واقع ہے۔ سبز مسجد اور کنواں اور آدینہ بیگ کا کڑا بھی اسی علاقے میں واقع ہیں۔

سبز مسجد کے سامنے نواب فتح اللہ بیگ خاں کا بالا خانہ اور نواب سرب بیگ قاسم خاں مرحوم کی حویلی کی جانب ایک گلی کا دروازہ ہے۔ اس گلی میں محمد خاں کڑاڑہ کی حویلی اور سبز نواب منظور خاں کی حویلی اور طویلے کی عمارت تیر انداز خاں کا مکان اور نواب احمد بخش خاں کی حویلی اور فیض اللہ بیگ خاں کا دیوانہ خانہ واقع ہیں۔ اس گلی کا راستہ علی ماراں میں نکل جاتا ہے۔ یہاں نواب فتح اللہ بیگ کے مکان کے بعد مسجد غلیظہ بخشو علیہ الرحمہ کوچہ کھڑکی فرماں خانہ محلہ رود گراں میر جملہ کے مکانات خواجہ بھکاری صاحب کا مکان اور کا مکان صاحب کی حویلی ہے۔ غلیظہ بخشو کی مسجد کے بعد لوہاروں کی دکانیں اور تیر انداز خان کا مکان ہے۔ یہاں بازار کے بیچ میں ایک کنواں ہے جو لال کنواں کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے نزدیک کنواں شیخ جاعد ہے جہاں عام لوگوں کے مکانات ہیں۔ میر جملہ کی حویلی قاسم خاں کی پولیس چوکی کی عمارت اور کوچہ سوسر ہے جس کا دوسرا راستہ شہر بنہاؤ کی کھڑکی فرماں خانہ کی طرف نکل جاتا ہے۔ اس کوچہ میں حکیم ذکا اللہ خاں و لہیرہ کے مکانات اور نواب نجف خاں منظور کی عمارت ہوئی ایک حویلی ہے جو غلط فہمی میں خاں کی حویلی کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے علاوہ عام لوگوں کے مکانات مولوی قطب الدین صاحب ولد جناب مستطاب فخر العالم صدر الشرائع مولوی فخر الدین صاحب رحمت اللہ علیہ اور میر حامد علی صاحب چاہاز کے مکانات ہیں۔ مذکورہ بالا کوچہ کے باہر قاسم خان مرحوم کے سپاہیوں کی عمارت کے نزدیک پھول بیچنے والے کی دکان ہے۔ یہاں چابک سواروں کے دلال بیٹھے ہیں۔ اس کے بعد مسجد فتح پوری کی جانب ایک کوچہ ہے۔ اس میں کٹوا گوندی کٹوا اڑیاں یعنی بڑیاں بنانے والے کمال خانہ اور رحمت کی دوسری حویلیاں ہیں۔ اس کے بعد نواب شہو از خان کی حویلی اور مسجد تھوڑی دکانیں ہیں۔ پھر کھاری پاؤلی اور نیاباٹس کے بازار ہیں۔ کھاری پاؤلی میں ایک پاؤلی اور ایک مسجد واقع ہے۔

یہاں رحمت کی حویلیاں و دستکاروں اور ریوڑی والوں اور تانے والوں کی دکانیں ہیں۔

حوض قاضی کے جنوب سے شہر بنہاؤ کے ترکمان دروازے تک دونوں طرف کی گلیوں کا ذکر سب سے پہلے حلوانی کی دکان اٹلی بازار کی گلی کوچہ بلاتی رام حافظہ نڈا کا بھٹہ کوچہ مرغان رحمت کے مکانات کشمیری چنڈتوں کے گھر و دو صاحب داری کی حویلی پالم کے تحصیل دار لالہ گلاب رائے چنڈت کا مکان کوچہ بائی داس اور قنات شیخ داس واقع ہیں۔ یہاں ایک دوسری گلی بھی ہے جو کوچہ بلاتی رام کی طرف جاتی ہے اور کوچہ شیدی

قاسم کے نام سے موسوم ہے۔ اس کو سچے میں گوردھن کشمیری اور میرخان خٹہ کی رہائش ہے جو تاج گانے میں یکساں ہے۔ مرزا فتح اللہ بیگ چیلہ مولوی فتح علی صاحب جاگیردار کی حویلی اور دیگر عام لوگوں کے مکانات ہیں۔ شہر پناہ کی فیصل کی طرف جانے والی گلی ہے۔ جرم سادھنکوں کی رہائش اور ان کی املاک ہیں۔ من سکھ رائے کا خدی کا باغیچہ نواب مظفر خان کا حوض اور رحمت کے گھر ہیں۔

تھان بیچ جی اس سے حویلی لالہ بھتی رام حویلی سدا سکھ چڈت بازار سیتا رام اور جانی خان کا کھنڑا ہے۔ یہاں عام لوگوں کی رہائش ہے۔ اس کے مقابلہ میں شاہ جانی کی طرف ایک کوچہ ہے۔ اس کے بعد در راستے ہیں۔ ایک محلہ چوڑی گراں کی طرف اور دوسرا سیکس داس کے حمام کی طرف۔ سیکس داس شاہ عالم کے عہد کا شخص ہے۔ حویلی رائے محبوبا تھہر نقی خان کا طویل راہ کبیرا تاجہ کی حویلی گاڑی بانوں کا کھنڑا اور کھاری کنوئیں کے نزدیک ایک راستہ ہے۔ دوسرا راستہ شیدی نوادہاں کے بچلے کوچہ امام وغیرہ اور عام لوگوں کے مکانات کی طرف جاتا ہے۔ جانی خاں کے کھوے سے تین راستے ہیں۔ ایک راستے پر کالی مسجد کا بچھاوا اور مظفر خان لکھور کا حوض اور جلی داروں اور دوسرے راستے پر اہل حرفہ کی ریاست واقع ہے۔ اس سہ راہ پر میر مرزا کی حویلی ہے جس کے دروازے پر صوبہ بنارس کی دکان ہے۔ یہاں سید حسن رسول لہا کی اولاد میں سے میر علی گلی صاحب مرحوم کا مکان اور مسجد ہے۔ بھولہ پہاڑی اور محلہ ٹیللی خانے کی طرف جانے والی گلیاں ہیں۔ یہاں شاہی توپ خانے کے داروہ میرزا جہاں بیگ خان کشمیری چڑتوں کے مکانات نواب احمد بخش خان کے وکیل لالہ گوردھن داس اور عزیز اللہ خان کی حویلیاں اور عام لوگوں کے دوسرے مکانات ہیں۔

محلے کے دروازے کے سامنے باہر کی طرف شاہ حسین دھما کی مسجد ہے۔ مسجد کے نزدیک دارالحکومت کے سابق صوبیدار شاہ جانی بیگ صاحب کے مقبرے کا دروازہ ہے۔ اس کے بعد پہاڑی کی طرف حسن علی خان عرف میاں حسن مرزا میر فتح علی شاہ صاحب کی حویلیاں روشن موچی کا مکان اور چھوٹے معماران کا راستہ ہے۔ مولوی محمد جان حافظ خیراتی صاحب کی حویلیاں اور عام لوگوں کے دوسرے مکانات ہیں۔ پہاڑی کے اوپر میر علی گلی صاحب کے مکان کے نزدیک سے ایک تیسرا راستہ ترکمان دروازے کی طرف نکل جاتا ہے۔ مغرب میں جنوبی بازار کی طرف کالی مسجد ہے جو دارالحکومت کی آبادی سے پہلے خیر و شاہ بادشاہ کے زمانے میں بنائی گئی تھی۔ اس کا اصل نام کھان مسجد ہے۔ اس کے بعد حضرت خمس العارفین شاہ ترکمان بیابانی کی درگاہ ہے۔ اس علاقے میں سید نور علی خان اور دوسرے لوگوں کے مکانات ہیں۔ مظفر خان کا حوض ترکمان دروازے کی پالیس چوکی کی قمارت اور سپاہیوں کے مکانات واقع ہیں۔ اس کے دو پر و گدڑیوں اور دوسرے لوگوں کی ٹھیکیت ہے۔ ترکمان دروازے کے نزدیک ایک قدیم مسجد واقع ہے۔ اس کے بعد نواب سلیمان خان المعروف میر بھکاری کی حویلی ہے۔ پھر ترکمان دروازہ اور دروازے پر حسین سپاہیوں اور گولہ اندازوں کے مکانات ہیں۔

جامع مسجد کی جنوبی سڑکوں کے چھ رہاٹیوں کیوں ہاں والے جوتے والوں فتح جی اور کریم جی دستار فرخوں دوسرے دست کاروں کی دکانیں اور امام کا کوچہ ہے۔ یہاں فتح منگھو کی حویلی اور دوسرے عام لوگوں کی رہائش ہے۔ یہاں شاہگل بھی ہے جہاں عام لوگوں کے مکانات ہیں۔ نواب احمد علی خان مرحوم کی حویلی ہے۔ ہزارہ یک کی حویلی اور بنگلہ شہیدی فواد خان ہیں جو محمد شاہ مرحوم کے عہد میں کوتوال شہر تھا۔ اس کے سامنے عزیز آبادی بنگم کی حویلی اور محلہ بھو جلد پہاڑی کی طرف ایک گلی ہے۔ یہاں سے حضرت شاہ جی اور دوسرے اطراف میں راستہ جاتا ہے۔ پہاڑی بھو جلد کی پولیس چوکی کی عمارت ہے۔ اس کے پیچھے فیضی رکاب دار واقعہ کے چاہیوں اور نواب مرتضیٰ خان کے مکانات ہیں۔ اہل حرفہ کی دکانیں ہیں۔ اس بازار میں ایک قرا ہے۔ اس کا ایک راستہ ترکمان دروازے کی طرف جاتا ہے۔ اس کے شروع میں ایک حمار ہے جو چنگی قبر کے نام سے مشہور ہے۔ اس حمار کے مقابل کوچہ پہاڑی ہے جس کے اوپر معماروں اور دوسرے عام لوگوں کی حویلیاں ہیں۔

یہاں سے ایک راستہ کوچہ ٹیلی خانہ اور میر فتح اللہ شاہ مغفور کے حمار کی طرف جاتا ہے۔ اس کو پے میں میر محمدی صاحب کا مکان ہے۔ اس کے نزدیک اس کی مسجد و دستکاروں کی دکانیں اور پہاڑی کا دوسرا راستہ ہے۔ یہاں میر ہاشم صاحب کی حویلیاں اور حکیم سید قدس اللہ خان کی مسجد ہے۔ مسجد کے نزدیک چھتا سوم گراں اور میاں آفاق صاحب میر زادہ کا مکان ہے۔ یہاں مرتضیٰ خان کی دوسری حویلی اور حکیم صاحب موصوف کا دیوان خانہ ہے۔ یہاں حضرت شاہ نظام علی صاحب کا مکان اور مرزا ہاں جاہاں صاحب رحمت اللہ علیہ متخلص بہ مظہر کا حمار ہے۔ اس کے بعد شاہ وطن کی دکنی گلی اور ان کا مکان ہے۔ اس کے نزدیک حکیم قدس اللہ خان اور حکیم عزت اللہ خان اور دوسرے عام لوگوں کی حویلیاں ہیں۔ حضرت شمس العارفین کی درگاہ کا راستہ ہے۔ اس کے بعد عام لوگوں کی حویلیاں اور محلہ گلپان چہرہ واقع ہے جس کا دوسرا راستہ گنج نواب میر خان کی طرف جاتا ہے۔ محلہ نو گھرہ کے مقابل گزریوں کی رہائش گاہ کی جانب کوچہ اور ترکمان دروازے کا راستہ ہے۔ چنگی قبر سے دہلی دروازے تک دوسرے راستے پر سب سے پہلے اعظم خان کی حویلی ہے اور عام لوگوں کے اکثر مکانات ہیں۔ جنت سازوں کی اٹاک ہے۔ منڈی چہ پینہ اور حضرت فردوس منزل کے کلہوڑاں کی حویلی ہے۔ مولوی شاہ عبدالعزیز سہل اللہ تھانی کی رہائش اور در سے کی عمارت ہے۔ شاہ جی کی مسجد سوزن گروں وغیرہ کی رہائش گاہ کا راستہ اور کوچہ چیلان ہے۔ یہاں ایک گلی نواب مہدی علی خان مرحوم کی حویلی کی طرف جاتی ہے جہاں دیر اللہ خواجہ فرید خان اور مٹھی خلیل اللہ خان رہتے ہیں۔ اس گلی کے نزدیک خواجہ میر درد صاحب اور عمر خان بزمی کے مکانات اور حکیم شاہ اللہ خان کی حویلی ہے۔ اس کے بعد حکیم تاجدار خان اور کاہار خان کی حویلی اور مسجد ہے۔ مہدار رسول خان اور دوسرے لوگوں کے مکانات واقع ہیں۔ ایک گلی کٹاں محل معروف ہے "کا اہل" کی جانب جاتی ہے۔ یہ نواب فیض محمد خان بہادر کی ملکیت ہے۔ یہاں فیض طلب خان کا

مکان رنگ محل وغیرہ زمانے کے مکانات اور ایک نئی مسجد واقع ہیں۔ اس گلی کا دوسرا راستہ دہلی دروازے کی طرف جاتا ہے۔ کلاں محل میں غلام احمد خان کو قوال معزول اور دوسرے لوگوں کے مکانات ہیں۔ کلاں محل کے شمال کی طرف شاہ عبدالعزیز کا قدیم مدرسہ اور میر مندر محل صاحب جہار کا مکان ہے۔ اس کے بعد شپاگل کی عمارتوں کے پیچھے کوچہ چیلان کے نزدیک نواب میر خان مرحوم چٹھا کا بازار ہے جو محمد شاہ بادشاہ کے زمانے میں بہت بڑے امراء میں سے تھے۔ اس علاقے میں نواب مذکور کا کچا "نواب قلعہ محل خان کی حویلیاں ہانچے اور نقاب پور واقع ہیں۔ اس کے بعد شہر چٹا کی فیصل اور میر خان کی کھڑکی ہے جو بند پڑی ہے۔

اس بازار میں نواب حیرم خان کا ترابا ہے۔ یہاں سے ایک راستہ نواب مہدی علی خان کی حویلی کی طرف جاتا ہے وہاں دو راستے ہیں ایک قلعہ گنہر فیض بازار اور قاضی کی حویلیوں کی طرف اور دوسرا راستہ حکیم محسن خان رانا کے وکیل محمد علی خان مولوی رفیع الدین صاحب منظور اور دیگر لوگوں کے مکانات اور شاہی فوجدار میر نجف علی خان کی حویلیوں کی طرف جاتا ہے۔ اس کے قریب سید امیر علی کا مکان "میرزا سلیم بہادر مرشد زاوے کے قریب میرزا معلل کے مکانات اور فیض بازار کا راستہ ہے۔ تیسرا راستہ مہدی علی خان کا سی کی حویلی سے جاتا ہے جو نواب نجف خان بہادر کے ملازمین میں سے تھے۔ حویلی کے نزدیک ایک قدیم مسجد "دائی والی مسجد" ہے۔ یہاں محض محل میاں ہے جس میں رعایا کے مکانات حکیم فیض علی خان مرحوم کی حویلی ہے۔"

اب تک ہم مرزا انگلیں چک مرحوم کی انگی بکڑے جامع مسجد کی میزبوں سے اتر کر کوچہ بازار کی میر کر رہے تھے۔ اب آتے ہیں قلعہ معلیٰ کی جانب۔ دیکھیں! قلعہ کے اطراف مرزا صاحب میں کیا کیا دکھاتے ہیں۔ قلعہ مبارک کے دہلی دروازے سے جہاں پتھل کی ایک توپ جو توپ برقی معروف بہ کالے خان ہے بے تخت پڑی ہوئی ہے۔ باظر منظور علی خان کا مکان ہے اور سلطانوں اور مرشد زادوں کے مکانات ہیں جو قلعہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے اندر اسد برج میں مرزا جہانگیر بہادر کا محل اور محمد اکبر بادشاہ غازی کے بھائی مرزا اعلیٰ کی رہائش گاہ ہے۔ یہاں راستے میں ایوب حسن کی طرف خواص پورہ جلو خانے کا چوک اور نگار خانہ ہے۔ نگار خانہ لاہوری دروازے کے چھتے کے درمیان چوک میں فیض خیر بتی ہے۔ اس چھتے کے متصل باظر عشرت علی خان کی حویلی ہے۔ لاہوری دروازے کے اوپر قلعہ دار کپتان میکلا رسن صاحب بہادر کی رہائش گاہ اور رعایا اور شاہی ملازمین کے بیشتر مکانات ہیں۔

قلعے کے دہلی دروازے سے شہر چٹا کے انجمیری دروازے یعنی جنوب مغرب کی طرف سب سے پہلے چوک نواب سعد اللہ خان ہے جو شاہجہان بادشاہ غازی کے دلیر تھے۔ یہاں ہر سال غازی میاں اور "مدار شاہ" کی چٹریاں کھڑی کی جاتی ہیں اور شہر کے لوگوں کا جھوم ہوتا ہے۔

چوک کے ارد گرد مشرق کی جانب راج گھاٹ وغیرہ مغرب کی جانب خاص بازار قلعہ مبارک کے لاہوری دروازے کی طرف شمال کی جانب گھم دو غیرہ۔ نواب بہادر خان کی منبری مسجد اور اکبر آبادی

مسجد کی جانب جنوب میں کشمیری کنڑ اور دہلی دروازے کا راستہ وغیرہ۔ اس چوک کے مشرقی جانب محلہ کشمی پانان اور اسدہلی جزائی کی حویلی، ہانچہ پائیں، پین پچکی کی کنڑ کی اور شہر پناہ کا راج گھاٹ کا دروازہ ہے۔ خاص چوک کی طرف دستکاروں کا بازار نکالیں اور بازار خاتم کا راستہ ہے۔ اس کے بعد شاہی آباد رخانے کے داروغہ عبدالرسول خان کی حویلی اور بلاقی بیگم کا کوچہ عایا کے مکانات، بیبا طیس کی دکانیں اور شاہ سرد کے حصار کا احاطہ ہے انہیں عہد سلطان عالمگیر اور گلزیب کے دوران مجذوبیت کے عالم میں نقل کیا گیا تھا۔ اس کے متصل شاہ ہرے بھرے درویش کا حصار اور شاہی چٹائی خانے کی عمارت ہے جو جامع مسجد کے نیچے واقع ہے۔

شہری مسجد کے پیچھے بیگم بیگم صاحبہ مرحوم بہت حضرت فردوس منزل کا مقبرہ ہے جو کوہ باری کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے بعد مسجد اکبر آبادی واقع ہے جس کے نزدیک کشمیری کنڑ اور گھسال کی عمارت ہے۔ خان دروان خان کی حویلی اور نواب فیض محمد کے مکانات ہیں اس کے مقابل دریا تنج کا دروازہ ہے۔ یہاں ایک دوسری گلی بھی ہے جہاں میاں سابر بخش کی سرائے اور مکانات اور نواب روشن الدولہ کی مسجد ہے۔ مسجد کے پیچھے قاضی کا مکان ہے۔

شہر پناہ کے دہلی دروازے کے نزدیک رائے پران کھنن لالہ گور پر شاہ اور دوسرے لوگوں کے مکانات ہیں۔ فیض بازار کی پولیس چوکی عمارت کے نزدیک ایک گلی ہے جو نواب بہادر علی خان کے باغیچے اور دریا تنج کی طرف نکلتی ہے۔ یہاں صاحبان عالی شان کی کولمبیاں، شہر کی پلٹن کی چھاؤنی، توپ خانے کی عمارت، لکھنؤ سو گز نواب احمد بخش خان بہادر کی کولمبیاں اور زینت الساجد واقع ہیں۔۔۔۔

اس کے نزدیک شہر پناہ کا دروازہ ہے۔ میکوزین اور بلو گڑھ کے راجا کنور راج سنگھ کا مکان ہے جو دارالخلافہ کے نواحی علاقے کے فوجدار بھی ہیں۔ یہاں پر نواب فیض محمد خان کی کولمبی، شہر پناہ کا نیلا برج اور انگریز صاحبوں کے رہائشی بنگلے ہیں۔

سعد اللہ خان کے چوک کے شمال میں قلعہ مبارک کے لاہوری دروازے کی جانب ایک طرف قلعہ ہے اور دوسری طرف شہی نین کنول کے باغ کا دروازہ رحمت کی رہائش مرزا ولی محمد بہادر کا قلعہ خانہ اور اردو بازار ہے۔

قلعہ مبارک کے لاہور دروازی سے شہر پناہ کے لاہوری دروازے تک شمالی بازار کی طرف سب سے پہلے دہلی صاحب اور کلتن صاحب اور قاضی کی مسجد واقع ہیں۔ مذکورہ مسجد کے قریب میول صاحب کی دکانیں، دولت النساء بیگم کی حویلی، بھاگ سنگھ کا مکان، نریب النساء بیگم صاحبہ زوجہ سرور صاحب کی کولمبی اور کاغذ فروش کی دکانیں ہیں۔ یہ دکانیں سکھ چند ساہو کی ملکیت ہیں۔

سکھ چند ساہو کا مکان محل فردوس کی منڈی، شراب خانہ ممتاز تنج اور شاہی توپ خانہ ہے جس میں

اب گاڑی ہان رہتے ہیں۔ اس کے بعد کوڑیاہل ہے جس کے نیچے سے فیض خیر جاری ہے۔ ایک تہاہا ہے جہاں سے کٹھاری بازار اور جوہری بازار اور سعد الدولہ کی مسجد کا راستہ ہے۔ مسجد کے نزدیک کوچہ ٹٹاں ہے۔ جہاں عام لوگ رہتے ہیں۔ یہاں میر عسکری کا امام بازار اور چاندنی چوک بھی ہے۔ بارخ جنگم کا دروازہ کوچہ قافلہ مظاہر ہے۔ کٹھافل ہے۔ کوچہ برج تاج محل کو چنگھاسی رام اور چھٹا ہاں شاد خان ہے۔

اس کو پتے کے بعد گندھی گلی اور بازار حریہ پارچہ ہے جس میں بزازوں کی دکانیں اور محمد بخش عرف مہوکی حویلی واقع ہے۔ بازار کے بعد کٹھاسیدان گراں ہے اور کوچہ بخش خان ہے۔ بخش خان اور نگ زریب کے نکاحوں میں سے تھے۔ ان کی عمر تقریباً ایک سو پندرہ برس کی ہو گئی تھی لیکن اس عمر میں بھی ایک بھتی ہوئی سالم بھیڑ کھا جاتے تھے۔

اس گلی میں نواب سعادت خان کی جائیداد ہے۔ نواب مسعود جنگ کی حویلی ہے جس کے عقب میں یوسف خان کی مسجد ہے۔ اسی گلی میں نواب عباس گلی خان کی حویلی ہے۔ یہاں کٹھارون خان اور نور محمد سعادت خان واقع ہے۔ خیر کے کنارے مسجد نواب غازی الدین ہے۔ اس کے نزدیک کٹھار گاڑی ہاں اور لالہ ہرنارائن کا انگریزی ڈاک ٹکٹ ہے یا ہوا نیا مکان ہے۔

کٹھار سعادت خان، نواب احمد علی خان کا مکان، خان جہاں کی حویلی اور شہر پتہ کا کابلی دروازہ ہے۔ کوچہ بخش خان کے بعد کوچہ چٹپلاں ہے یعنی شاہجہان باغ کے چٹپلاں فتح محمد کا کوچہ اس کے اندر دایا کی حویلیاں، نواب شمس الدولہ کی حویلی اور شہر پتہ کا لاہوری دروازہ ہے۔ قلعہ مبارک کے لاہوری دروازے سے شہر پتہ کے لاہوری دروازے تک جنوب کی طرف بازار کی تفصیل: اردو بازار بارخ کلائی، شاہزادہ مرزا جہانگیر بہادر کا قافل خانہ اور کوچہ چٹاتی جنگم ہے۔ اس کا دوسرا راستہ درجہ نکال میں نکل جاتا ہے۔ اسی علاقے میں ڈاک گھر اور خونی دروازہ واقع ہیں۔ بازار درجہ نکال میں کٹھار شروع اور مہاجنوں کی حویلیاں اور کھلیاں ہیں۔ اس بازار میں دونوں طرف مراٹوں کی دکانیں، شرف الدولہ کی مسجد اور دروے کی عمارت ہے۔ اس کے سامنے حکیم میر علی صاحب کا مکان اور بخش حلوانی کی مشہور دکان ہے۔ اس کے سامنے ایک گلی ہے جو درویش خرواروشن پورہ چھٹا شاہ جی کو چٹپلاں ماراں اور کوچہ جوگی داڑان کی طرف نکل جاتی ہے۔ بخش حلوانی کی دکان سے ایک راستہ پر درویش کی پولیس چوکی حویلی گریسٹھ کو چٹا درویش اور جانت مسجد کی جانب رہت کا قلعہ واقع ہے۔ خونی دروازے پر بسا بیوں کی دکانیں ہیں۔ کوتوالی کا چھوڑا ہے جہاں قیدی بند کیے جاتے ہیں۔ چھوڑے کے سامنے ایک مضبوط کٹھار نصب ہے جو لال خان کے کٹھار کے نام سے معروف ہے۔ اس کٹھار سے بحر میں کو پاندھ کر مارتے پینتے ہیں۔ قدیم زمانے سے اس جگہ ایک چرنی اس نقشے کے مطابق قائم تھی جہاں خونی کوتھل کیا جاتا تھا۔ کوتوالی کے چھوڑے سے ملحق نواب روشن الدولہ کا مدرسہ واقع ہے۔ اس علاقے میں رعایا کی حویلیاں راہدراکشن وکیل کے مکانات جوتے



دہلی کا مشہور کشمیری دروازہ



پرائی دہلی کے ایک بازار کا منظر، عقب میں جامع مسجد جس کا گنبد دکھائی دے رہا ہے۔

والوں کی دکانیں مرزا اشرف بیگ کا گھڑیال ان کا پیش محل واقع ہیں۔ در یہ خرو کے کوپے میں طوائفوں کا محل و غیرہ صرافوں بزازوں اور جوہریوں کے مکانات ہیں۔ یہاں گنجی اور لی جان نای طوائفیں رہتی ہیں۔ حکیم رکن الدین خان کی حویلی اور کوچہ مالی واڑہ کا دروازہ ہے۔ اس میں حکیم اجیت سنگھ اور پستان منوئل صاحب وغیرہ کی حویلی ہے۔

در یہ خرو کے دروازے سے علاقہ بندوں بادلا اور ستارہ خرووں کی دکانیں رکن الدین خان کی حویلی کا دروازہ لالہ سوداگر محل کی کوٹھی لطف علی خان کے لڑکے بھٹ علی اور امیر اکیم علی خان کی حویلی بزازوں کا کنوڑا کنوڑا شرعی کنوڑا اندوہ کوچہ خان چند واقع ہیں۔ اس کے بعد چاندنی چوک جہاں آراء حکیم کا حمام اور باغ ہیں۔ اس چوک میں زرین سائوں اور دیگر محل حق کی دکانیں ہیں۔ اس کے بعد کوچہ رائے بان اور منصور کے بھائی غلام مرتضیٰ خان کی حویلی ہے۔ اس کے علاوہ میر عظیم اللہ اور میر خرد کی حویلیاں گرجل سنگھ صاحب کی حویلی کاراستہ اور پسناریوں عطا دہوں کی دکانیں ہیں۔

بچے بندوں کا کوچہ ہے جہاں بچے بندوں اور برہنہ والوں کی دکانیں اور رعایا کے مکانات ہیں۔ عتایت اللہ خان نواب بھٹ علی خان اور میر عظیم اللہ خان عرف میر خدائی کے مکانات نواب حسام الدین حیدر خان کی رہائش اور حکیم میاں جان کی حویلیاں ہیں۔ ایک کوچہ نواب فیضان بیگ خان کی حویلیوں اور حکیم میر شریف خان مرحوم کی حویلی اور مسجد کی طرف جاتا ہے۔

سنگھ صاحب بہادر کی بھوائی ہوئی نواب احمد بخش خان کی حویلی ہے۔ سامنے کوچہ چوکی واڑہ ہے۔ نام لگی بیگ خان کی حویلیاں اور شاہی کبلی خانے کے دامود مرزا اقتدر بیگ کا مکان اور شیر افکن خان کی حویلی ہے۔ ایک گلی مالی واڑے کی طرف جاتی ہے۔

اس کے بعد بخش بھوائی فخر کی حویلی چرے والوں کی دکانیں منشی بیگ چند کا مکان کوچہ پتیل مہادیو صوفی اللہ یار خان راہا ہے سنگھ رائے وغیرہ کی حویلیاں حکیم بھٹ کے لڑکوں کا مکان ہے۔ چرے والوں کی دکانوں سے متصل چنگن طوائف کی حویلی ہے۔ یہاں سے ایک راستہ روشن پورہ کی طرف جاتا ہے۔ اس سمت میں لالہ موہن لال کی حویلی لالہ رتن سنگھ رائے کا چھتال لالہ سنگھ چند کی کوٹھی بخشی رام گڑوالے کے مکانات محلہ مسجد گجورہ لالہ سنگھ چند کا پایا ہوا کوچہ اور ڈیرہ ہیں۔ یہاں سے ایک راستہ کوچہ انار اور رعایا کی حویلیوں کا لالہ فقیر چند کی کوٹھی اور لالہ سنگھ لال وغیرہ کے مکانات کی طرف جاتا ہے۔

کوچہ بکلی ماران سے:

چاندنی چوک کی پولیس چوکی ریویڑی والوں کا کنوڑا نواب حیدر علی خان کی حویلی ہے۔ یہ گاڑی بانوں کی ریاست ہے۔ یہاں شاہجہان کی خواہ مسافہ فتح پوری بیگم کی بھوائی ہوئی مسجد اور کنوڑا اور دکانیں ہیں۔ مسجد کے جنوب میں بازار ہے جہاں کنوڑا غلام محمد خان کنوڑا گوندی وغیرہ اور حافظہ الہی بخش بسا

کی دکانیں ہیں۔ یہاں سپرہ گروں کی دکانیں کوچہ کھاری پاؤلی تٹا شے والوں کی دکانیں پنہساریوں کی دکانیں اور جھانگین عطار کی دکانیں واقع ہیں۔

کوچہ نیا پانس کا موری دروازے کی پولیس چوکی اور قحانے کی عمارت ہے جو لاہوری دروازے سے متصل ہے۔

قلعہ مبارک کے لاہوری دروازے سے مسجد فتح پوری تک:

بازار کے درمیان فیض نھر جاری ہے۔ گم بودہ گھاٹ کا چھتا ہے۔ اس کے اندر کسانوں کے مکان اور خا کر دوار ہیں۔ یہاں ملاحوں کی ریاست ہے۔ پولیس چوکی ہے دریائے جٹا کے گھاٹ پنہساریاں اور ہندوؤں کی عبادت گاہیں واقع ہیں۔ گم بودہ گھاٹ کا دروازہ ہے۔ شہر چٹاوی فیصل پانس والوں کے مکانات انگریز صاحبوں کا قبرستان شہزادہ دارا شکوہ کی حویلی نزدیک رکھی ہوئی ایک توپ ہے۔ سارجن کا بھگ اور بارک ہے۔ میگزین ہے۔ گولہ اندازوں کی چھاؤنی کے اٹلے ہاتھ سواروں کی خاص لین ہے۔ مرحوم صفدر جنگ کی حویلی عقب میں کاغذیوں کے مکانات شاہ آبادانی صاحب کا حزار بیگم سرو کے باغ کا دروازہ ان کے سواروں کی چھاؤنی کا احاطہ اور گھسیاروں کی آبادی ہے۔ صفدر جنگ کی حویلی کے عقب میں حمام ہے اور فیض نھر ہے۔ باغ کے پیچھے قلعہ کی طرف اختر لونی صاحب کا مکان کفن صاحب کی کوٹھی ریڈیٹ کی کوٹھی شہر چٹاہ کا دروازہ اور دریا کا کنارہ ہے۔ نواب عبداللہ خان کی حویلی اور مسجد ہے۔

یہاں کھڑا بادل پورہ ڈھڑی صاحب کی کوٹھی انگریزی ڈاک خانے کی عمارت ڈھڑی صاحب کی پٹن کی چھاؤنی نصیر گنج کی سمت راستہ صاحب محل کی حویلی کا راستہ دارا شکوہ کا طویل عام لوگوں کے مکانات زینت باڑی اور ایک ہاتھیچ ہے جس میں شہزادوں کی قبریں اور زینت النساء بیگم کا حزار ہے۔ اس کے نزدیک کھڑا میدہ ہے جو پنجابی کھڑے کے نام سے مشہور ہے۔ اعتقاد خان کی پولیس چوکی ہے۔ سید فیروز کا بھگ حضرت شاہ مردان کا بیچہ اور معروف گلی تکنی ہے اور موری دروازے کی جانب راستہ ہے۔ اعتقاد خان کی چوکی سے ملکہ دھنی داڑا اٹھیل والا کنواں لین خاص میں اسماعیل بیگ نسل العاد کا مکان اور کاٹل دروازے کی طرف ایک کوچہ ہیں۔ اس علاقے میں اسماعیل خان کی حویلی سید رضی خان کا مکان عام لوگوں کے مکانات اور کابلی دروازہ ہیں جہاں سے فیض نھر شہر میں داخل ہوتی ہے۔

ریڈیٹ صاحب بھادوی کوٹھی کے عقب سے ایک راستہ شہیری دروازے کی طرف نکل جاتا ہے۔ اس بازار کے درمیان میں شہیری دروازے کی پولیس چوکی ہے۔ کرل جیس سکڑ صاحب کی کوٹھی اور مسجد بنام خیر المساجد ہے۔ مسجد کے اوپر (نصیر گنج) تنگلوں کی پٹن کی چھاؤنی اور شہیری دروازے کا راستہ ہے۔

اس تمام تفصیل کو چھ کر قاری کو یوریت اور یکسانیت تو ضرور محسوس ہوگی لیکن اس کی اہمیت بہر حال ہے کہ اس میں دلی کی اس مہم کی تقریباً تمام Who's Who موجود ہے۔ مزید برآں علامات، مساجد، کوچہ بازار، صنعت، حرفت، مراکز تجارت اور انتظامی مراکز کا ایک اجمالی جائزہ بھی ہے۔

حوالہ جات

- 18۲1 خطوط عالم مرچہ نظام رسول مہر۔ شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور 1993ء
- 19- چراغ دلی از مرزا حیرت دہلوی اکبر دکن پریس دہلی۔
- 20- Historic Delhi. By H. K. KAUL Oxford Press, India
- 21-22 قسان عالم از مالک رام۔
- 23-24 Historic Delhi. H. K. Kaul, Oxford Press India
- 25- میر المنازل مرزا انگلیمن بیک ترجمہ از اکبر شریف حسین قاسمی۔ اردو اکادمی دہلی۔

قلعہ معلیٰ

”کاش آپ یہاں ہوتے میرا حال دیکھتے تو جانتے ہر روز صبح کو قلعہ جانا دوپہر کو آنا بعد کھانے کے حضرت کے مسودوں کو درست کرتا۔“ (غالب بنام قدردنگرامی ۱۸۵۷ء)

”صبح کو قلعہ جاتا ہوں۔ دوپہر کو آتا ہوں۔ کھانا کھا کر پانچ چار گھنٹی دم لے کر جاتا ہوں۔ چراغ بجے آتا ہوں۔“ (بنام بی بی نعلیٰ حقیرؒ)

شاہجہان بادشاہ نے ۵ ذوالحجہ ۱۰۳۸ ہجری مطابق ۱۶۳۹ء کو قلعے کی عمارت کا سنگ بنیاد رکھا۔ قلعہ و محلات کی تعمیر میں ۹ سال اور تین ماہ لگے۔ شاہجہان اور تک زیب کے ادوار میں اسے قلعہ مبارک یا قلعہ شاہجہان آباد کہا جاتا تھا۔ بہادر شاہ جانی کے عہد میں یہ قلعہ معلیٰ کہلا جانے لگا۔ آج اسے لال قلعہ کہا جاتا ہے۔ باقی نام صرف تاریخ کی کتابوں میں ہیں۔ یہ نام آج بھی خلقِ خدا کی زبانوں پر ہے کیونکہ خلق اسے ہمیشہ لال قلعہ ہی کہتی آئی ہے۔

قلعہ کی عمارت ہشت پہلو ہے۔ اس کے مشرقی اور مغربی اضلاع باقی اضلاع کی نسبت طویل ہیں۔ قلعے کی لمبائی ایک ہزار شاہ جہانی گز چھوٹی تین سو گز و پانچ ادوں کی اونچائی پچیس گز و تین کے نیچے اس کی بنیادوں کی لمبائی اور چھوٹی چند گز اور تین کے نوے کا عرض دس گز ہے۔ قلعے کا محیط تین ہزار تین سو گز ہے اور قہر چھ لاکھ گز^۱۔

سیر المتال کے مطابق قلعے کی تعمیر ۵۹ لاکھ پانچ ہزار روپے کے اخراجات ہوئے۔ دیگر روائتوں میں ایک کروڑ۔ قلعے کے چار دروازے اور دو کھڑکیاں اور ایکس برج ہیں۔ ان میں سات مدور اور چودہ مشن ہیں۔ قلعے کے اندر مختلف عمارات برج چھٹی سے اس ترتیب کے ساتھ تعمیر کی گئی تھیں بارغ حیات بخش بادشاہ کی آرام گاہ برج طلا امتیاد محل جہاں آرام بیگم کی خواب گاہ خدام کی رہائش گاہیں ۲۳ رابع الاول ۱۰۵۸ ہجری (۱۶۴۸ء) کو شاہجہان دریا کے کنارے والے دروازے سے جو شاہ محل میں کھتا ہے قلعے اور دولت خانہ خاص میں داخل ہوئے۔ شہزادہ دارا شکوہ محلِ بھائی کے سر مبارک پر سے سونا چاندی چھادر کرتے رہے اور کہا جاتا ہے

کہ اس کا اسم و ذر بچھا دیا گیا کہ فقرا کا مال ہو گئے۔ مہتمم عمارت سکرمت خان کو بیچ ہزاری مصعب عطا کیا گیا^۹۔ لاہور و دہلی سے قلعہ معلیٰ کے اندر داخل ہوں تو سب سے پہلے نگر خانے کی عمارت آتی ہے جہاں دن میں پانچ بار نوبت بجائی جاتی تھی۔ ہفتہ اور اتوار کو دن بھر نوبت بجتی تھی۔ نوبت خانے کے دروازہ میں کوئی شخص سوائے شہزادوں کے سوار ہو کر نہیں جاسکتا تھا۔

سب دروازہ و امراء سواری سے اتر کر پیدل دیوان عام تک جاتے تھے^{۱۰}۔ ایک بار دہلی کے ریڈیفٹ فرانسس ہائیکس گھوڑے پر سوار اندر چلے گئے اور اس جرم میں درخواست کر دیے گئے^{۱۱}۔

نگر خانے کے بعد دیوان عام کی عمارت ہے جہاں شاہ جہان سے لے کر شاہ عالم جاتی تھیں بادشاہوں کے دربار منصفہ ہوتے رہے۔ دیوان عام کی عمارت سنگ مرمر سے بنی ہوئی ہے۔ اس کے گھن کے لیے ۷۰ گز لمبا ۳۵ گز چوڑا اور ۲۵ گز بلند ایک شامیانہ دل ہا دل ایک لاکھ روپے کی لاگت سے تیار کیا گیا تھا۔ شامیانہ کی چوبیس اور کنہرے چاندی کے تھے۔ اس کے نیچے دو ہزار اطراف کے بیٹھنے کی گنجائش تھی۔ دربار کے وقت تخت کے چاروں طرف سونے کا کنہر انصب کیا جاتا اور تخت شاہی پر جواہرات سے مرصع سونے کی چوبیس اور موتیوں کی چھاروں کی بھانروں سے مزین ایک اور شامیانہ تانا جاتا تھا۔ دربار کے دوران بادشاہ سلامت کے سامنے گھوڑوں اور ہاتھیوں کی پر پٹ ہوئی۔ چانور اور پندے گھڑا سے جاتے یا پیش کیے جاتے۔ ایک یا دو امراء کی فوج بھی بادشاہ کے سامنے پیش کی جاتی۔ پھر رعایا کی عرضیاں پیش کی جاتیں جن پر بادشاہ احکامات جاری کرتے^{۱۲}۔

دیوان عام سے ملا ہوا ایک جالی دار دروازہ تھا جس کے اندر دیوان خاص کا جلو خانہ تھا۔ اس جلو خانے میں انجمن دیوان خاص تھی جس کی چھت چاندی کی تھی۔ اس کے اندر لال پر وے کا دروازہ تھا۔ یہاں بادشاہ کے امراء و ملازمین غل مہمانی کے حضور قدم بوسی کے لیے پار پاب ہوتے۔ اس کے اندر محل معلیٰ حضور والا کے بیٹھنے کا برج مشمن موتی مسدہ حمام کا چھوڑا اور چاند کن تھا۔ اندر موتی محل پھر شاہ برج نشانی اور جنوبی ولان سلوان بھادوں کے نام سے مشہور حیات بخش بارغ تھا۔ موتی محل کے سامنے اور وسط میں سنگ مرمر کے بنے ہوئے حوض تھے جو ایک ہی حجر کے بنے ہوئے تھے۔ ان میں کوئی جڑ نہیں تھا۔ موتی محل کے دونوں طرف نہر بجتی تھی^{۱۳}۔

بارغ کا ایک حصہ جو مہتاب بارغ کہلاتا تھا اس میں ایک عمارت تھی جس میں خطیب اسلام کے حركات رکھے گئے تھے۔ یہیں عدالت خانے کی عمارت بھی تھی^{۱۴}۔

دیوان عام کے شمال میں ایک دروازہ تھا جس کے باہر بادشاہ کا اصطبل اور خاصہ کلاں وغرہ تھا۔ مہتاب بارغ کے عقب میں بادشاہ سلامت کی رہائش اور شاہی توپ خانے کی عمارت تھی۔

دیوان خاص کا طول ۹۰ گز سے ۱۰۰ گز اور عرض ۶۰ گز تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی عمارت

شاہجہانی عمارات میں سب سے زیادہ خوبصورت اور آراستہ تھی۔ دوح اردوں اور ستونوں کے لمبے حصوں پر قیمتی پتھروں سے چٹکی کاری کا کام کیا گیا تھا اور وہی حصوں پر سنہری نقاشی تھی۔ اس کی چھت چاندی کی تھی اور اس کے پھولوں پر سونے کا کام تھا۔ ۱۶۷۰ء میں جاٹوں اور مرہٹوں نے اس چھت کو اکھاڑ کر پھیلایا تو انھیں لاکھ روپے کی چاندی حاصل ہوئی¹¹۔

بکھی یہاں تخت طاؤس رکھا جاتا تھا جو کروڑ روپے کے خرچ سے تیار ہوا تھا۔ اس پر جواہرات سے مرصع دو مورچے تھے جن کے درمیان پیرے موتیوں لعل و زمرد سے جڑا ہوا ایک درخت تھا۔ تخت کی چھت کے اندر کی جانب بیٹا کاری کی گئی تھی اور یہ لعل و یاقوت سے جڑے ہوئے بارہ ستونوں پر قائم تھا۔ بیٹے چاندی کے تھے۔ یہ تخت ۱۶۳۹ء میں نادر شاہ نے کیا۔ تخت طاؤس اور گوہ نور سمیت نادر شاہ کوئی ستر کروڑ روپے کے غنائم دلی سے ایران لے گیا۔ اسی دوح ان خاص میں بیٹھ کر نادر شاہ نے محمد شاہ کو اس کی سلطنت واپس کی تھی۔ ۱۷۰۸ء میں غلام قادر درویش نے شاہ عالم کو بیٹائی سے محروم کیا تھا اور ۱۸۰۲ء میں نادر شاہ و نادر شاہ عالم نے قاجار لاؤ ایک کا استقبال کیا تھا¹²۔

جب غلام قادر درویش کے حکم سے شاہ عالم کی آنکھیں نکالی گئیں تو اس نے طوا کہا ”کیا دکھائی دے رہا ہے بادشاہ سلامت؟“ شاہ عالم نے فوراً جواب دیا ”قرآن جو میرے اور میرے درمیان ہے“¹³۔ زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ مرہٹوں نے روہیلوں پر فتح پائی اور غلام قادر کو بھڑے میں بند کر کے ساتھ لے گئے۔ ۱۷۵۷ء میں احمد شاہ درانی نے بھی دوح ان خاص کو لوٹا تھا۔ احمد شاہ کے لوٹ کے مال میں ایک مغل شہزادی بھی شامل تھی¹⁴۔

تھو مٹھی کے احمد علی شاعر عمارات ۱۸۵۷ء کی ناکام بغاوت کے بعد انگریزوں نے مسمار کر دیں اور وہاں چابیوں کی پور پیکس تعمیر کر لیں۔

دوح ان خاص کے ساتھ ہی شاعی حمام تھے حمام کے اندر تین درجے تھے۔ پہلے درجے کو جامہ کن یعنی لباس اتارنے کی جگہ کہا جاتا تھا۔ یہاں سنگ مرمر کے دو حوض تھے۔ ایک میں گلاب کا فوارہ چلتا تھا اور دوسرے میں اعلیٰ قسم کی خوشبوئیں بھینکی تھیں۔

دوسرے درجے کے درمیان میں ایک حوض تھا اسے حسب ضرورت سرد یا گرم حمام کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ یہاں سنگ مرمر کی ایک نہایت نفیس اور خوبصورت جاہ نما ڈرگھی جس پر غسل کے بعد بادشاہ نما ز ادا کرتے تھے۔

تیسرا درجہ گرم خانہ تھا اس کے مطرب میں آگ بھٹی تھی۔ مشہور ہے کہ یہ سوا سو من گھڑی سے گرم ہوتا تھا۔ اس میں سو جو حوض کے چاروں کونوں پر طلائی فوارے لگے تھے جن میں سے پانی چھوٹی تھا اور پلج کا فوارہ چاندی کا تھا جس میں سے پانی اور عرق گلاب کا مخلول نکلتا تھا¹⁵۔

عہد شاہ جہانی میں حلقہ میں کوئی مسجد نہیں۔ وہ جامع مسجد جایا کرتے تھے۔ اور نگاہ سب نے ۱۶۶۲ء میں ایک لاکھ ساٹھ ہزار روپے کے مصروف سے قلعہ میں موتی مسجد بنوائی۔
پانچ حیات بخش کے خوب میں سادہ اور بھادوں نام کی دو عمارتیں تھیں۔

یہ عمارتیں سنگ مرمر سے بنی تھیں اور دونوں میں ایک حوض تھا جن میں ایک نہر داخل ہوتی تھی اور آبشار کی مانند گرتی تھی اور پھر حوض سے ایک آبشار نکل کر دو پارہ نہر کی شکل اختیار کر لیتی تھی۔ سادہ میں پانی کی آمد اور زور و شور سے بہاؤ سادہ کی پارش کا تاثر دیتا تھا جبکہ بھادوں میں اتنا زور و شور نہیں ہوتا تھا۔ نہر بہشت سے آئے ہوئے پانی کی چادر حوض میں چڑتی تھی۔ پانی نہایت سکون ہو جاتا اور پھر باہر نکل کر گر جاتا۔ گویا بھادوں کی پارش کا ساں ہوتا۔^{۱۶}

اگر کوئی حیات بخش باغ کی آبشاروں کے پاس کھڑے ہو کر شاہ ادب اٹھاتا تو ایک ہاتھی نظر آتی جس کے اختتام پر شاہ برج تھا۔ یہاں بادشاہ اپنے بڑے وزراء کے ساتھ انتہائی اہم جاہل مسعودت مشفق کیا کرتے تھے۔ اس میں سنگ مرمر کا ایک خوبصورت دالان ایک حوض اور آبشار تھیں۔ اس کی چھتری لمبا چست تھی جس میں قیمتی پتھر بڑے تھے۔

دوبیلوں نے پتھر نکال لیے اور اسے توڑ پھوڑ دیا۔ پھر ۱۸۵۷ء میں برطانوی فوج نے اس میں تبدیلیاں کیں۔ یہاں ایک چھوٹا برج اکبر شاہ جانی نے بھی تعمیر کیا۔ اکبر شاہ اور بہادر شاہ ظفر اکثر یہاں بیٹھا کرتے تھے۔ ۱۷۸۷ء میں شاہ عالم جانی کے فرزند اور ولی عہد شہزادہ جہاندار بہشت اسی برج سے ایک رسی کے ذریعے اتر کر فرار ہو گئے اور دہلی سے دکن چلے گئے^{۱۷}

قلعہ صفی کے آخری کین انگریزوں کے ٹاشن خواہ بادشاہ اور بادشاہ ظفر تھے انہیں بتایا گیا تھا کہ ان کی وفات کے بعد ان کی اولاد کو قلعہ خالی کرنا پڑے گا لیکن یہ نوبت نہ آئی۔ خد کی ناکامی کے بعد بادشاہ انگریزوں کے قیدی بن گئے اور جلا وطن کر کے رنگون بھیج دیئے گئے۔

بہادر شاہ ظفر کے ایک دربار کا ذکر بزم آخر کے مصنف مفتی فیض الدین کی زبانی:

”دیکھو سب امراء قلعہ خانے کے دروازے پر سے اتر کر پیدل دیوانہ عام میں چلے آتے ہیں۔ یہ پہلی آداب کا ہے۔ دیوانہ عام میں جاہلی کے دروازے میں دیکھنا کہیں موتی سی لوہے کی زنجیر لڑی پڑی ہوئی ہے کتا دی سیدھا نہیں جاسکتا۔ سب جھک جھک کر زنجیر کے نیچے سے جاتے ہیں۔ یہ دوسری آداب کا ہے۔ اسے لوہا دیوانہ خاص کے دروازے پر کیا بڑا سا پردہ لال بنات کا کھینچا ہوا ہے۔ یہ لال پردہ کھلاتا ہے۔ مرد مچے پیادے دربان سپاہی قمار ہاتھوں میں لال لال لکڑیاں لیے کھڑے ہیں جو کوئی خیر آ دی اندر جانے کا ارادہ کرے تو قلعہ دی لال لکڑی آ کھڑے دار گردن میں ڈال کھینچ کر باہر نکال دیتے ہیں مگر جشن کے دن ختم عام تھا کہ جس کا پی چاہے بگڑی باندھ کر چلا آئے۔ دربار کی سیر دیکھے۔ دیکھو لال پردے کے پاس کھڑے ہو کر

پہلے بھرا کرے کہ یہ تیسری آداب گاہ ہے۔ مہر و معائنہ خاص میں تخت کے سامنے آداب بجا کر اپنی اپنی جگہ پر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ دیکھو معائنہ خاص میں فرض و فروش کیا ہوا ہے باقی پردے کھینچے ہوئے ہیں۔ بیچوں بیچ میں تنگ سرمر کے بہشت پہلو چترے پر تخت ملاؤں لگا ہوا ہے۔ اس کے آگے کے دلداہیں کیر کھینچا ہوا ہے۔

دیکھنا کیا طبع صورت تخت بنا ہوا ہے۔ چاروں طرف تین تین در کیے خوشنما عہدوں کے ہیں۔ گرد کشہرا پست پر بکھیرے آگے تین سبز عیالوں پر بچکے نما کھل چھت عراب دار اس پر سونے کی کھیاں اساتے عراب پر دو مور آسنے سامنے سو تین کی تین عیال منہ میں لیے ہوئے کھڑے ہیں۔ سر سے پاؤں تک سونے میں لپکا ہوا جھنگار ہا ہے۔ بیچ میں روی گھل اور زرہفت کا مسند بکھیر لگا ہوا ہے۔ دو خواص ہما کے مور بچھل لیے اہل پہلو میں کھڑے ہیں۔ پیچھے ایک ہا ہما زنجبلی ہے۔ معتبر الدولہ، الشہار الملک، بہادر وزیر، محمد اللہ شاہ حاکم دارا اس احترام الدولہ، بہادر رئیس الدولہ، بہادر مہمین الدولہ، بہادر سیف الدولہ، بہادر رئیس الدولہ، بہادر مرزا بہادر راجہ بہادر غیاث الدولہ، بہادر سبحان زمان، نجم الدولہ، بہادر (غالب) و قار الدولہ، بہادر مصطفیٰ الدولہ، بہادر علاء الدولہ، بہادر موسیٰ الدولہ، بہادر سرفراز الدولہ، بہادر میر عدل بہادر میر فتحی دارالانشاء، سلطان میر قوچک وغیرہ اپنے اپنے سرچے اور قاعدے سے دونوں ہاتھ جریب پر رکھے دائیں بائیں کھڑے ہیں۔ مردھے قیوب چہ بدار فرض جتنکی سامنے آداب گاہ کے پاس کھڑے ہیں۔

دیوان خاص کے محفل میں ایک طرف خاص گھوڑے چاندی سونے کے سار لگے ہوئے ایک طرف باقی سولہ بخش غور شید گج چاند صورت وغیرہ رنگے ہوئے ماتھے پر فواد کی ڈھالیں سونے کے پھولوں کی کالوں میں رنم اور کھانوں کے کچے اور گڑیاں کار چلی جھولیں چڑی ہوئی ایک طرف ہا سراب چتر نشان روشن چوکی والے جھنڈیوں والے ڈھیت جھکے کھڑے ہیں۔ جھنڈی ملار چاندی کے شیر دہاں سونے۔ خاص بردار بندو قیس لیے ہوئے کھڑے کے نیچے کھڑے ہیں۔ دیوان عام کے میدان میں ساری بلٹیں جلی کھڑی ہیں۔ احتشام توپ خانے کی توپیں لگی ہوئی ہیں۔ اے لہو وہ جھولتی نے اندر سے آواز دی خبردار ہو قیوب چہ بداروں نے جواب دیا اللہ رسول خبردار ہے۔ اوہو وہ بادشاہ برآمد ہوئے۔ قیوب چہ بدار بھارے، ہم اللہ الرحمن الرحیم۔ اللہ رسول کی لہان دوست شاد و خوشن پامال جلائیں رو کھاروں نے جھٹ ہو اور کھاروں سے لے لیا۔ پہلے بادشاہ نے تخت کے پیچھے لڑکھار کی دور کھتیں کھڑے ہو کر چڑھیں۔ دعا مانگی۔ پھر ہوادار میں سوار ہوئے۔ کھاروں نے ہوادار تخت ملاؤں کے برابر لگا دیا۔ بادشاہ نے تخت پر جلوس فرمایا۔ جھنڈیاں بلٹیں۔ دھنا و من توپیں چلنے لگیں۔ سب فوج نے سلاوی اتاری۔ شادیاں بجنے لگے۔ گوہر اکلیل سلطنت صحن پر عکافت دلی مہد بہادر بائیں طرف تخت کے اور شاہزادگان نامدار و الامار قرۃ باسرۃ خلافت غرہ باسرۃ سلطنت دائیں طرف تخت کے برابر امیر اسراء کے آگے کھڑے ہو گئے۔

دیکھو پہلے دلی مہند زو دینے کھڑے ہوئے۔ وہ آداب گاہ پر آئے بھرا کیا قیوب بھارا جہاں پناہ



چاندنی چوک



جامع مسجد

بادشاہ سلامت، عالم پناہ بادشاہ سلامت مہابلی بادشاہ سلامت! مجرا کر کے بادشاہ کو جا کر تھڑی۔ بادشاہ نے نذرے کر تھڑی رکھ دی۔ مجرا لے پاؤں آداب گاہ پر آئے۔ مجرا کر خلعت پہنا جیدہ سر پہنچ گوشوارہ بادشاہ نے اپنے ہاتھ سے سر پر باندھا۔ سوئی مالا سپر تلوار گلے میں ڈالی۔ اسی طرح آداب گاہ پر لے پاؤں آ کر مجرا کیا۔ خلعت کی تھڑی پہرا لے ہی پاؤں آداب گاہ پر آ مجرا کر کھڑے ہو گئے۔

دیکھو اب اسی طرح اور شہزادے اور سارے امیر امراء اپنے اپنے رتے سے تھڑی دے رہے ہیں۔ جواہر خانے میں سے خلعت لیکن لیکن کرتے ہیں۔ بادشاہ اپنے ہاتھ سے شہزادوں کے سر پہ جیدہ سر پہنچ گوشوارہ اور معزز امیروں کے سر پہ گوشوارہ باندھ دیتے ہیں۔ آداب مجرے ہو رہے ہیں۔ قیاب چوہدر پکار رہے ہیں۔ ملاحظہ آداب سے کرو مجرا جہاں پناہ بادشاہ سلامت، عالم پناہ بادشاہ سلامت مہابلی بادشاہ سلامت۔ لو بادشاہ نے تکیہ سر کا یا قاتھ کو ہاتھ اٹھا دیا۔ عرض لیگی پکارا دربار برخواست کہا روں نے ہوا دار تخت کے برابر لگا دیا۔ بادشاہ سوار ہوئے۔ خاص ڈیوڑھی پر سے کہا روں نے ہوا دار لے لیا۔ بادشاہ محل میں داخل ہوئے۔ سب لوگ رخصت ہوئے۔ چالیس دن تک روز دربار اور خلعت اور تھڑی ہوں گی اور انعام و اکرام سب کارخانوں کے دروہ قاذوں اور آدمیوں کو حیثیت کے موافق ملیں گے۔¹⁸

حوالہ جات

- 1-2- خطوط قالب مرتبہ قلام رسول میر۔
- 3- تفریح دہلی۔ نواب قزلباش و شہید دارشاہی فیض آباد یو پی 1936ء۔
- 4- سیر المتازل از مرزا انگلیمن بیگ۔ اردو کلاسی دہلی۔
- 5- تفریح دہلی۔ سیر المتازل۔

Delhi, Its Monuments and History. By T.G.P. SPEAR, Oxford: 6

India.

- 7- تفریح دہلی نواب قزلباش۔
- 8- تفریح دہلی۔ Delhi Its Monuments and History۔
- 9- تفریح دہلی / نواب قزلباش۔ سیر المتازل۔
- 10- تفریح دہلی۔

11- ایضاً۔

Delhi, its Monuments and History. By T.G.P. Spears -12

Twilight of Mughals. By Percival Spears. -13

14- تفریح دہلی۔

15- ایضاً

16- ایضاً۔

Delhi, its Monuments and History -17

18- بزم آفرادہ منشی فیض الدین اردو اکادمی دہلی۔

دہلی کے بازار..... جامع مسجد ذکر چاندنی چوک کا

”دلی کی سستی مضمحل کی ہنگاموں پہ تھی۔ قلعہ چاندنی چوک ہر روز مجمع جامع مسجد کا ہر پختے سیر جانا کے پل کی ہر سال میلہ پھول والوں کا یہ پانچوں ہاتھ اب نہیں پھر کہو دلی کہاں؟“

غالب، تمام بھر مہدی، مروج ۲ دسمبر ۱۸۵۹ء^۱

دلی جو کہتے ہیں سات ہار لہی اور سات ہار جزی۔ اس کا سب سے پہلا نام اندر پر سٹھ تھا۔ پر سٹھ منکرت میں دونوں ہاتھوں کے ملے ہوئے لمبوں کو کہتے ہیں۔ اساطیر میں ہے کہ یہاں اندر پر سٹھ لہی بھر بھر کر موتی دان کیا کرتے تھے چنانچہ شہر کا نام پڑ گیا اندر پر سٹھ... اندر پر سٹھ کی حدود چاندنی چوک میں درجہ کے سامنے واقع خونی دروازے سے لے کر پرانے قلعے تک تھیں۔ یعنی چاندنی چوک وہ جگہ تھی جہاں اندر جی موتی لٹایا کرتے تھے...^۲

”آٹا دار لکھنا ویہ“ میں ہے: ”قلعے کے لاہوری دروازے سے چار سو اسی گز پر ایک چوک ہے اسی گز کا مربع۔ اس چوک میں کوٹوالی چہترا ہے۔ اس چوک سے چار سو گز آگے ایک اور چوک ہشت۔ پہلی سو گز سے سو گز ہے۔ اس چوک کو چاندنی چوک کہتے ہیں۔ اس کے آگے ۶۰ گز لمبا دروازہ ہے۔ اس بازار کے سرے پر چٹا پوری مسجد ہے۔“^۳

ایک وسیع و عریض بازار تھا جس کے پھول چل لہر بیتی تھی۔ دور رو بہ کئے سایہ دار درخت تھے، برگز چٹیل، نیم، جامن، سوسری اور پھلوں کا بادشاہ آم۔ ان کے سامنے میں ٹریک رواں دواں رہتا تھا..... پانگیاں، فیس، ہوا دار زچھ، اکے گھوڑے اور ہاتھی..... شاہی سواری بھی تو یہاں سے گزرتی تھی۔ بہادر شاہ ظفر کی سواری کی گاڑی میں سولہ گھوڑے لگائے جاتے تھے جبکہ نواب ذہنت محل بیگم کی سواری میں آٹھ گھوڑے۔^۴

شاہی ہاتھی زرعت اور ہانات کے جھولوں سے مزین اور موتی جڑے سنہری ہونے گزر گاہ کے دائیں بائیں دکائیں دیکھی اور بدھ کی مال و اسباب سے بھری ہوئیں۔ ایمان عراق وسط ایشیا اور یورپ سے

دوا درہ سالانہ۔۔۔ غیر ملکی مال کی منڈی خصوصاً فیض بازار کو سمجھا جاتا تھا۔ یہاں بھی وہی چاندنی چوک والا فضا تھا۔ نہر بڑے بھرے درخت، دور یہ دکانیں اور بھر خاص بازار جہاں درخت اس کثرت سے تھے کہ یہ بازار سے ذرا دوا درہ لگتا تھا۔ جامع مسجد کے عقب میں نئے اور اناج کی منڈی اور دوا درہ بازار تھا۔ لہڈی نکاحیہ بلی گھنٹی تھی:

”جیسے دہلی کے بازاروں سے سواری میں بیٹھ کر گزرنے میں بڑا اظہار آتا تھا اس لیے کہ میرے لیے یہ چیز تھی اور غیر معمولی تھی۔ سنگ مرمر اور سنگ مرمر کی شاندار عمارتیں، مرصع دکانیں، کھڑکیوں سے ماہر بازار کی جانب لہراتے ہوئے خوش رنگ پر دے دیے، وہ بے لباس اور لوگوں کا جھوم۔“^۵

غالب کے بچوں کے بچوں اور بچوں کے ”ہر روز جمعہ جامع مسجد کا۔۔۔ اور یہ مجمع محض نمازیوں کا ہی نہیں ہوتا تھا۔۔۔ شاہ جہاں کی بنا کردہ جامع مسجد۔۔۔ ایک پہاڑی پر تعمیر کی گئی تھی۔۔۔ مسجد کے تین بڑے دروازے تھے اور ہر دروازے کے سامنے ایک بازار۔۔۔ بازار تک پہنچنے کے لیے بڑے بڑے دروازوں کا ایک سلسلہ۔۔۔ دن ڈھلتے ہی ان میزبانیوں پر چہل چل کا آغاز ہو جاتا۔۔۔ منوہی دروازہ جنگی قبر کے بازار کی جانب کھلتا تھا یہاں پتھریں، میزبانی تھیں۔۔۔ ان میزبانیوں پر بسا بیوں نے بسا بیوں بچائی ہوئیں، قالوہ پک رہا ہوتا، کبابی کباب کھاتے اور اصل مرمر اور رنگ پر دے فروخت ہوتے۔

شمالی دروازے کے سامنے ۳۵ میزبانی تھیں اور یہ پائے والوں کے بازار کی طرف کھلتا تھا۔ ان میزبانیوں پر دوا درہ اور قصبہ طوائف کا قبضہ تھا۔ ”ناستان، سپر حوزہ“، ”قصبہ حاتم خانی“ اور ”بوستان خیال“ کبھی جاری ہوتیں۔ کبھی عمارت اپنے کتب و کھارے ہوتے۔ مشرقی دروازہ خاص بازار کی سمت کھلتا اور اس کے سامنے ۳۵ میزبانی تھیں۔ یہ میزبانی گزری بازار کے لیے مشہور تھیں۔ ہر طرف دکانوں کی بہار رنگ برنگ کپڑوں کے تھانے تھے ہونے لگی میزبانی پر کوئی خوش گھوٹتیر کار رہا ہے تو کہیں کوئی دھندلہ دھندلہ کہہ رہا ہے۔ کہیں کوئی مٹائی دوا کیں لٹ رہا ہے۔“^۶

لال قلعہ کی تعمیر کے دو سال بعد دوا درہ کے مصروف سے یہ مسجد تعمیر ہوئی۔ پانچ ہزار معادروں اور مزدوروں نے چھ برس میں اسے مکمل کیا۔ اسے سنگ مرمر سے تعمیر کیا گیا۔ تین بڑے دروازے دو بلند پالا جینا، چار کونوں کی چار شاندار میزبانی تھیں بڑے بڑے برج، مرکزی بڑے دروازے کی بلند عمارت بل کراسے بے حد خوشنما بنا دیتے ہیں۔ بڑے دروازے کے آگے چار سو مربع فٹ کا گھن ہے جس کا فرش سنگ مرمر کا ہے اس کے بیچ میں سنگ مرمر کا چندہ ضربہ بار گز کا حوض ہے۔ سنگ مرمر کا شاندار نہر ہے۔ جیناروں کی بلندی ایک سو تین فٹ ہے۔

تندرنگ مسجد کے اندر ایک دارالشفاء اور ایک مدرسہ نظام دارالبقاء بھی تھا اور اس میں ملحق صدر الدین آذر و دوا درہ دیا کرتے تھے۔^۷

دہلی پر بلائیں نازل کرنا شروع کیں۔ پہلے ہاشموں یا سجادہ حق کی صورت میں اور پھر انگریزوں کی شکل میں۔ اس کے بعد دہلی کا نقشہ غالب کے الفاظ میں....

”لو سنو اب قہاری دہلی کی باتیں چوک میں جگمگے بارغ کے دروازے کے سامنے جو کنواں تھا اس میں سنگ و خشت و خاشاک ڈال کر بند کر دیا۔ کچی ماروں کے دروازے کے پاس کچی دکانیں ڈھاکر راستہ چڑا کر لیا۔“ (جام سید سرفراز حسین ۲۳ دسمبر ۱۸۵۹ء۔¹³)

”بڑے بڑے نامی بازار خاص اردو بازار اور خانم بازار کہ ہر ایک بجائے خود ایک قصبہ تھا۔ اب چھو بھی نہیں کہ کہاں تھے۔“ (جام عبدالغفور سردر ستمبر ۱۸۶۰ء۔¹⁴)

”قاری کا کنواں بند ہو گیا۔ لال ڈوکی کے کنوئیں ایک قلم کھاری ہو گئے۔ پرسوں میں سوار ہو کر کنوؤں کا حال دریافت کرنے گیا تھا جامع مسجد ہوتا ہوا راج گھاٹ کے دروازے کو چلا۔ جامع مسجد سے راج گھاٹ تک جلاہذا ایک لٹ و دق سحر ہے۔ یاد کرو مرزا گوہر کے ہاشمپے کے اس جانب کو کچی کوس شیشہ تھا۔ اب وہ ہاشمپے کے گچھن کے برابر ہو گیا۔“¹⁵

کشمیری دروازے کا حال تم دیکھو گے۔ اب آہنی سڑک کے واسطے ٹکڑے دروازے سے کالی دروازے تک میدان ہو گیا۔ پنجابی کنڑا دھونی داڑا رام جی گچھ مسعدات خان کا کنڑا جرنیل کی بیوی کی حویلی رام جی گو دام والے کے مکانات صاحب رام کا باغ حویلی ان میں سے کسی کا پتہ نہیں ملتا۔ قصہ مختصر شہر سحر ہو گیا تھا۔ اب جو کنوئیں جاتے رہے اور پانی نالیاب ہو گیا تو یہ سحرانے کر چلا ہو جائے گا۔ اردو بازار نہ رہا اردو کہاں؟ دہلی واطلاب شہر نہیں کہے۔ (جام میر جہدی ۱۸۶۰ء۔¹⁶)

جامع مسجد سکھ پلٹوں کے قبضے میں رہی پھر فوج تو نکل گئی لیکن مسلمانوں کا داخلہ اب بھی ممنوع رہا۔ آخر ۱۸۶۴ء کے آخر میں کہیں مسجد و گزاشت ہوئی۔ یکم دسمبر ۱۸۶۴ء کو غالب میر جہدی مجروح کے نام خط میں لکھتے ہیں:

”مسجد جامع و گزاشت ہو گئی۔ چٹائی قبر کی طرف میز صیوں پر کہا یوں نے

دکانیں بنالیں۔“¹⁷ اظہار مافی کہو تر پکھنے لگا۔ عشرہ مبشرہ دس آدمی غمیرے۔ مرزا عالمی بخش!

مولوی صدر الدین قنصل حسین خان تھیں یہ سات اور۔“

غالب کے زمانے کی دہلی کو کچی یورپین اور امریکن سیاحوں نے بھی دیکھا۔ آئیے دیکھیں وہ دہلی کے بارے میں کیا کہتے ہیں۔

”میں دہلی کی معروف جامع مسجد کی سیر کو گیا جو ۱۶۵۰ء میں مکمل ہوئی۔ اسے شاہجہان بادشاہ نے دس لاکھ روپے یعنی ایک لاکھ پانچ سو کے معرے سے تعمیر کرایا۔ ایسی عمارت اگر انگلستان میں تعمیر کی جاتی تو اس پر چار گنا زیادہ خرچ آتا۔ شاہجہان کی تعمیر کردہ دیگر عمارت کی طرح یہ مسجد بھی عمدہ طرز تعمیر اور اعلیٰ ذوق کا

مومن ہے۔ میرے ساتھ بادشاہ کا ایک ملازم اور تین ہندو تھے۔ میں عمارت میں اس قدر مہمک ہو گیا تھا کہ واپسی تک مجھے علم نہ ہوا کہ مسجد کے خادموں نے میرے ہندو ساتھیوں کو باہر روک دیا تھا۔ اگرچہ انہوں نے گزارش کی تھی کہ وہ جو جتے اجڑنے اور دیگر کام آداب کو ملحوظ خاطر رکھنے کے لیے تیار ہیں لیکن انہیں بتایا گیا کہ بہت پرستوں کو مسجد میں داخلے کی اجازت نہیں۔ ان کا آقا کیونکہ اہل کتاب میں سے ہے اور اس کے عقیدے میں کچھ سہانی موجود ہے اس لیے وہ مسجد میں داخلے کا اہل ہے۔ (اگرچہ بد قسمتی سے اس کا دل قرآن کے لیے نہیں کھولا گیا)۔“

Rambles and Recollections. W.H.Sleeman. (۱۸۳۳ء)

”چاندنی چوک میں ہر قسم کی اشیاء فروخت ہوتی ہیں۔ ہندوستان کشمیر، فارس اور تبت کی مصنوعات۔ یہاں پر عداوں اور جانوروں کی منڈی بھی ہے جہاں پر ہندو ایرانی ہلیاں مختلف سطحوں کے کتے یہاں تک کہ چیتے اور شکاری تھیلوں سے بھی فروخت ہوتے ہیں۔ گھیاں، طقم، تل، گاڑیاں، پانکیاں، گھوڑے اور ہاتھی بڑی تعداد میں آ جا رہے ہیں۔ وہ دیکھنے سے سارے آٹھ کھڑوں کی گلیں میں بادشاہ کے فرزند، شہزادہ، ہار برطانوی جنرل کی بوجھدارم میں بیٹوں کو در رہے ہیں۔ ایک اور شہزادے مرزا سالار علی شاہ محبوب شریک حیات کے ساتھ پردے والی گاڑی میں گزرے۔ شہزادی کے حسن کا دور دور تک چرچا ہے لیکن بے تاب ہجوم پردے کی وجہ سے ان کی جھلک تک نہیں دیکھ پا تا۔ یہاں بھکاریوں کا ہجوم ہے اور گردوغبار بھی خاصا ہے۔ حالانکہ رومہاں میں ہی دورویہ درختوں سے گھری ضرر بہہ رہی ہے اور بہت آسانی سے اس گردوغبار پر قابو پایا جاسکتا ہے۔“

Scenes and Characteristics of Hindustan. Emma (۱۸۳۷ء)

Roberts

”دلی عمارت کا ایک بڑا مرکز ہے۔ یہاں کی شاہیں ایک بڑا برآمدی آئینہ ہیں۔ دلی اور کشمیر کے مابین مسلسل تجارتی رابطہ رہا ہے۔ تمام مہذب دنیا میں مقبول شال کا ادنیٰ کپڑا کشمیر سے دلی آتا ہے جہاں اس کے حاشے بننے ہیں۔ سونے اور ریشم کے تلووں سے کشیدہ کاری ہوتی ہے چنانچہ انہیں دلی کی شاہیں کہا جاتا ہے۔ دلی کی سوزن کاری انڈیا میں سب سے عمدہ ہے اور طبقہ امراء کے مرد و زن میں بے حد مقبول ہے۔ مردوں کے کھٹان کے کنارے قفل کے ہوتے ہیں جن پر عمدہ کشیدہ کاری کی جاتی ہے۔“

یہاں کے صراف ہندوستان میں سب سے بہتر ہیں۔ اگرچہ چینی پھروں کی تراف خراش میں وہ بہت زیادہ مہارت نہیں رکھتے لیکن وہ بہت تجزی سے سمجھ رہے ہیں۔ چتر اور ہاتھی دانت پر کھدائی کر کے نقش و نگار بنانے کے ماہر بھی دلی میں موجود ہیں لیکن انہیں ابھی اپنے فن میں کمال حاصل کرنا ہے۔ انگریز خواتین کے ذوق کو دیکھ کر ہندوستانی کاریگری کی چیزیں بنا رہے ہیں۔ وہ ہاتھی دانت کے ٹکڑوں پر دلی کی

غلامی کا نوعاً ممنوع ہے لیکن یہ اب بھی ایک گھریلو ادارے کے طور پر باقی ہے۔

ان بچیوں کو شروع سے ہی پیشہ وارانہ تربیت دی جاتی ہے۔ تاجی گاؤں اور اس پٹی کے آداب سکھائے جاتے ہیں جب یہ بلوغ کو پہنچتی ہیں تو محنت و پاکدامنی کے مفہوم سے متعلق نا آشنا ہوتی ہیں۔

کرلی سکر کے گھر میں چند روکا سائیں میں نے دیکھیں ان میں سے بعض کے ساتھ دو دو تین تین بچیاں تھیں جو بظاہر پانچ چھ سال کی پائیز خوبصورت بچیاں تھیں لیکن جب انہوں نے گفتگو کی تو انہوں نے ایسے ایسے الفاظ استعمال کیے اور ایسی حرکات کیں جو تجربہ کار قباؤں کو بھی شرمانے پر مجبور کر سکتی تھیں۔

Newyork to Delhi by Robert Brown Mintern

حوالہ جات

- 1- خطوط غالب مرتبہ غلام رسول مہر۔
- 2- میرے زمانے کی دلی۔ ملاو احمدی۔
- 3- آغا راجہ نادر از مرید احمد خان
- 4- داستان نادر از تھیر دہلوی۔
- 5- بہادر شاہ ظفر از اسلم پریوز۔
- 5A- Historic Delhi. H.K.kaul
- 6- دلی تھا جس کا نام از انکھار حسین۔ سنگ میل پبلی کیشنز لاہور
- 7- چراغ دہلی از مرزا حیرت دہلوی۔
- 7A- Historic Delhi. H.K.kaul
- 8-9 بہادر شاہ ظفر از اسلم پریوز۔
- 10-11 خطوط غالب مرتبہ غلام رسول مہر۔
- 17F13 ایضاً
- 12- Historic Delhi. H.K.kaul-

پھول والوں کی سپر

”اس شہر میں ایک سیلہ ہوتا ہے۔ جو پھول والوں کا سیلہ کہلاتا ہے۔ یہاں لوگوں کے سینے میں ہوا کرتا ہے۔ امراے شہر سے لے کر اہل حرفہ تک قطب جاتے ہیں۔ دو تین ہفتے تک وہیں رہتے ہیں۔ سلطان و ہندو دونوں فرقوں کی شہر میں دکانیں بند نہ چلی رہتی ہیں۔“ (غالب نام نظام ٹھوٹ خان بے خبر ۱۸۶۳ء)^۱

دلی سے گیارہ میل کے فاصلے پر واقع مہروئی کوٹ انفراسیام سمجھا جاتا رہا ہے۔ یہیں حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کی درگاہ شریف واقع ہے اس لیے اسے قطب صاحب بھی کہتے ہیں۔ اہل دلی یہاں زیارت کے علاوہ تفریح کے لیے بھی آتے تھے اور کئی کئی روز یہاں قیام کرتے تھے۔ سیلے نے اسے ایک ماقادہ رسم بنادیا۔ کیا امیر کیا غریب، یہی قطب صاحب کہنے چلے آ رہے ہیں۔ تو نگروں کے اپنے گھر ہیں یا گھر گرانے پر لیے ہیں۔ غریبوں نے چھو لہاریاں لگا رکھی ہیں یا پھر قدیم عمارتوں کے کھنڈروں اور حزاروں میں

طرہ سے ہوئے ہیں۔^۲

پھول والوں کے چیلے کا آغا حضرت اکبر شاہ جانی کے عہد میں ہوا۔ ان کے ایک فرزند تھے مرزا جہانگیر قوی دکن طویل صورت لیکن اکمز اور بد مزاج۔ نیرہ ہادی تیرا اندازی میں حلق گنرسواری اور چگان میں مشرقی۔ رات کے علاوہ دن میں بھی شراب پیئے۔ انگریزوں کے ساتھ سوار ہو کر نکلنے اور گھوڑے کو ہمیز کر کے بڑی بڑی کمانیں اور خندقیں بھلائی جاتے اور انگریزوں کو چیلنج کرتے ان کے احترام کرنے پر ان کا مستحکماڑا تے۔ انہوں نے کئی انگریز افسروں کے بطور تحفہ نام رکھے ہوئے تھے۔ اگرچہ بادشاہ کے ولی مہداؤ ظفر تھے لیکن بادشاہ مرزا جہانگیر کو ولی مہدا بنانے کے خواہش مند تھے۔ شایعہ اس ولی اور اکمز شہزادے میں ایک تیور یا ایک باہر دیکھتے ہوں جو خاندان تیوری کی کھوئی ہوئی عظمت کو پھر سے بحال کر دے گا۔ انگریز شہزادے کے بارے میں کئی تحفظات رکھتے تھے۔ انہیں خدشہ تھا کہ کہیں شہزادہ علم بدعت بلند کر ہی نہ دے۔ قلعہ سہلی میں قیامات ریڈیلٹ اور جنرل آکزلونی کے نائب مسٹر شین Seton سے ایک روز اس سترہ سالہ شہزادے کا آستانہ سامنا ہوا تو شہزادے نے اس کی بھدا اڑاتے ہوئے کہا: ”لو لوے بے لولوے“ شین کچھ تو کہتا

کہ شہزادہ صاحب اس کا مذاق اڑا رہے ہیں لیکن تجاہل عار کا نہ سے کام لیتے ہوئے شہزادے کے ہمراہیوں سے در یافت کیا:

”صاحب عالم کیا کہتا ہے؟“

ساتھیوں نے کہا: ”حضور صاحب عالم آپ کو کولو یعنی موتی کہہ رہے ہیں۔“

عین نے زہر خند کے ساتھ کہا: ”ہم صاحب عالم کو کولو بنائے گا۔“

صاحب عالم کا یہ سن کر پارہ چڑھ گیا۔ جھٹ طمانچہ نکال کر ریڈیوٹ پر داخل ہوا۔ اس کی زندگی باقی قہمی بن چکی۔ انگریزوں نے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ شہزادے کو گرفتار کر کے فوج کی ایک رجمنٹ کے ہمراہ سیاسی قیدی کی حیثیت سے الہ آباد بھیج دیا گیا۔ بادشاہ سے کہا گیا کہ شہزادہ کو آداب و اطوار سکھانے اور تربیت دینے کی ضرورت ہے۔ نظر بندی کے دوران شہزادہ نے مثالی رویے اور عمدہ چال چلن کا ثبوت دیا۔ چنانچہ جلد ہی ان کی نظر بندی اور جلاوطنی ختم کر کے دہلی واپس بھیج دیا گیا اور انہیں دوبارہ اپنے دستے کی کمان بھی سونپ دی گئی۔³

اس جلاوطنی کے دوران شہزادے کی والدہ نے صفت مائی کہ جب فرزند اور جند رہا ہو کر آئیں گے تو وہ قلب صاحب پر پھولوں کا پھیر رکھت اور غلاف چڑھائیں گی۔ جب شہزادہ واپس آیا تو ان کا شاندار استقبال ہوا اور ملکہ معظمہ نواب متا زمل بیگم نے اپنی صفت بھی چڑھائی۔ بادشاہی بیٹے سے قلب صاحب کی درگاہ تک دور روپے تھیں کمزری کی گئیں۔ نواب متا زمل بیگم نے پچاس ہوان اندر سے کی گولیوں اور پھیلوں سے آراستہ کیے۔ ایک چاندی کی کشتی میں سونے کا پھلکا جس میں خلیم یا قوت بکھراج پنا اور سچے موتی جڑے تھے رکھا اور وہ کشتی شہزادے کے سر پر رکھی۔ غلاف شریف کی سینی بادشاہ نے اور صندل اور صطردان بیگم نے سر پر رکھے۔ مضافیوں کے خوان شہزادوں اور بیگمات نے سروں پر اٹھائے۔ آگے نفیریاں بھاتی ٹوٹ پڑیں۔ مزار شریف پہ غلاف اور صندل چڑھایا گیا۔ شیرینی تقسیم ہوئی۔ خزانہ ہمارا گیا۔ شہزادے کو قدم بوس کرایا گیا۔ بعد ازاں رعایا نے پھولوں کا پھیر رکھت مزار پر چڑھایا۔ پھول والوں نے پھولوں کا ایک پھلکا پھیر رکھت پر لگا دیا۔ بادشاہ کو یہ تقریب اس قدر پسند آئی کہ یہ میلہ ہر سال ہونے لگا۔ دوبارہ سے پھول والوں کے دوسو روپے سالانہ مقرر ہوئے۔ یہ میلہ پھول والوں کی سیر کہلایا۔⁴

رفتہ رفتہ یہ جمائی میلہ بن گیا۔ ہزار ہا مہول تاشے پہلوانوں کے اکھاڑے نکواؤں، غمز، بوٹ، ہانک کے کرب آتش بازیوں، پھولوں کے پھلکے کا جلوس، قریب ہی جوگ مالیا کا مندر تھا، وہیں بھی یہ دم ہونے لگی۔ ایک روز جوگ مالیا کے مندر پر پھلکا چڑھایا جاتا، اگلے روز قلب صاحب پہ۔⁵

بادشاہ کے حکم کے بموجب مسلمانوں کے پھلکے میں ہندو اور ہندوؤں کے پھلکے میں مسلمان شریک

ہوا کرتے تھے۔

راقم اللہ دہلی میں رہتے تھے۔ ”پہلے بہادروں کی چند رہنمائی کو مٹایا جاتا۔ مٹھی غالب سے پنکھا اٹھتا اور مہروں کے بازار سے گزرتا ہوا چٹکی کل پر آ جاتا جہاں وہ بادشاہ کو سلامی دیتا۔ اس کے بعد پہلے دن کا پنکھا جوگ مالیا کے مندر پر اور دوسرے دن کا نقب صاحب کے حمار پر چڑھایا جاتا۔ جب بہادر شاہ ظفر پھول والوں کی سیر کے لیے قلعے سے نکلے تو راستے میں منصور جنگ کے مقبرے پر ضرور روکتے اور وہاں خاصا نوش کرتے۔۔۔۔۔ بہادر شاہ ظفر کے زمانے میں اس پہلے میں تقریباً لاکھ ڈنچ لاکھ آدمی جمع ہوتے تھے۔ یہ پہلے بدھ سے جس تک تین دن رہتا تھا۔ کہا گیا ہے کہ اس پہلے کا طرح اس زمانے میں ادا تھی تین لاکھ تک پہنچ جاتا تھا۔“

اکبر شاہ جانی کے نزدیک بہادر شاہ ظفر کے روزناموں سے چند اقتباسات اس پہلے کے حوالے سے:

”حضرت بادشاہ سلامت نے پھول والوں کے چودھری کی درخواست پر دشمنان کو پھول والوں کی سیر کے پہلے میں شرکت کا وعدہ فرمایا ہے۔ اس پہلے میں طرح طرح کے عمدہ چھوٹے بڑے چٹھے اور رنگ رنگ کے پھول حضور نقب صاحب کے حمارانور پر چڑھائے جاتے ہیں اور ہزار دلائی جاتی ہے۔ ایک سو روپے اس پہلے کے خرچ پر بادشاہ سلامت کی طرف سے مرحمت کیے گئے۔“ (۷ اگست ۱۸۳۶ء)

”کلید خانے کے داروغہ احمد بیک سے ارشاد فرمایا کہ پھول والوں کی سیر میں ہمارا بھی جانے کا ارادہ ہے۔ بیگمات کے آنے جانے کی بھی کوئی صورت ہونی چاہیے۔ میرے خیال میں مناسب یہ ہے ڈیوڑھی عدالت سے لے کر کال پر دو تک قاتیں ایسا دو کی جائیں۔ حسین مرزا کو حکم ہوا کہ شہر سے جو ہری بچوں اور صنعت پیشہ لوگوں کے لڑکوں کو بلا کر مہتاب باغ میں جیتا بازار اور جوہری بازار لگایا جائے۔“ (۱۵ اکتوبر ۱۸۳۷ء)

”حضرت بادشاہ سلامت نے پھول والوں کی سیر کے دن زبان گوہر فشاں سے فرمایا کہ بارگاہ شادی سے پہلے تک عمدہ عمدہ قاتیں اور چٹکی خیمے نصب کیے جائیں اور صرافوں جوہریوں، سیوہ فروشوں اور ہر قسم کے دکان داروں کو اطلاع دے دی جائے کہ دکان داری کا مال دے کر دو اپنی بارہ و بارہ حیرہ حیرہ سال کی لڑکیوں کو خیرہ گاہ میں بھیج دیں۔ اور یہ تاکید کر دیں کہ عمدہ عمدہ قسم کے بل لے کر آئیں اور دکان کو اچھی طرح سے سجانیں۔ شادی بیگمات پہلے میں سیر و تفریح کی غرض سے شریف لے جائیں گی تو عمدہ اور نقیس چیزیں خریدیں گی۔“ (۱۴ اکتوبر ۱۸۳۷ء)

”کل فروشوں کے پہلے کی سیر کرنے کے لیے حضور والا نے اپنے صاحبزادوں اور صاحبزادیوں کو کچھ روپیہ عنایت فرمایا اور کل فروشوں کے چودھری غلام علی کو بھی سو روپے عطا فرمائے۔۔۔۔۔ شام کے وقت

پھولوں کے پانچ چھ پتے بنائے گئے۔ درگاہ میں نیاز ہوئی۔ مسٹر کالون اور صاحب الجنت بھی پہلے میں شریک ہوئے۔ شیخو اے مرزا نے حاضر ہو کر پکاس شیریں خذر میں بخش کیں۔ درگاہ کے خادموں نے آم خذر کیے۔ حضور والا نے دس دس روپے انعام میں دیئے۔“ (۳۰ جولائی ۱۸۴۹ء)^۹

حوالہ جات

- 1- خطوط غالب مرحوم علامہ رسول مہر۔
- 2- اجڑا دربار شاہجہاں احمد دہلوی۔
- 3- قلعہ معلیٰ کی جھلکیاں از عرفی تیموری۔
- Twilight of Mughals. By P. Spear
- 4- شاہجہاں احمد دہلوی از اجڑا دربار۔
- 5- بزم آفر۔
- 6- داستانِ نندرا از غیسر دہلوی۔
- 7-8-9 بہادر شاہ ظفر کے شبہ اور ذرا ضیاء الدین لاہوری

عیدین، ہولی، دیوالی، نور روز اور محرم

”پس جب عید ہے اور روزِ سعید ہے تو کیا عید ہے کہ خلافِ شہور خلافِ ماضی اس مہینے میں تم آ سکو۔ ہے میں تو کہتا ہوں کہ نہ آ سکو۔ اس ماہِ مبارک میں امضائے حکم سرکار کا وہ پتلا گرم ہو کہ پارسیوں کی عید کو سر پر نشین کا گلاس گزرے۔ دور کیوں چاہیے! ہولی کی دھلینڈی کا ساں لو پارو میں بندھ جائے۔ ایک خرسوار کی سواری بڑے دھوم سے نکلے۔ حسنِ اتفاق یہ کہ وہی موسم ہے۔ ہولی اور عید.... کو سر پر نشین کا زمانہ باہم ہے۔ موت کے آفتاب میں یہ دونوں تہوار ہوتے ہیں۔ کل آفتابِ موت میں آیا ہے۔ کو سر پر نشین اور ہولی کا مزہ لایا ہے۔ شیر میں چند روز اور ستم کشِ فراق اور تیرے دیدار کا مصداق ہوں۔ تو کو سر پر نشین اور ہولی کی رنگِ دلایاں منالے اور خرسوار ہو کر مغربِ تازیانہ دوڑا لے۔“^۱

غالب نے ۲۶ رمضان ۱۲۸۱ھ مطابق ۲۳ فروری ۱۸۶۵ء کو اپنے فرزند معنوی علاؤ الدین احمد خان غلامی کے نام لو پارو بھیجے گئے خط میں ان تین تہواروں کا ذکر کیا تھا۔ دلی میں کو سر پر نشین کے منائے جانے کے حوالے سے میرے محدود مطالعہ میں کچھ نہیں آیا۔ بمبئی میں خاصی تعداد میں پارسی آباد تھے۔ وہاں یہ تہوار بڑے پیمانے پر منایا جاتا تھا۔ دلی میں کچھ پارسیوں کی شراب کی دکانوں کا غالب ذکر کرتے ہیں:

”یہاں جو پارسیوں کی دکانوں میں فرنگی اور شامِ چین کے درجن دھرے ہیں....“^۲ ہو سکتا ہے دلی میں یہ تہوار منایا جاتا ہو اور غالب نے تازیانہ بدست خرسوار خود ملاحظہ فرمایا ہو۔

کو سر ایسے آدمی کو کہتے ہیں جس کی بڑی حرکتِ دائمی نہ نکلے۔ ایسے آدمی کے بدن پر گرم دھانیاس ط کر اسے گدھے پر بٹھا دیا جاتا تھا اور اس کے ایک ہاتھ میں کوڑا اور دوسرے میں پچھلا ہتھوڑا یا جاتا تھا۔ وہ ہائے گرمی ہائے گرمی چلتا اور تیزی سے پچھلا جھلتا۔ تماشائی اس پر غصہ پانی اور یوں پکھتے رہتے۔ جب وہ سردی کے ماتے کا پٹنہ لگتا تو لوگوں کو پکڑے برسانے لگتا۔ جھکڑ لگ جاتی اور وہ کوڑا اٹھاتا ہوا لوگوں کا تعاقب کرتا۔

وہ ایک طرف رخ کرتا تو دوسری طرف سے غصہ پانی کی بوچھاڑیں آنے لگتیں۔ لوگ چٹخیں بھی کھاتے اور قہقہے بھی لگاتے۔ اس ہنگامے کے بعد اسے خزانے بخش کیے جاتے۔ لوگ گھروں کے دروازوں میں نذریں ہاتھ میں لیے کھڑے رہتے۔ یوں تو اسے یہ انتہائی بھی حاصل تھا کہ وہ کسی بھی پارسی کی دکان میں گھس کر جو بھی چاہے اٹھالے۔^۱

مجھے یقین ہے کہ کوئی ”رنگو“ ضرور کسی شراب خانے میں گھس کر شام بین اور فریج کی این بوتلوں میں سے ایک آدھا اٹھا لیتا ہوگا جنہیں حضرت غالب لپکائی ہوئی نظروں سے دیکھتے تھے۔ ہولی کا تہوار مارچ میں منایا جاتا۔ یہ آدھار کا جشن ہوتا ہے۔ نظیر اکبر آبادی فرماتے ہیں:

ہولی کی نظیر اب جو بہاری ہیں اہا
محبوب رنگیلوں کی قطاریں ہیں اہا
کپڑوں پر جی رنگ کی دھاریں ہیں اہا
سب ”ہولی“ ہی نکاریں ہیں اہا
کیا بیش ہے کیا رنگ ہے کیا دھنگ دیش ہے
ہولی نے بچایا ہے جب رنگ دیش ہے

لوگ ایک دوسرے پر گال چھڑکتے اور ایک دوسرے کو رنگیں پانی سے شراب کر دیتے۔ ایک دوسرے پر رنگوں کی پچھاریاں چلاتی جاتیں۔ احوال شہنائی اور بانسریوں کی تائیں اور رقص..... قلعہ معلیٰ کی ہولی کا ذکر ”دلی کا آخری دیدار“ میں یوں آتا ہے:

”رہی ہولی تو یہ بھانت بھانت کے ساگ نے دل لگی کی چیز بن جاتی۔ بازاروں گلیوں گھروں میں رنگ کھیلے جا رہے ہیں۔ دف جہاں گھر نظری راج رہی ہے۔ جا بجا مٹھے باج رہے ہیں۔ شہر کے سارے رنگ ایک ایک کر کے قلعے پہنچے۔ حضور عالم پناہ ہندو مسلمان ایک طرف بادشاہ زادایاں اور امیر زادایاں دوسری طرف جمروگوں میں بیٹھی ہیں رنگ ساگ آ رہے ہیں انعام لے کر جا رہے ہیں۔“^۲

قلعہ میں دیوالی کی روٹھیں ہولی سے بھی زیادہ ہوتیں۔ ”ہزم آخر“ کے مطابق:

”دیوالی پہ جا بجا نوبت تھارے بیچتے۔ کھیل تاشوں کا ٹھانڈ اور مٹی کے کھلونوں کی دکانیں لگتیں۔ حلوائیوں کی دکانیں رنگ رنگ کی مٹھائیوں سے سج جاتیں۔ پہلے دیے سے تیسرے دیے تک ایسی روشنی ہوتی کہ راست کو دن کا ساں ہو جاتا۔ تین دن تک محل میں سب کی آمد و رفت بند ہو جاتی تھی۔ ثابت ترکاریاں مٹھا پیچکن، مولیٰ، کدو کا جو وغیرہ محل میں لانے کی ممانعت ہوتی تھی تاکہ کوئی چارو نوٹا نہ کر سکے۔“

تیسرے دیے کو بادشاہ سونے چاندی میں تلخے اور بادشاہ کے دزن کے برابر سونا چاندی ہوتا تھا جو کو

ہاتھ جاتا۔ ہمیشہ کالاکسیل کڑوا تیل سونا چاندی اور نقد و غیرہ بادشاہ پرستہ صدقے کیے جاتے۔ قلعے کی روشنی کا حکم ہوتا۔ ہندو امراء مضافی کے کھلونے اور مضافی بادشاہ کی خدمت میں پیش کرتے اور بادشاہ اس روز عام تعطیل کا حکم صادر کرو دیتے۔^۶

سب ذرا دھیرے کی روافضیں ملاحظہ فرمائیے:

”دھیرے کے دن بادشاہ فقیر صبح دو بار کرتے۔ پہلے ایک نعل کھنڈ بادشاہ کے سامنے اڑایا جاتا۔ اس کے بعد باز خانے کا دارودھ ہار اور شکرانے کر آتا۔ باز اور شکرے کو لے کر ہاتھ پہنھاتے۔ باز شکرے کا جانی دشمن ہوتا ہے۔ اس لیے باز اور شکرے کو ایک ساتھ اپنے ہاتھوں پر بٹھانے سے غالباً بادشاہ کا مقصد یہ ہوتا کہ ان کے دربار میں شیر اور بکری ایک گھاٹ سے پانی پیتے ہیں۔ تیسرے پہر کے قریب ہندو امراء ہنڈری پیش کرتے اور بادشاہ جھرو کے میں آ جیتے۔ نو دن تک رام بیلا کے جلوس نکلتے۔ دسویں دن بھرت ملایا جاتا اور اس طرح دھیرے کا تہوار خیر سگالی کے جذبات کے ساتھ ختم ہو جاتا۔“

نوروز عالم افروز اصلاً ایرانی تہوار ہے۔ دلی میں بادشاہ سے فقیر تک سب یہ تہوار مناتے:

”قلعہ معلیٰ میں دیوان عام دیوان خاص ہوا گل موتی گل باغ حیات بخلق شہاب باغ سادون بہادوں غرض ہر عمارت کو خوب سجایا جاتا۔ نچری پنڈت جو رنگ سال کا بتاتے۔ وہی نوروزی رنگ کہلاتا۔ بادشاہ شہزادے نیگمات، شہزادیاں سب اسی رنگ کی پوشاکیں پہنتے۔ بادشاہ حضرت علیؑ کے دسترخوان پر نیاز دیتے۔ پہلے ذرا سا طرہ بچھتے اس کے بعد دلی عہد فقیراؤں اور معزز امیروں کو اپنے ہاتھ سے تحریک دیتے۔ نوروزی کے دن مسلمانین بادشاہ سلامت کے سامنے سبز درمئی کے اڑے لڑاتے۔ طرح طرح کے کھیل ہوتے۔ بادشاہ سلامت نوروزی لباس زیب تن کر کے قلعہ صاحب بھی جاتے۔ محل سرا میں چاندی کی کرسی پر بیٹھ کر دربار کرتے اور اراکین مملکت سے نذرانے قبول کرتے۔“

نوروز کے دسترخوان پر سات طرح کے چائے سات طرح کی مٹائیاں سات طرح کے پھل اور سات طرح کی ترکاریوں سے پکا ہوا سالن ہوتا اور ساتھ میں جو کی روٹی ساگ کی بھجیا اور ستویہ ہوا حضرت علیؑ کا دسترخوان۔

نوروز کی اسی رسم کے ساتھ کچھ شگون بھی دہشت ہو گئے۔ چکھڑا جھلنے کا شگون سونا چاندی اچھالنے کا شگون اور آغریں اڑنے کا کھیل اس کھیل پر نوروز کا جشن تمام ہوتا۔

عید الفطر

اگر عید کا چاند اترتھیں کا ہوتا تو اس عید کو جو ان عید کہا جاتا تھا۔ چاند دکھائی دینے کی بجائیں تو نہیں دانی جاتیں۔ اس کے بعد شادیانے بچتے۔ اس طرح عید کا اعلان ہوتا تھا۔ راتوں رات توہیں ڈیرے شیعہ فرش

فرش مید گاہ بکلی جاتے۔

صبح بادشاہ غسل کرتے، پہنشاک بدل کر دودھ سویاں نوش کرتے، ہوا دار کی مدد سے ہاتھی پر سوار ہوتے پھر اکیس توپوں کی سلامی کے بعد جلوس عید گاہ روانہ ہوتا۔

عید گاہ کے احاطے میں بادشاہ اور ولی مہدی توپاگلی میں بیٹھ جاتے، باقی لوگ پہل ہی چلتے۔ نماز سے فارغ ہو کر بادشاہ قلعے میں واپس آتے، دیوان خاص میں دربار ہوتا، غزریں لیتے، پھولوں کے طرے اور پار تقسیم کرتے اس کے بعد خاصا کھاتے آرام فرماتے۔^۹

یہاں شاہ ظفر کے روزنامے ۲۵ دسمبر ۱۸۳۹ء کے مطابق:

”ہمدرد عید الاثنیٰ بادشاہ سلامت ذوق برقی لباس زیب تن فرما کر بہت عمدہ گھوڑے پر سوار ہو کر عید گاہ تشریف لے گئے۔ نماز سے فراغت حاصل کرنے کے بعد خلعت شفق پارچہ، دو رقم جواہر ایک چند شمشیر، برتنہ، خطیب صاحب کو اور کھواب کی قبا، سو رقم جواہر اور چند شمشیر و ہار اللہ و عالم امور خاندانی کو مرحمت فرمائے۔ اس کے بعد اونٹ کی قربانی کی گئی اور حاضرین مجلس نے نان و کباب کا شغل کیا، اس وقت نہایت شاندارانی اور فرحت کا ساز و سامان تھا۔ ایک دوسرے کو مبارکباد دیتے، میں مصروف نظر آتا تھا۔ چاروں طرف سے مبارک باد مبارک باد کی صدا سنیں آ رہی تھیں۔

جس راستے سے بادشاہ سلامت کی سواری گزری، امراء و رزساہ و اراکین سلطنت نے عید کی مبارک بادیں پیش کیں اور غزریں بھی گزرا میں۔ جب بادشاہ سلامت محلِ معنی میں تشریف لے گئے تو تمام خاندان کی بیگمات، جن میں خاندان تیمور کی خواتین بھی شامل ہیں، مبارک باد عرض کرنے کے لیے بادشاہ سلامت کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور حسبِ حیثیت خدو پیش کرنے کی عزت حاصل کی۔ آتے جاتے شاہی اور انگریزی توپ خانے سے نہایت بلند آواز کے ساتھ سلامی کی توپیں چھوڑی گئیں۔“^{۱۰}

اونٹ کی قربانی کا حال مفتی فیض الدین یوں بیان کرتے ہیں:

”ایک اونٹ پانات کی بھول پڑی ہوئی، سینے پر چلے کا نشان کیا ہوا رستوں میں بکڑا ہوا فرش بکڑے کھڑے تھے۔ دیکھو اب اونٹ کی قربانی ہو رہی ہے۔ بادشاہ اونٹ کے پاس آئے۔ فرش نے ایک بڑی ہی چادر بادشاہ اور اونٹ کے بیچ تان لی۔ قدرِ خانے کے دامو خانے بادشاہ کے ہاتھ میں برہمگی دی۔ قاضی نے اونٹ کی قربانی کی دعا پڑھوائی۔ بادشاہ نے دعا پڑھ کر چرنے کے نشان پر اونٹ کے تاک کے برہمگی ماری۔ قاضی نے اسے دعا پڑھائی۔ بادشاہ سوار ہو کر غصے کی سردی کے پاس آئے۔ اے لڑکیاں ایک دہنہ ہندی میں دلکا کھڑا ہے۔ بادشاہ نے اس کی قربانی کی۔ غصے میں آئے۔ مسند پر بیٹھے۔“^{۱۱}

۱۸۵۵ء کے ہنگامے کے دوران بھی دو عیدیں آئیں۔ بھرتیون لال اپنے روزنامے میں ان کا

حال یوں بیان کرتا ہے:

۲۵ مئی

”بادشاہ نے آج جامع مسجد میں عید کی نماز ادا کی۔ شاہزادگان بھی ہمراہ تھے۔ نماز کے وقت راجہ بلب گڑھ کی طرف سے ایک ساٹھ فی سوار آ یا اور یہ اطلاع دی کہ مہاراجہ نے انگریز کی فوج دیکھی ہے جو سیدھی دہلی کی جانب پیش قدمی کر رہی ہے۔ اس خبر نے بے حد ہیجان پیدا کر دیا۔ سپاہی اور بادشاہ کے مشیر ادھر ادھر بکھر رہے تھے اور سوچ رہے تھے کہ کیا کارروائی اختیار کی جائے اور شہر کو چھوڑ دینا چاہیے یا نہیں۔ دسکی سواروں نے اپنے گھوڑوں کے زین کسے شروع کر دیے۔ شہر کے بد معاش ان کا لہذا لہذا آتے رہے کیونکہ جلد جلد تباہی کرنے میں ان کے ہاتھ کا پ رہے تھے۔۔۔۔۔ بعد میں معلوم ہوا کہ انگریز فوج کی پیش قدمی کی خبر غلط ہے اور یہ کہ ساٹھ فی سوار کو عید کے جلوس کو دیکھ کر انگریز کی ہراول فوج کا دھوکہ ہوا تھا۔ جب ڈراما جوش دھیمہ بچ گیا تو شہر کے قیام کن بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ جیسا کہ عید کے موقع پر ان کا دستور تھا۔ محل میں یہ خبر پہنچی کہ جھجھک اور ہانپوں کے درمیان بمقام جنگ جنگ برپا ہوئی جس میں باغی فتح پاب ہوئے اور یہ کہ وہ اب خزانہ کا کچھ حصہ ساتھ لے کر بھٹے انہوں نے لوٹا تھا واپس آ رہے ہیں۔“^{۱۱}

یکم اگست ۱۸۵۷ء

بادشاہ اجمیان سلطنت کی معیت میں عید کی نماز ادا کرنے کی غرض سے مسجد میں تشریف لے گئے اور جامع مسجد چھوٹی مسجد اور عید گاہ کے مولویوں میں کپڑوں کے چھ جڑے اور موتیوں کی تین مالائیں تقسیم کیں۔ مرزا احمد سلطان اور مرزا انجمن داد خان کو چار چار خلعت اور تین تین مالائیں عطا فرمائیں۔ بادشاہ نے عید گاہ میں بھیمڑی قربانی بھی ادا کی۔ مرزا جواں بخت، نسیم حسن اللہ خان، راجہ اجیت سنگھ، دیکس پنپال، ناصر حسن، مرزا مظفر الدولہ، کپتان دلاور علی خان اور دیگر افسران نے اپنے اپنے سر پہے اور رتے کے لحاظ سے نذریں پیش کیں جن کی مجموعی مقدار ۱۸ اشرافیاں اور ۱۲۰ روپے تھی۔ آج خبر موصول ہوئی کہ گج کی فوج کا بمقام پاری انگریزوں سے معرکہ رہا۔ جس میں بہت سے مقتول و مجروح ہوئے۔ بارش کی وجہ سے سخت تکلیف کا سامنا رہا۔ اس کے بعد بادشاہ حرم میں تشریف لے گئے۔ نیگات نے بھی نذریں پیش کیں۔ جیسے غلیہ طرحے سے معلوم ہوا کہ انگریزوں نے علی الصبح چھ توپوں کی باتری کے ساتھ سپاہیوں پر حملہ کیا تھا اور موخر الذکر کو پکڑ کر ہاتھ۔“^{۱۲}

یہ تو تھے خوشی کے تہوار۔۔۔۔۔ اب ایک نظر مشرہ محرم پڑا لیں۔

”محرم کا چاند نظر آتے ہی قلعے میں ماتم کے باجے بجتے گھٹتے تھے اور شہر میں جگہ جگہ سٹیلز لگائی جاتی تھیں۔ بادشاہ خود امام حسینؑ کے فقیر بنتے۔ سبز کپڑے پہنتے اور درگاہ میں جا کر سلام کرتے۔ دس روز تک

فقیروں کو کھانا اور شربت بٹاتا تھا۔ ساتویں تاریخ کو رنگ رنگ کی قندیلیں روشن کی جاتیں اور مہندی تیار ہوتی۔ رات کو مہندی امام ہاڑے پہنچا دی جاتی۔ محرم کی آٹھویں تاریخ کو بادشاہ حضرت مہاش کے سنے بٹتے۔ لال کھاروے کی ایک لٹگی باندھ کر شربت کی ایک منگھ کندھے پر رکھتے اور معصوموں کو اپنے ہاتھ سے شربت پلاتے۔ اس کے بعد ملیدے پر نیاز دی جاتی۔

عشرے کے دن یعنی محرم کی دس تاریخ کو موتی مسجد میں بادشاہ، مہاشورے کی نماز پڑھتے۔ اس کے بعد دیوان خاص میں دسترخوان کی تیاری ہوتی۔ دسترخوان پر شیربائیں چنی جاتیں۔ شیربالوں پر کباب پھینڈ اور کباب اور مولیاں کھڑ کر رکھی جاتیں۔ بادشاہ کھڑے ہو کر ان پر نیاز دیتے۔ نماز کے بعد ذرا سا شیربال کا ٹکڑا کباب کے ساتھ آپ بکھتے۔ اس کے بعد ایک شیربال اور کباب دلی عہد کو اور اس کے بعد شہزادوں اور امیرزادوں کو اپنے ہاتھ سے تقسیم کرتے۔ اکثر مسلمانین قلعہ تعویذ دہلی بھی کرتے تھے۔ تعویذیں کسے آگے وصول تھیں بچتے۔ مرچے پڑھے جاتے۔ مرثیہ خوانوں کو انعام و اکرام دیا جاتا۔ اس طرح عزاداری کے دن پھیل کو بکھتے۔¹² (بزم آخر)

مضمون کا اختتام غالب کے لکھے ہوئے ایک مرچے کے چند اشعار پر کرتے ہیں:

فروغ جوہر ایمان حسین ابن علی	کہ شمع انجمن کبریا کہیں اس کو
کفیل بخشش است ہے بن نہیں پڑتی	اگر نہ شافع روز جزا کہیں اس کو
صبح جس سے کرے اخذ فیض جاں بخش	ستم ہے کشہ تیغ جفا کہیں اس کو
وہ جس کے ہاتھوں پر ہے طویل سبیل	شمیدہ تختہ لب کربلا کہیں اس کو
بہت ہے پایہ گرد رو حسین بلند	بقدر فہم ہے گر یکسا کہیں اس کو
ہمارا منہ ہے کہ دیں اس کے حسن صبر کی داد	مگر نبی و علی پیشا کہیں اس کو
یہ اجتہاد غلب ہے کہ ایک دشمن دیں	علی سے آگے لڑے اور خطا کہیں اس کو
یزید کو تو نہ تھا اجتہاد کا پایہ	برا نہ مانے گر ہم برا کہیں اس کو
علی کے بعد حسن اور حسن کے بعد حسین	کرے جوان سے برائی بھلا کہیں اس کو
نبی کا ہو نہ جسے اعتقاد کافر ہے	رنگے امام سے جو بغض کیا کہیں اس کو

ہمرا ہے غالب دلچسپ کے کلام میں درد

نظارہ نہیں ہے کہ خوشی نوا کہیں اس کو

(دعایاں غالب کامل ادکالی داس گپتا رضا)

حوالہ جات

- 1-2 خطوط قالب مرحبہ غلام رسول مہر۔
- 3- حوالہ خطوط قالب مرحبہ غلام رسول مہر۔
- 4- بہادر شاہ ظفر از اسلم ہدیج۔
- 5-8 عشق فیض الدین از بزم آفر۔
- 9- بہادر شاہ ظفر از اسلم ہدیج۔
- 10- بزم آفر از عشق فیض الدین۔
- 11-12- جنگ آزادی کے دو خفیہ روزنامے۔
- 13- بزم آفر بہادر شاہ ظفر از اسلم ہدیج۔
- 14- قالب درون خانہ از کاکی داس گیتارضا

دلی کی زبان..... اردو ہندی، ہندوستانی، اردوئے معلیٰ

”اردو آگے مرکب تھا۔ عربی اور فارسی اور ہندی اور ترکی ان چار زبانوں سے۔ اب پانچویں زبان یعنی انگریزی بھی اس میں شامل ہو گئی۔ دیکھو گنجائش اردو کی کہ یہ پانچوں زبانوں کو کس لطف سے حاوی ہوئی ہے اور یہ زبانیں اس میں کس طرح سما گئی ہیں کہ کوئی زبان اور یہی معلوم نہیں ہوتی۔“ (نکات غالب)^۱

مسلمان جب برصغیر میں آئے تو انہوں نے بحر ہند کے ساحل سے لے کر ہمالیہ تک پھیلے ہوئے اس پار سے خطے کو ہند یا ہندوستان کا نام دیا۔ (ان سے قبل یونانی دور یا کے سندھ کو اطلس اور اس حوالے سے اس دھرتی کو اٹل یا کہہ چکے تھے۔) یہاں کی زبانوں کو وہ سنسکرت تھی، پرتگالی تھی یا دکنی.... سب کو ہندی کہہ کر پکارا گیا۔ جب باہر سے آنے والے لوگ ترک، عرب، ایرانی، افغان آ آ رہے ہیں اور مقامی لوگوں سے کھلے ملے تو آہستہ آہستہ ایک مقامی زبان جو اپنے اندر ہر دلی زبانوں کے الفاظ شامل کیے ہوئے تھی وجود میں آئی اسے ہندی ہی کہا گیا۔

شاہ جہان کے عہد میں بازار اور لشکر گاہ کی زبان کا نام ترکی لفظ اردو کے حوالے سے اردوئے معلیٰ رکھا گیا۔ گویا تھوڑے معلیٰ کی زبان.... اور دہلی (شاہ جہان آباد) کی بولی کا ڈھنگ زبان کی صحت اور صفائی کا معیار بنا.... کچھ عرصہ بعد اردوئے معلیٰ کی بجائے اسے زبان اردو اور آخر میں مختصراً اردو کہا جانے لگا۔^۲

ایک طویل عرصہ تک اردو اور ہندی ایک ہی زبان کے لیے استعمال کیے جاتے رہے۔ انگریزوں نے فوراً وٹیم کالج قائم کیا تو دو الگ الگ زبانوں اردو اور ہندی کے شیعے بنا کر مولویوں اور چڑتوں کو ان میں بٹھا دیا۔ مولویوں نے سنسکرت الفاظ اور چڑتوں نے عربی اور فارسی الفاظ کو زبان سے نکالنا شروع کر دیا اور یوں اردو اور ہندی دو حریف زبانیں بن کر سامنے آئیں۔ بتارس اور دہلی میں کالج قائم کیے گئے تو دہلی میں ہندی اور بتارس میں اردو کی حوصلہ شکنی کی گئی۔^۳

رام بابو سکسینہ کہتے ہیں:

”حقیقت یہ ہے کہ زبان اردو اس ہندی یا بھاشا کی ایک شاخ ہے جو صدیوں تک دہلی اور پھر

فارسی کا کوئی لفظ غلط نہیں ہوا۔ خود ہندوؤں نے اپنی زبان میں فارسی کے الفاظ لے کے ہندی کو بھی کچھڑی کر دیا۔ ابتدا اس کی راجہ ٹوڈل سے ہوئی جو درجہ مال بنایا گیا تھا اور جب جدید مال گزاری کا سلسلہ بنا ہے تو اس میں راجہ نے کور نے بہت سے الفاظ فارسی کے شامل کر دیے۔ شاہ جہان کی سلطنت ہوئی تو اردو بجائے خود ایک مستقل زبان کی صورت میں آگئی اور ہندوستان اس میں ترقی ہونے لگی۔ یہاں تک کہ پوربائی زبانوں کے الفاظ اس میں شامل ہونے لگے۔۔۔۔۔ اردو کے صرفی و نحوی قواعد بالکل انہی اصولوں پر مبنی ہیں جن اصولوں پر ہندی کے ہیں۔^۶

غالب نے اپنی اہلیہ کے بھانجے زین العابدین خان عارف کے بچوں باقر علی خان اور حسین علی خان کو فارسی پڑھانے کے لیے ایک منظوم رسالہ لکھا جو ”قادر ناصر غالب“ کے نام سے ۱۸۶۲ء میں شائع ہوا۔ اس میں انہوں نے کہیں بھی اردو کا لفظ استعمال نہیں کیا۔ عربی اور فارسی کے حروف الفاظ کو ہندی کا نام دیا ہے۔

فارسی گچڑی کی بھی دستار ہے	تج کی ہندی اگر تھوار ہے
کبک کو ہندی میں کہتے ہیں چکور	نولا راسو ہے اور طازس مود
دود کو ہندی میں کہتے ہیں دھواں	چاہ کو ہندی میں کہتے ہیں کنواں
فارسی میں بھوں کا اہو نام ہے	ہندی میں عقرب کا بچھو نام ہے
تازیانہ کیوں نہ کوڑا نام پائے	سپ بھندی میں گھوڑا نام پائے

ہفت سات اور ہشت آٹھ اور سوست بیس ی اگر کہیے تو ہندی اس کی تیس:

آہل اور آدوغ کی ہندی ڈکار	سے شراب اور پینے والا میکسار
فارسی آئینہ ہندی آری	اور کنگھی کی ہے شانہ فارسی

مسٹر بیگن کے ”تذکرہ شعراء ہند“ کے حوالے سے نقد کے نام خط میں لکھتے ہیں:

”اصل یہ ہے کہ تذکرہ اگر بیگن کی زبان میں لکھا جاتا ہے۔ اشعار ہندی و فارسی کا ترجمہ شامل نہ کیا جائے گا۔ صرف شاعر کا اور اس کے استاد کا نام شاعر کے مسکن و وطن کا نام مع مختص درج ہوگا۔“
(۹ دسمبر ۱۸۶۲)^۷

جبکہ اسی خط میں اپنی طرف سے رہتی گن کو ارسال کردہ سولہ شعراء کے کوائف کا ذکر کرتے ہوئے چند شعراء کا حوالہ دیتے ہیں تو ان کے لیے اردو شاعر کا لفظ بجائے ہندی کے استعمال کرتے ہیں۔

”نواب ضیاء الدین خان بہادر رئیس نوہادہ فارسی و اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے۔ فارسی میں تیر اور اردو میں دسٹھان نظم کرتے ہیں۔ اسد اللہ خان غالب کے شاگرد نواب مصطفیٰ خان بہادر علاقہ دار جہانگیر آباد اردو میں شیفہ اور فارسی میں صرحتی نظم کرتے ہیں۔ اردو میں مومن خان کو اپنا کلام لکھاتے ہیں۔“^۸

۱۳ جولائی ۱۸۶۷ء کو تھانہ مرزا قادی کے نام ایک خط میں تحریر کرتے ہیں:

”میر اکرام کیا نظم، کیا نثر، کیا اردو، کیا فارسی، کبھی میرے پاس فراہم نہیں ہوا۔ دو چار دوستوں کو اس کی غرضی وہ مسودات مجھ سے لے کر جمع کرتے تھے۔ سوان دوستوں کا زمانہ تھانہ میں گھری لٹ گیا۔ ذکتاب رہی خداساب رہا پھر میں اپنا کلام کہاں سے لادوں۔“^{۹۰}

اس سے قبل ۱۸۵۹ء میں یوسف علی خان مزین کے نام خط میں اردو کی بجائے ہندی کلام لکھتے ہیں:

”تھانہ میں میرا گھر نہیں لٹا مگر میرا کلام میرے پاس کب تھا کہ نہ لٹا۔ بھائی فیاض عالم دین خان بہادر اور ناصر حسین مرزا ہندی اور فارسی نظم اور نثر کے مسودات مجھ سے لے کر اپنے پاس جمع کر لیا کرتے تھے۔ سوان دونوں گھروں پر چھاڑ دیکر مجھے ذکتاب رہی خداساب۔“^{۹۱}

مرزا افتخار کے نام ایک اور خط میں لکھتے ہیں:

”نثری کہتا ہے روح را ناشتا فرستادی یعنی روح کو تو نے بھوکا بھیجا تا شتا اس کو کہتے ہیں جس نے کچھ کھا یا نہ ہوا ہندی اس کی نہاد۔۔۔۔۔ تم لکھتے ہو چپ تا شتا فرستادی یعنی خدائے صبح جیسا کہ ہندی میں مشہور ہے اس نے تا شتا بھی کیا ہے یا نہیں۔

واقف کہتا ہے:

نے محرم قفس نہ بہ دام آشنا شدیم نثریں کلمہ سماعت پرواز غولیش را
یہ بھی ہندی کی فارسی ہے۔ بری گزری اور شہ گزری اکل زبان ایسے موقع پر حال لکھتے ہیں:

نثریں کلمہ حال پرواز غولیش را

قفس کہتا ہے:

کشتہ بر کشتہ تپاں بود در خاک نبود

یہاں پر پتہ بخود کا گل ہے۔ ہندی میں کچھ نہیں کی جگہ خاک نہیں بولتے ہیں۔ (۱۳ مئی ۱۸۶۵ء)^{۹۲}

ان مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ غالب اردو اور ہندی کو ایک ہی زبان کے دو نام سمجھتے تھے۔ اب

آئیے دراز بان کے ”پنظارے“ کے لیے دلی کی زبان کے کچھ نمونوں سے اطلب انداز ہوں۔

”نانی..... ہاں بیٹی چار چاند ہی لگے ہوئے تھے۔ یہ سیلہ بادشاہ کی سر پرستی میں ہوتا تھا اور بادشاہ

خود اس میں شریک ہوتے تھے۔ وہ دھوم دھام ہی کچھ اور تھی۔ لال قلعہ کی کوکھ ہری تھی۔ الغاروں دولت بھری

پڑی تھی۔ لہو و فتاہے تو بھورا بھورا کبھی کوکھ پختا ہے۔ یہ شہر آبادی کا ذکر ہے تھانہ پڑنے سے پہلے کا مجھے پورا سا

ہوش بھی نہیں تھا۔ ہمارے ہاں ایک مغلانی آ پا کرتی تھیں۔ بڑی بڑی غلامی آنکھیں۔ گالوں کی ہڈیاں ابھری

ہوئیں۔۔۔۔۔ منہ میں کوئی دانت نہ تھا۔ سر پہ روٹی کے گالے سے ہال دھان پانی آ دی تھیں۔ وہ ستا یا کرتی تھیں

اس میر کا حال بادشاہی محل سے لے کر تالاب اور جھرنے اور امریوں اور ناصر کے بارگ تک نہانا ہو گیا۔ جانا

سرو چے کھینچ گئے۔ سہائی اور فوجوں کے پھرے لگ گئے۔ کیا مقدور غیر مرد کے نام ایک پشہ بھی کہیں دکھائی دے جائے۔ محل کی جنگلی ڈیڑھی سے بادشاہ ہوا دار میں اور ملکہ زبانی تام جھام میں اور سب ساتھی سواری کے گھرنے پر آئے۔ بادشاہ اور ملکہ زبانی بارہ درہی میں بیٹھے اور سب ادھر اُدھر سر کرنے لگے۔ کڑ بانیاں چڑھ گئیں۔ بکوانا ہونے لگے۔ امیریوں میں جھولے پڑ گئے۔ سودے والیاں آئیں۔ ایک گھڑی ایک کو ہلسا رہی ہے۔

”اے بی زبانی! اے بھی شمن! اے جان من! اچھی چلو بھٹلے چھرے سے بھلیں۔“
 وہ کہتی ہے: ”اے بی ہوش میں ہو۔ اپنے حواسوں پر سے صدمے دو۔ اپنے محل کے باغین کو کسی کا ہاتھ نہ بڑاؤ کی۔“ انا دو اسبھانے لگیں۔

”وہی کہیں بیویاں بادشاہ زادیاں بھی چھروں پر سے بھلتی ہیں۔ لوطیوں اور پاندیوں کو بھلاؤ اور آپ سر دیکھو۔“ چلو بی میں تمہارے بھلا سڑوں میں نہیں آتی ”ہم تو آپ ہی بھلیں گے۔“ شام ہو گئی۔ جھوٹی نے آواز دی ”خبردار ہو بادشاہ سوار ہوئے۔“ وہ سب کچھ پیچک پھاٹک سواری کے ساتھ ہو گئیں تو کریں چا کریں گھڑی صغریٰ سمیت سنبھال پیچھے الودھ کرتی دوڑیں۔¹²
 اور ذرا دلی کے غنائے والوں کی صدا نہیں سنے۔

گھڑی کے ہر پیچھے والے کی صدا۔۔۔ گھوگھٹ دانی نے تو اُسے ہیں ہر لگ گیا کانا بکھر گئے ہر قالوں کے لیے۔۔۔ سانولے سلونے لگا دیئے ہیں شربت کو اووے اووے جو بن والے شربت کہ گھڑی والا۔۔۔ کیا سطر ہیں گھڑیوں پڑے کی۔۔۔

گھڑیوں کے لیے۔۔۔ لٹلی کی انگلیاں ہیں مجنوں کی پیلیاں ہیں کیا خوب گھڑیاں ہیں پیسے کی دو۔
 آموں والا: شرطیہ بڑے دانہ کرانہ کالندو۔ آم کی پالی ہے یہ پالوں والا لندو لو۔
 چامنوں کے لیے: کافی بھونزا چامنیں لون والا چھکین لے۔
 تربوز کے لیے: لال کاڈلا لال کاڈلا کالوں میں آ جا چھکوں سمیت قند کے ڈالے ہیں۔ رنگ کے گھڑے ہیں۔

پان والا: کستوں کو شرماتی ہے جو بن کو چکاتی ہے۔ اچھے منہ کو جاتی ہے۔ گوری جب چباتی ہے۔
 ہونڈوں آگ برساتی ہے۔ لے لگوری گوری کے لیے۔¹³

اور یہ ان خواتین کو دیکھنے خیر سے روزہ دار ہیں۔ افخاری تیار کرتے کرتے ایک دوسرے سے الجھ پڑیں۔

ایک: ”اے بی کیوں اپنا روزہ بگاڑ رہی ہو؟“
 دوسری: ”چلو بی چلو بی۔ تم اپنے روزے کی خیر مٹاؤ۔ بڑی آئیں وہاں سے۔“

بھلی: ”اے بھئی تم سے تو بات کرنی بھی غضب ہے۔ میں نے کچھ کیا بھی ہو؟ روزہ رکھو خدا کا لور
 غم تو زیندوں پر۔“

دوسری: ”میں کبھی ہوں میرے منہ نہ لگتا ہاں ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔“

بھلی: ”اے تاج محل میرے پیچھے پٹے بھاز کر پڑ گئی ہے۔ لڑکی ہے کہ بھاز کا کاغذ۔“

دوسری: ”بس اپنی بس منہ سنجال کر بات کرو۔ ابھی ساری شغلی کرکری کر دوں گی۔“

تیسری: ”اے بی تم بھی کس سے الجھ رہی ہو۔ اس کے سر پر آج شیطان چڑھا ہے۔ چلو چلاوے
 اپنے بچے میں آپ کھولے دو۔“

حوالہ جات

- 1- نثار غالب، محمود نثر غالب مرحومہ، خلیل الرحمن داؤدی۔
- 2- چراغ دہلی از مرزا حیرت دہلوی۔ تاریخ ادب اردو از رام بابو سکینہ۔
- 3- مرحوم دہلی کالج از مولوی عبدالحق۔
- 4- تاریخ ادب اردو از رام بابو صاحب سکینہ مترجم مرزا احمد عسکری۔ مطبعہ فنی نوکلشور، کلکتہ۔
- 5- چراغ دہلی مرزا حیرت دہلوی۔ گردن پر لیس، دہلی۔
- 6- قادیانہ غالب۔ پنجاب یونیورسٹی لا ہور ۱۹۶۹ء۔
- 7- قطب عالم غالب مرحومہ، قلام رسول میر۔
- 8- ۱۱۵۸ ایضاً۔
- 12- بزم آغرا، فنی فیض الدین۔ اردو اکادمی، دہلی۔
- 13- دلی تھاجس کا نام از انتظار حسین۔ سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور۔ اجزا اولیٰ و دوم از شاہد احمد دہلوی۔
- 14- اجزا اولیٰ و دوم از شاہد احمد دہلوی، مکتبہ انجمنی، کراچی۔

انیسویں صدی کی دہائی کے کچھ بڑے شاعر

ہند را خوش نصیبانند سخود کہ بود
بادور خلوت شاہ ملک فطال از دم شاہ
مومن و نیر سہائی و علوی دانگاہ
حسرتی اشرف و آردوہ بود اعظم شاہ

(غالب)

زبان فارسی ہوا اردو ادب کا ایک بڑا حصہ درباروں کی سرپرستی میں تخلیق ہوا ہے۔ انسان فطرتاً خوشامد پسند واقع ہوا ہے۔ خوشامد ترقی کا ایک ذریعہ تھی۔ غل الہی کے قصائد اور درج اور ان کے اعداد کی ذمہ دہی..... بادشاہ دربار میں شعراء کی قدر دہائی اور سرپرستی کرنے لگے۔ ملک الشعراء اور سلطان الشعراء کے خطابات دیئے جانے لگے۔ شاعر اور درباری دونوں ایک دوسرے کی ذہنت بڑھانے لگے اور لازم و ملزوم ہو گئے..... انہیں ملکی دین ملوکہم..... بادشاہ کی دیکھا دیکھی والیاں ریاست امراء و اہمیان سلطنت بھی اپنے درباروں کو اہل سخن کے ساتھ ذہنت بخشنے لگے۔ اہل سخن کی قدر دہائی اور عزت افزائی کی جانے لگی۔ شعراء کے کرام فکر محاش سے آزاد ہو کر تمام تر توجہ متابع و بدائع کو انہیں تخلیقات اور مضامین نو پر مہذول کرنے لگے۔ شہر لوگان والیاں ریاست اور امراء خود بھی شاعری کرنے لگے۔ کچھ ہندو دیگرے عقائد مسلکی کے تین تخت نشین شاعر ہوئے تو پھر ایسا ہونا ہی تھا۔ کسی بڑے استاد کا شاگرد ہونا امراء کے لیے باعث افتخار سمجھا جانے لگا.....

لیکن یہ آدھا جگ ہے ایک اور ادارہ بھی تھا جو شعرو سخن کی پرورش کر رہا تھا۔ یہ تھیں صوفیوں کی خانقاہیں..... دربار سے تو خواص کا تعلق ہوتا ہے..... صوفی کا در تو ہر ایک کے لیے کھلا ہوتا ہے اور ہر وقت کھلا ہوتا ہے۔ عوامی شاعری لوگ شاعری تادیر پاتی رہنے والی زبان زد عام ہونے والی اور قبولیت عام کا ادب حاصل کرنے والی شاعری خانقاہوں میں پرورش پا رہی تھی..... جنوبی ہند کا شعر ادب انہی صوفیوں فقیروں درویشوں کے ہاتھوں پر وہاں چڑھا لایا مشاء اللہ۔ خود دبستان دہلی میں خواجہ میر درد کو کون نظر انداز کر سکتا

ہے۔ میر نے اگرچہ انہیں آدھا شاعر مانا لیکن مانا تو سہی۔۔۔۔۔ دہائی کا کون سا شاعر تھا جس کے کلام پر یہ خانقاہی رنگ نہیں چڑھا۔۔۔۔۔ خود حضرت ابو القاسم سراج الدین محمد بہادر شاہ غازی کی ایک غزل ملاحظہ فرمائیے۔

یہ دنیا ہے اوجھٹ گھائی چپ نہ بہت پھیلاؤ گی
اسنے ہی پھیلاؤ کر جس کے سکھ سے دکھ نہ پاؤ گی
اس دنیا کے جتنے دھندے سگرے گورکھ دھندے ہیں
ان کے پھندے ہانہ چڑو تم ان میں نہ من الہیاد گی
یہ منا ہے سورکھ لو بھی سب ہی پر الہائے ہے
جانو ہو تو اس سورکھ کو جیسے بنے سجھاؤ گی
مر اکارت تم نے کھوئی کچھ تو ادھر کا دھیان کرو
بہت مٹی اور تھوڑی رہی ہے یہ بھی نہ پوچی گھاؤ گی
کیسے نہ بھولا اس کو فقیر جو صبح کا ہر شام کو آئے
پھوڑے کے سگرے جھڑے اپنے رب سے دھیان لگاؤ گی

یہ فقیر جس مہدی دہائی کا ذکر کر رہا ہے اس میں شعراء کا ایک بڑا طبقہ دربار اور اہل دربار سے وابستہ تھا۔ یہ مہدی دہائی کا دور تھا۔ خوشحالی کا دور تھا۔ لوگ کھلی تھے۔ بادشاہی احمد شاہی امرہند گروی روہیلہ گروی سے نجات مل چکی تھی۔ تاجراہل حرفہ کسان فنکار کوئی بھی طبقہ مالی بھری کا شکار نہ تھا۔ دہائی کی خانقاہی تہذیب کے بے نقش و نگار بننا شروع ہو گئے تھے۔

انہوں کو اس مہدی دہائی کے آغاز سے چند برس قبل حضرت میر۔۔۔۔۔ میر تقی میر۔۔۔۔۔

چور اچھے سکھ مرچے شاہ گدا سب خواہاں ہیں کہتے ہوئے اودھ جا چکے تھے۔۔۔۔۔ اور وہاں بیٹھ کر پارس کے سادھوؤں کو اپنے اس اجڑے دربار کے فضائل سنارہے تھے کہ جہاں ختب روزگار لوگ ہی رہتے آئے تھے۔ میر تقی میر چلے گئے۔ خواجہ میر درد رہ گئے۔ لیکن وہ فقیر خانقاہ نشین تھے۔ شاہ نصیر دہلوی تھے جو استاد شاہ کے بھی استاد تھے لیکن ۱۸۰۴ء میں دہلی واپس چلے گئے۔^۳

شاہ نصیر الدین نصیر نقشبوتی عرفیت کلومیماں ایک گوش نشین فقیر شاہ غریب کے فرزند میر محمد علی بادل کے شاگرد سنگار زمینوں کے شاعر "عجب عجیب طرز میں نکالتے" ہر ماہ کی چندہ اور آفتاب کو مٹا کر بے منتقد کرتے تھے۔ خانہ دانی و جاہات اور شاعری کی وجہ سے شاہ عالم کے دربار میں رسائی ہو گئی خوب قدر دانی ہوئی انعام و اکرام سے سرفراز ہوتے تھے۔ سیاحت کے شوقین تھے۔ بہت بڑے گوشا تھے۔ ساٹھ سال شاعری کی مگر انہوں کو کڑا کلام تک ہو گیا۔

بادہ کشی کے سکھاتے ہیں کیا ہی قرینے سادہ بھادوں

کیفیت کے ہم نے جو دیکھا دو ہیں مینے سادہ بھادوں^۸

حکیم عزت اللہ محقق تھے حکیم قدس اللہ قاسم کے فرزند تھے۔ والد کے علاوہ حکیم شاہ اللہ فریق سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ حافظ قرآن علمیات میں بے غلطی طبعا ظریف اساتذہ فن میں شمار تھا۔ کہتے ہیں شاہ ظفر کے استاد بھی رہے تھے۔^۹

میر کاظم حسین بے قرآن شاہ نصیر کے شاگرد تھے۔ استاد ذوق کے ہم پیش اور ہم سن ولی عہد کے استاد رہے پھر انگریز کے لوگر ہو گئے۔ مشرق جان الفطن صاحب بہادر کے میر فنی ہو کر فکار پور سندھ چلے گئے۔^{۱۰} شیخ ابراہیم ذوقی سپاہی زادے تھے۔ والد شیخ محمد رمضان نواب لطف علی خان ریکس دہلی کی حرم سرا کے خادم تھے۔... ابتدائی تعلیم کے لیے ایک صاحب حافظ غلام رسول کے سپرد کیے گئے جو معمولی درجہ کے شاعر بھی تھے۔ ذوق استاد کے ساتھ مشاعروں میں جایا کرتے۔ اشعار میں کڑاؤ کر لیتے۔ بار بار بڑھا کرتے پھر خود شعر کہنے لگے اور حافظ غلام رسول کو دکھانے لگے۔ میر کاظم حسین ہم عصر اور ہم درس تھے۔ ان کے ساتھ جا کر شاہ نصیر کے شاگرد ہو گئے۔ استاد سے ناراض ہوئے پھر کسی کو کلام بغرض اصلاح نہیں دکھایا۔ میر کاظم حسین کے ساتھ قلعہ معلیٰ کے مشاعروں میں شریک ہوا کرتے۔ ان کے سندھ جانے پر دلی عہد کے کلام کی اصلاح کی ذمہ داری ذوق کے سپرد ہو گئی۔ چار روپے ماہوار مشاہرہ مقرر ہوا جو بڑھتے بڑھتے سو روپے ماہوار تک جا پہنچا۔ ایک قصیدے کے صلے میں باہمی مسودہ لفظی عطا ہوا۔ ایک دوسرے قصیدے کے صلے میں ایک گاؤں بطور جاگیر عطایت ہوا۔... لیکن سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ عمر بھر ایک تنگ گلی کے اندر ایک معمولی سے مکان میں رہے۔ نماز روزہ اور ادب و عارف کے پیشی سے پابند تھے۔ بیشتر کلام قدر میں خالص ہو گیا۔ حیدر آباد دکن سے دعوت ناما یا تو مسدوس کر لی۔

ان دنوں گرچہ دکن میں ہے بڑی قدر سخن

کون جائے ذوق پر دلی کی مکیاں چھوڑ کر

۱۸۹۸ء میں ابو ظفر سے وابستہ ہوئے اور ۱۸۹۵ء میں اپنی وفات تک ان کا دامن نہ چھوڑا۔^{۱۱}

ذوق کی وفات کے بعد کلام مشائی کی اصلاح کی ذمہ داری غالب نے سنبھالی۔

یہ بھی کہا گیا کہ ظفر کا معتدب کلام دراصل استاد ذوق کی فکر سخن کا نتیجہ ہے۔ شاگرد ذوق مولوی محمد حسین آزاد اس تاثر کو ہمیشہ عام کرتے رہے۔ اس پر سر سید احمد خان نے خوب تبصرہ کیا:

”وہ شاہ کا کلام تو کیا لکھتا قلعے کے تعلق سے خود ذوق کو زبان آ گئی۔“^{۱۲}

اور اگر قلعہ معلیٰ کے ایک پیرودہ حکیم غالب کے بچا زاد بھائی نواب شمس الدین کے فرزند نواب مرزا خان داغ کی زبان ملاحظہ کی جائے تو سر سید احمد خان کے کہے پر ایمان لائے بنا چارہ نہیں رہتا۔ حضرت

فراق کو کچھ دیر تو سرسید سے بھی چند قدم آگے بڑھ جاتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

”اردو شاعری کی تاریخ اور ردائوں میں جو فائدے استادوں نے شاعروں سے اٹھائے ہیں۔ وہ ہمیشہ صیغہ ناز میں رہے اور تقریر کوئی معمولی شاعر نہیں تھا۔ وہ ذوق کی شاعری اور شاعرانہ ذہنیت کی فقہا بن گیا تھا۔“

نواب نصیر حسین خیال لکھتے ہیں: ”قلم صعلی کی زبان کے حوالے سے دیکھا جائے تو تقریر اور ذوق کی زبان میں دلی فرق ہے جو شاہ و گدما میں ہوتا ہے۔“ (بہادر شاہ ظفر از اسلم پرویز)

عظیم مومن خان موسیٰ عظیم غلام نبی کے فرزند تھے۔ دادا عظیم نامدار خان کشمیر سے آئے اور شاہ عالم کے زمانے میں شاعری طبعیوں میں داخل ہوئے۔ چند مواضعات جاگیر میں پائے۔ انگریز کی راج آج تو بخش مقرر ہوئی جو مومن کو بھی ملا کرتی تھی۔ باپ اور بچا سے طبابت بھی۔ ذہانت، لطافت اور استعداد شعر بچپن سے تھی۔ ملا کا حلقہ رکھتے تھے۔ نجوم میں بھی مہارت تھی۔ شطرنج کے پاکمال کھلاڑی تھے۔ زیادہ تر کلام عاشقانہ رنگ میں ڈوبا ہوا ہے اور ایسا ان کے مزاج کی مناسبت سے ہے۔ خاصا عاشقانہ مزاج پایا تھا۔ درباری بن اور خوشامد سے لکرت تھی۔ ان کا دیوان مدح و تعائد سے بکسر خالی ہے سوائے ایک قصیدہ کے جو راجا پٹیل کی مدح میں ہے۔ تاریخ گوئی میں یہ طبعی حاصل تھا۔ ۱۸۵۲ء میں چھت سے گر کر جاں بحق ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی ہشٹین گوئی کر چکے تھے۔“

میر و سودا کے کلی شاعر مدح و تقریر میں غلغلی میں موجود تھے۔ مرزا عظیم بیگ، مہاں بھلیا، میر غالب علی سید، قمر الدین، مشت، نربان الدین، آرزو، میر نظام الدین، منوں، عبدالرحمن، احسان، الہی بخش معروف، عظیم آغا جان پیش.... یوں اہل سخن کی ایک کھکشاں جگر کاٹی۔ مٹی اور روشن ستارے امام بخش صہبائی اور صدر الدین آرزو، ابھرتے اور پھر مہتاب و آفتاب مومن و غالب طلوع ہوئے۔

انہوں نے دلی کو ہندوستان کا شیراز بنا دیا.... ان کے بعد مٹی اور انجم طلوع ہوئے۔ احمد حسین میکیش، ضیاء الدین احمد نیر خٹاں، نواب مصطفیٰ خان شیخ، غلام حسن خان ٹھوڑیں، العابدین عارف، حسین علی خان شاداں، قربان علی بیگ، سالک....

پادشہ بختر حسام الدین حیدر خان میرزا احمد غیاث کے فرزند، ذوالفقار الدولہ نجف خان کے داماد.... مبارز الدولہ ممتاز الدولہ، حسام الدین حیدر خان، بہادر حسام بیگ، نائی گلشن، میر مستحسن طبع اور میر تقی میر کے شاگرد غالب کے بزرگ دوست غالب کے خسر الہی بخش خان معروف کے بھی دوست۔ معروف نے کہا:

جو تم آؤ میرے مہاں حسام الدین حیدر خاں

کروں دل نذر جاں قرباں حسام الدین حیدر خاں

مولانا حالی لکھتے ہیں کہ حسام الدین حیدر خاں نو عمر اسد کی ایک قول بکھنولے گئے اور اپنے استاد کو



بہادر شاہ ظفر، تخت نشینی کے بعد



ملکہ زینت الملک، عہد شباب میں

دکھائی۔ میر نے پڑھ کر کہا: ”اگر اسے کوئی احتساب کیا تو لا جواب شاعر بن جائے گا اور نہ مکمل کچلے گئے گا۔“^{۱۱}
عالم کہتے ہیں کہ انہوں نے گیارہ سال کی عمر میں شعر کہنا شروع کیا یعنی ۸۰۷ء میں جبکہ حضرت میر نے ۱۸۱۰ء میں لکھنؤ میں انتقال فرمایا۔ لہذا عالم کے بیان پر یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔
اس عہد کے ایک اور بڑے شاعر تھے داغ۔

نواب مرزا خان داغ ۱۸۳۱ء میں دلی میں متولد ہوئے۔ آپ نواب شمس الدین خان دہلی فیروز پور ہسولہ کے فرزند تھے۔ والد علیم فرخ دے گل کے انعام میں سولی چڑھا دیے گئے۔ بعد ازاں والدہ نے بہادر شاہ ظفر کے فرزند میرزا اختر دے صفدر کو لیا۔ حکومت گل کا خطاب پایا۔ یوں چھ سات سال کی عمر میں داغ قلعہ سٹی میں وارد ہوئے۔ شہزادوں کی طرح پرورش پائی۔ سوجیلے والد علی عہد میرزا اختر و حضرت ذوق کے شاگرد تھے چنانچہ داغ بھی ان کے شاگرد ہو گئے۔ مولوی احمد حسین صاحب سے عربی اور مؤلف غیاث اللغات مولوی غیاث الدین سے فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ اس دور کے رواج کے مطابق خوش نویسی شہسوار کی پاک اور پنے کی تربیت بھی حاصل کی۔ ۱۸۵۶ء میں میرزا اختر و انتقال کر گئے۔ ۱۸۵۷ء میں قلعہ سٹی اجڑ گیا چنانچہ داغ خاناس برادر ہو کر رام چلے گئے۔ دلی رام پور نواب یوسف علی خان نے قدر دانی کی۔ ولیعہد نواب کلب علی خان کے مصاحب مقرر ہوئے۔ داد و مصطل کی خدمت بھی ان کے سپرد ہوئی۔ نواب یوسف علی خان اور نواب کلب علی خان دونوں عالم سے اصلاح لیا کرتے تھے اور عالم کو تحفہ بھی عطا کرتے تھے۔^{۱۲}

۲۷ جولائی ۱۸۶۸ء کو نواب کلب علی خان کے نام ایک خط میں عالم لکھتے ہیں:
”میں نے کل ایک خط نواب میرزا خان کو لکھا ہے خدا جانے وہ حضرت کی فکر سے گزرے یا نہ گزرے۔“^{۱۳} داغ نے ۳۳ سال نواب کلب علی خان کی مصاحبت میں گزاری۔
نواب کے ہمراہ دلی پہنچے اور لکھنؤ کے سفر کیے۔ حج و زیارات سے مشرف ہوئے۔ ۱۸۸۶ء میں نواب کلب علی خان انتقال کر گئے تو داغ دلی چلے گئے پھر دو سال مختلف مقامات کی سیاحت کی۔ آخر ۱۸۸۸ء میں حیدرآباد پہنچے۔ حکام کے استاد مقرر ہوئے۔ ”مقرب السلطان ٹیبل ہندوستان جہاں استاد عالم یار جنگ دیر الدار فصیح الملک“ کے خطاب پائے۔ پھر مرتے دم تک وہیں رہے۔ ۱۹۰۵ء میں انتقال ہوا۔ حیدرآباد میں ہی دفن ہوئے۔

چار دیوان تحریر کیے۔ تکرار داغ، آفتاب داغ، مہتاب داغ اور یادگار داغ۔^{۱۴}
ان کا کلام فصیح اور مختلف سے خالی صنائع و بدائع کی کثرت اور حشو و زوائد سے پاک ہے۔ ملاحظہ ہو حد و سبج تھا۔ مساکل دہلوی، بخود دہلوی، احسن مار دہلوی، نوح ناردی، آغا شاعر دہلوی، بھگ مراد آبادی۔ حضرت علامہ سابقا فرما گئے ہیں:^{۱۵}

مجھے بھی غم ہے شاگردی داغِ سحر اس کا

غالب چودھری عبدالغفور سرور کے نام ایک خط میں اپنے عہد کے چند شعراء کے کلام کی تعریف کرتے ہوئے رقمطراز ہیں۔¹⁶

”وہ چیز دیگر“ مجھے میں پارسوں کے آئی ہے۔ ہاں اردو زبان میں اہلِ ہند نے وہ چیز پائی ہے: میر تقی میر (رحمہ):

بدنام ہو گئے جانے بھی وہ امتحان کو
رکے گا کون تم سے عزیز اپنی جان کو

سورہ:

دکھائیے لے جا کے تجھے مصر کا بازار
خواہاں نہیں لیکن کوئی داس جنسِ گراں کا

قائم:

تجھ سے طلب ہوئے کی؟ کیونکر بانوں
ہے تو تاروں مگر اتنا ہدّاموز نہیں

مومن خان:

تم مرے پاس ہوتے ہو مگر
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

مومن کے اس شعر کے بدلے تو غالب اپنا دماغ دینے کو تیار بیٹھے تھے۔

۱۳ مئی ۱۸۵۴ء کو مومن کی وفات ہوئی تو غالب نے لکھا۔¹⁷

شرطت روئے دل خراشم ہم مر
خوں ہم پہ رخِ زویدہ پاشم ہم مر

کافر ہاشم اگر پہ مرگ مومن
چوں کعبہ سید پیش ہاشم ہم مر

غالب کہا کرتے تھے: ”مجھے نہ تو تاریخ سے کوئی دلچسپی ہے اور نہ معنی کو چھوڑ کر محض لفظی صورت گری میرا شوق۔“ (نامِ جانِ جاگوب بہادر)¹⁸

لیکن اپنے حریفِ ذوق کی تاریخ و فضاں نکالی اور کیا خوب نکالی۔

گویدہ رفتِ ذوق ز دنیا ستم برد
کاں مگر ہر گراں پہ تہِ غشتِ دکلِ نہد

تاریخ فوت شیخ بود "ذوق جلتی"
بقول سن رواست کہ احباب دل نہند¹⁹

۱۲۷۱ ہجری

حواشی

- 1- بہادر شاہ ظفر از اسلم پریز
- 2- ایضاً
- 3- تاریخ ادب اردو از رام بابو سکینہ۔
- 4-5 بہادر شاہ ظفر از اسلم پریز۔ تاریخ ادب اردو از رام بابو سکینہ۔
- 6- تاریخ ادب اردو از رام بابو سکینہ۔
- 7-8 بہادر شاہ ظفر از اسلم پریز۔
- 9- تاریخ ادب اردو از رام بابو سکینہ۔
- 10- غالب و دیوان خاندان کالی داس گیتا رخصا۔
- 11- یادگار غالب از الطاف حسین حالی۔
- 12- غلطوط غالب قلام رسول مہر۔
- 13-14 تاریخ ادب اردو از رام بابو سکینہ۔
- 15- اردو شاعری کا تنقیدی مطالعہ سنیل لکھر۔
- 16- غلطوط غالب مرتبہ قلام رسول مہر۔
- 17- کلیات قادری غالب۔
- 18- بیچ آجک۔ ترجمہ ڈاکٹر خوبر احمد طوی۔
- 19- کلیات قادری غالب۔

دلی کا آخری بادشاہ

پلے دو مرشدوں کو قدرت حق سے ہیں دو طالب
نظام الدین کو خسرو سراج الدین کو غالب
”حق سبحان ہمیشہ سلامت رکھے حضرت شہنشاہی حق شناس حق آگاہ سراج الملک والدین ابوظفر
بہادر شاہ کو جو لباس بادشاہی میں یاد آگئی کر رہے ہیں۔“

شاہی ”دور و پیش ایسی جا باہم است
بادشاہ عہد قلب عالم است“

دلی کے آخری بادشاہ خانہ غلام علیہ کے آخری تاجدار سراج الدین ابوظفر محمد بہادر شاہ جانی ابراہیم
مبین الدین اکبر شاہ جانی کے فرزند ارجمند تھے۔ ۵۷۷ھ میں متولد ہوئے۔ ۱۸۳۷ء میں تخت نشین ہوئے۔
خود کے بعد ۱۸۵۹ء میں رنگون جلاوطن کر دیے گئے جہاں ۱۸۶۲ء میں انتقال ہوا۔^۳

شاعر ”عالم صوفی“ خوش نویس ”شہسوار شمشیر زن“ تیرا انداز نشانہ باز غرض ہے شمار خوبیوں کا مجموعہ
تھے۔ ان کا ذکر مبارک یوں تو اس کتاب میں مختلف مقامات پر آچکا ہے لیکن ناموزوں نہ ہو گا کہ ایک باب
انگ سے اس باہمت بزرگ پر قائم کیا جائے جس نے جوانی سے لے کر عہد بھری تک ناموافق حالات کا سامنا
کیا اور بہت عزم و ہمت سے کیا۔ ولید غازی کے دور میں شاہ جہاں جیسی بادشاہی کا نمونہ پیش کیا اور اس عہد
شباب میں بھی تو والد کی طرف سے تعدی و حق تلفی کا شکار رہے اور اپنے حق و ملی عہد کے لیے جدوجہد کرتے
رہے اور جب متعلیٰ میں حالات نے انہیں دنیا کی سب سے بڑی اور منظم قوت کے خلاف جنگ لڑنے پر مجبور کیا
تو انہوں نے اس چیلنج کا سامنا بھی جو امر دلی سے کیا۔ صوبیدار بخت خان جیسے کمانڈر کے ساتھ گزارا کیا اور دلی
کا دفاع کرتے رہے۔ وہ بادشاہ کو جس کے سامنے وقت کی سپر پاور کے نمائندے کو پیش بھالاتے تھے۔ جب
صوبیدار کے ان چار پور دلی سپاہی دربار میں اس کے ساتھ بدتمیزی سے ”بوصوہم نے تمہیں باسا کیا“ جیسی
باتیں کرتے ہوں گے تو وہ انہیں برداشت کرنے کا حوصلہ کہاں سے لاتا ہوگا۔

اور جب ۱۸۵۵ء کو معزول بادشاہ کے سامنے اس کے تین شہزادوں مرزا افضل، مرزا ابوبکر اور ناصر سلطان مرزا کے سر میں قصاب نے پیش کیے تو عزم و ہمت کے اس پیکر نے کہا تو صرف یہ کہ ”اگلدتہ تیموری شہزادے سرخرو ہوئے۔“

خود کے بعد قلعہ معلیٰ ایک جگہ دھارک کوٹھڑی میں ایک برطانوی نامہ نگار رسل نے اسے کس سال میں دیکھا۔

”جہاں ہم اس وقت کھڑے تھے۔ وہ ایک جگہ دھارک راستہ تھا جو ایک کھلے صحرائے کی طرف جاتا دکھائی دیتا تھا اور اس سے آگے ایک کوٹھڑی تھی جو اس جگہ سے بھی زیادہ تاریک تھی۔ اس جگہ ایک ٹیلف و خوار بڑا خاص گھنٹا گزرا ہوا تھا۔ جسم پر میلہ پھیلا ہوا تھا کہ کمر پر چھوٹی سی ایک ٹوپی منظر میں ہوتی پاؤں نیچے ہم غلط وقت پر آئے تھے۔ اصل میں معزول بادشاہ بنا رہا تھا اسے قے آ رہی تھی۔ قے کرنے کی کوشش میں وہ سامنے رکھے پتیل کے قے پر جھک کر بالکل دوہرا ہو گیا تھا۔“

اسی قلعہ میں یہ بادشاہ بھی اس انداز میں بھی رہتا تھا۔ مفتی فیض الدین کی زبان سے:

”دیکھو یہ چاندی کا تخت، گردنہرا پشت پر تکیہ آگے تین بیڑیاں نیچے پایوں میں کیسے خوبصورت

پھول بنے ہوئے تھے۔ اوپر کرکری تاش کا تخت پوش چڑا ہوا تھا۔ دائیں طرف ملکہ کو داں اپنی مسند پر سر سے پاؤں تک سولے سو تکیہ ہر میں ڈال دیں۔ تاک میں تھو جس میں چڑا کے اٹھنے کے برابر سوتلی چڑے ہوئے ہیں، پہننے بیٹھی ہیں۔ ان کے برابر اور بیڑیاں اپنی اپنی سوزینوں پر گھبراہٹ سے تاک میں تھیں ڈالے بیٹھی ہیں۔

دائیں طرف شہزادوں کا دستار گار کیسے سر سے پاؤں تک گھنے میں لپی ہوئی بیٹھی ہیں۔ سامنے صفیائیں تڑکیاں، قلعہ قباں اور دیکھائیں، حوصلہ سرائے، خیر سرائے، جڑیں پکڑے سو ب کھڑے ہیں۔ بادشاہ محل میں داخل ہوئے جو بیٹھی نے آواز دی، خبردار ہو، سب جگہ تیس سرفردہ کھڑی ہو گئیں بھرا کیا۔ تخت پر سے تخت پوش خوجوں نے

اٹھایا۔ کہاریوں نے ہوا دار تخت کے برابر لگا دیا۔ بادشاہ تخت پر بیٹھے۔ خوب سرائے سو ب محل سے کر تخت کے برابر کھڑے ہو گئے۔ پہلے ملکہ کو داں نے کھڑے ہو کر بھرا کیا۔ نذر دی بھرا کر کے بیٹھ گئیں۔ اب بیڑیوں اور شہزادوں نے اسی طرح اپنے اپنے رتبے سے نذر دیں۔ بادشاہ نے سب کو بھاری بھاری دوپٹے

حیثیت کے موافق اپنے ہاتھ سے دیے۔ سب نے کھڑے ہو کر دوپٹے لیے۔ بھرا کیا نذر دیں۔ اب تاج گاہ کا شروع ہوا۔ ایلو تاپنے والی تو اندر بادشاہ کے سامنے تاج رہی ہے اور سارا نذر سرفردے کے پیچھے کھڑے خلیفہ سادگی حال کی جوڑی بھرا ہے ہیں۔ جان درں خان آئے دو چار تائیں ان کی نیس۔ لو اب خاصے کی تیاری

ہوئے لگی۔ دربار برخواست ہوا۔ تاج گاہ متوقف ہوا۔ بادشاہ نے خاصہ نوش فرما کر سکھ کیا۔ تیسرے پہر سب اسی طرح اکٹھے ہو گئے۔ بادشاہ مسند پر آگے بیٹھے۔ مٹھائی کے خوان اور آٹھ قابیں مٹھائی کی ایک چاندی کی کشتی میں بلا اساطیر و پان کے چڑے ہری و ب، مصری کے کھڑے چاندی کا چھلرا رکھا ہوا پر گولابی کشتی پوش

کھا بنی مہاراجہ اور جیسوسی نے عرض کیا "حضرت صاحب تحریف لائے" بادشاہ سر دتہ تعظیم کو کھڑے ہو گئے مند پر بٹایا۔ حضرت صاحب نے پہلی ایک قاب پر حضرت علیؑ کی اُدھری حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تیسری پر حضرت فاطمہؑ کی چوتھی پر حضرت امام حسن حسینؑ کی پانچویں پر بڑبڑ دلی کی چھٹی پر بابر بادشاہ کی ساتویں پر اوتوں کی آٹھویں پر پریوں کی نیا دلی۔ حضرت فاطمہؑ کی نیا دلی سوائے بی بی زینوں کے بابر بادشاہ کی نیا دلی سوائے ان کی اولاد کے اور پریوں کی نیا دلی سوائے پارسا عورتوں کے اور کسی کو نہیں ملتا اور باقی سب کی نیا دلی کا سب کو تقسیم ہو جاتا ہے۔ دیکھو حضرت صاحب نے کشتی میں سے نکلا وہ نکلا۔ پہلے بسم اللہ الرحمن الرحیم کہہ کر ایک گره اس میں لگائی۔ دوسری گره میں پان کا بیڑہ باندھا تیسری میں ہری دوب مصری کی ڈلی چوتھی میں چاندی کا چھلا باندھا پانچویں گره بادشاہ کے سر سے چھو کر اس نکلا دے میں لگائی۔ سب نے کھڑا ہو کر بھرا کیا۔ مبارکباد دی۔ ایک سال یہ بزار سال اور خدا نصیب کرے سال گره کے شاہ ہانے بچتے گئے۔ اب میرٹھ بھرتک ہر پانڈو میں خلعت انعام ناچ رنگ مہاراجی اسی طرح ہوگی۔"

شاہ ظفر کی متوجہ غلیباں بیان کرتے ہوئے راقم اللہ غلیہ دہلی لکھتے ہیں:

"حضرت بادشاہ غلیہ میں میرا نام علی شاہ صاحب مرحوم کے شاگرد رشید تھے۔ دونوں بزرگوار

غلیہ نہیں لگ جاتی تھے۔ دلی میں اس لن کے جتنے غلیہ نہیں تھے میرے والد کے پادشاہ کے شاگرد تھے۔"

بہادر شاہ کی شہسوار اور مصری کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مشہور ہے کہ ہندوستان میں ڈھائی سوار تھے ایک بہادر شاہ دوسرے آپ کے بھائی مرزا

جہانگیر جنہوں نے انگریزوں سے شرط بد کردہ آباد کی ملتی کھڑے سے کھد دلی تھی اور نصف سوار کوئی مرہٹہ

مشہور تھا... حضور انور جیسے شہسوار تھے اسی درجہ مصر بھی تھے۔ کھڑے کے عجیب و صواب وقوم دور سے دیکھ کر بتا

دیتے تھے اور ہر قوم کی عادت و سیرت سے اذروے تجربا گاہ تھے۔"

بہادر شاہ کی فتون اور طاقت جسمانی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"ہندوئی ایسی لگاتے تھے کہ بایہ و شاہ بال ہندو حائنانہ اڑاتے کبھی ننانہ خطانہ کرتا۔ بارہا ایسا

دیکھنے میں آیا ہے کہ جانور اڑتا ہوا جاتا ہے ہوا اور پر ہندو دھری ہے اٹھائی اور جھونک دی پھٹائی کی

حاجت نہیں لوٹ پوٹ ہوا اور دریا میں آ رہا۔ دریا میں پھلی یا مگر نے منہ نکالا گولی فخرین پر پڑی اور چت

ہو گیا۔"

"میرا انداز میں آپا سنگھ کے شاگرد تھے۔ جوانی میں حیر اندازی کی مشق بدھانے کو دیوان خاص

میں ایک جڑتھل لگا رکھی تھی۔ میں سن جنوں کی پوٹ نیچے لگی تھی۔ جڑتھل کے ذریعے اسے چکی سے کھینچا کرتے

تھے۔ میں ناک کمان کھینچنے پر قادر تھے اچھی کمان کو کھادہ جا کر پھینک دیتے تھے۔"

"شہسیر زنی میں میرا مدد علی صاحب کے شاگرد تھے۔ علی مد کی کثرت جو حضرت علی مرتضیٰ شیر خدا کی

ایہا ہے وہ ان کے گمراہی کی میراث تھی۔ میں نے اپنے والد سے سنا ہے کہ بادشاہ تاجا آٹھ آدھوں کے مقابل یکدم کمر بستہ کرتے تھے اور آٹھ آدھوں کی برائیاں پر چوٹ کرتے تھے اور بادشاہ سب کے دائرہ دیکھتے تھے اور اپنی چوٹ چھوڑتے جاتے تھے۔^{۹۰}

کثیر المولاد تھے۔ ۳۳ فرزند ان اور ۳۴ دختر ان ان کے ہاں متولد ہوئیں۔ فرزند ان کے اسماء درج

ذیل ہیں۔^{۹۱}

۱۔ مرزا محمد امرا بخت بہادر میران شاہ ولی عہد اول

۲۔ مرزا محمد شاہ درغی بہادر وزیر اعظم و نقار و عام

۳۔ مرزا اکبر مرث بہادر ولی عہد دوم

۴۔ مرزا سلطان فتح الملک بہادر ولی عہد سوم

۵۔ مرزا محمد قوش بہادر

۶۔ مرزا نصیر الدین عرف مرزا مٹل بہادر

۷۔ مرزا فرخندہ شاہ بہادر

۸۔ مرزا نصیر سلطان بہادر

۹۔ مرزا بختیار شاہ بہادر

۱۰۔ مرزا اسرار بہادی بختی بہادر

۱۱۔ مرزا ناصر بہادر

۱۲۔ مرزا محمدی بہادر

۱۳۔ مرزا عبداللہ بہادر

۱۴۔ مرزا اکوچک سلطان بہادر

۱۵۔ مرزا شاہ عباس بہادر

۱۶۔ مرزا جہاں بخت بہادر

دختر ان کے اسماء کچھ یوں تھے

۱۔ کاغذ سلطان بیگم

۲۔ آغا بیگم

۳۔ شہید بیگم

۴۔ دیر الزمانی بیگم

۵۔ نوب بیگم

۶۔ نعلی بیگم

۷۔ مبارک النساء بیگم

۸۔ کھسولی بیگم

۹۔ حسن زمانی بیگم

۱۰۔ حاجی بیگم

- | | |
|----------------------|----------------------|
| ۱۲۔ جمیل بیگم | ۱۱۔ کلثوم زمانی بیگم |
| ۱۳۔ پیاری بیگم | ۱۳۔ نورنگ زمانی بیگم |
| ۱۶۔ منشی بیگم (غور) | ۱۵۔ مسیحی بیگم |
| ۱۸۔ حالت زمانی بیگم | ۱۷۔ حمید الرحمن بیگم |
| ۲۰۔ بلالین بیگم | ۱۹۔ قطبی بیگم |
| ۲۲۔ مایہ بیگم | ۲۱۔ مریم زمانی بیگم |
| ۲۳۔ قریبہ سلطان بیگم | ۲۳۔ حاتم زمانی بیگم |
| ۲۶۔ خیر النساء بیگم | ۲۵۔ سلطان زمانی بیگم |
| ۲۸۔ انسر زمانی بیگم | ۲۷۔ سحرہ سلطان بیگم |
| ۳۰۔ خاتون زمانی بیگم | ۲۹۔ جنیت آزاد بیگم |

ابوظفر نام کے بادشاہ تھے۔ اگرچہ ہندوستان بھر میں ان کے نام کا غلبہ پڑھا جاتا تھا اور سکوں پر بھی ان کا نام ضرب کیا جاتا تھا۔ متادی میں بھی اعلان بھی کیا جاتا تھا کہ "ملک بادشاہ کا حکومت کنی بہادر کی"۔^{۱۸۰} شاہی آداب اور دربار پر راقہ خدانوں میں سزا کی بادشاہ کے نام پر دی جاتی تھیں لیکن عملی طور پر وہ محض ایک بخش خوار تھے لہذا وہی مشاغل رہے تھے شکار اور شاعری۔

دہلی اردو اخبار کی بعض خبروں میں صاحب کلاں بہادر کے سامنے حضور دلا کی بے بسی صاف نظر آتی ہے لیکن اس کا ایک روشن پہلو بھی ہے اور وہ ہے مطلق العنانیت کی آہستہ روی سے جگہ لیتی ہوئی قانون کی عمل داری۔

دہلی اردو اخبار ۱۲ جولائی ۱۸۴۰ء میں ملاحظہ کیجئے:

"نیک لوٹھی کی تاک حضور دلا نے سب مرگب ہوئے فضل شہید کے کاٹ لی سو اس باب میں اختیارات ٹکڑے افغانی میں ہوئے اور مصر کے عظیم و رعیش ہے۔"

"میدون لال منشی صاحب کلاں بہادر نے بار یاب بھرا ہو کچھ کاغذات ملاحظہ کروا کے اور ایک عورت کو سامنے کر کے عرض کی کہ یہ عورت کتنی ہے کہ میری بیٹی کل حضور دلا میں ہے۔ استماع فرما گئے ایک خواجہ سرا ہراہ کر دیا کہ کل میں ہوتا فوراً دلوادو۔ خواجہ سرانے مع عورت کے کل میں بہت تلاش کی مگر اسے نہ پایا۔"^{۱۸۱}

شکار کا ایک پورا ٹکڑا قراول کے نام سے۔ شکار پر جاتے تو پچاس ساٹھ ملازم ساتھ ہوتے۔ کمریوں میں ہوا اور اور سردیوں میں شیشے سے بند پانگی میں بیٹھ کر جاتے۔ دریاے جمنہ کے دونوں کناروں پر شکار گاہ مقرر تھی جو دہلی سے سات آٹھ کوس دور تھی۔ ضنائے ذکر کرتا چلوں کہ بادشاہ آکر اور صرف شہر دہلی میں



ریڈیلڈی ڈسٹرکٹ جیل، راولپنڈی



ریڈیلڈی ڈسٹرکٹ جیل، راولپنڈی

پھر کہتے تھے یا پھر اپنی شکار گاہ تک جا سکتے۔ اگر کہیں اور جانا چاہتے تو انگریز ریفریٹ کی سمیت ضروری تھی۔¹¹ تین غصب کا تھا کار بہت کم خاک کر لیتا تھا۔

شاعری کا تذکرہ مختلف مقامات پر ہو چکا ہے۔ یہاں صرف جناب عرش تیموری کی رائے اور چند اشعار پیش کروں گا۔

”گو محمد حسین آزاد نے داستان گوئی سے کام لیا ہے لیکن ہم انہیں معاف کرتے ہیں۔ بے شک استاد ذوق کے کلام میں استادان صفائی ہے لیکن وہ لہان اور وہ درد کہاں نصیب:

گل بھلا کچھ تو بہاریں اے بیا دکلا گئے
حسرت ان جنوں پہ ہے جو بن کئے مرجھا گئے
اور ایک شعر لکھا ہوں

خضر آدی اس کو نہ چلے گا ہو وہ کسما ہی صاحب فہم و ذکا
جسے بیش میں یاد خدا نہ رہی جسے بیش میں خوف خدا نہ رہا
اور یہ شلٹ بھی ان کا قابل دے ہے

یا تو افسر میرا شاہانہ بتایا ہوتا
یا میرا تاج گدایانہ بتایا ہوتا

اور چند شعر ذیل میں درج کرتا ہوں۔ میں ان کی شاعری پر تفصیل سے لکھتا مگر یہ میرا موضوع نہیں اس لیے اتنا ہی کافی ہے

کبھی بن سنور کے جو آگئے تو بہار حسن دکھا گئے
میرے دل کو دارغ لگا گئے یہ نیا ٹکڑہ کھلا گئے
یہ دعا ہے دل کی نہ آئے دل کوئی بے وفات نہ کھائے دل
وہ جو بیچتے تھے دعائے دل وہ دکان اپنی بڑھا گئے

ظفر¹²

کلام ظفر کے نمونے کے یہ اشعار جناب عرش تیموری نے نقل کیے ہیں۔ وہ شعر اس فقیر کی طرف

سے:

خاکساری کے لیے گرچہ بتایا تھا مجھے
کاش خاک دو جاناں نہ بتایا ہوتا
اپنا دیوانہ بتایا مجھے ہوتا تو نے
کیوں غرور مند بتایا نہ بتایا ہوتا

۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کی صبح میرٹھ سے ۳۸ رجمنٹ کے سپاہی قلعہ کے جتنا کے رخ واقع جھرد کے کے نیچے جمع ہوئے اور چلا چلا کر اپنی کارگزاری بیان کرنے لگے اور بادشاہ سے سربراہی کا مطالبہ کرنے لگے تو بادشاہ نے کہا:

”سنو بادشاہت سو برس ہوئے ہمارے مگر سے رخصت ہو چکی۔ ہم فقیر ہیں اپنی اولاد لیے چلے میں بیٹھے ہیں۔ خزانہ نہیں کرتی کو تھو اور دیں فوج نہیں کرتھاری مدد کریں ملک نہیں کرتی کو تحصیل کے لیے نوکر رکھیں ہاں یہ کر سکتے ہیں مگر گریزوں سے تمھاری صلح کرادیں۔“

سپاہی چلائے
 ”آپ غلّ الہی ہیں زمین و دنیا کے بادشاہ ہیں مہابلی ہیں وہائی ہے بادشاہ سلامت کی۔۔۔ فرنگی مردہ باد بادشاہ زعمہ ہاں۔“

بادشاہ نے وکیل قلام عباس کو بھیج کر کپتان ڈگلس کو بلا یا اور صورت حال سے آگاہ کیا اور ایک سائنٹی سوار کو خطا دے کر لیٹیننٹ گورنر کے پاس آگہ رو دیا گیا۔^{۱۴} بادشاہ کی فراست اور بصیرت نے بغاوت کا انجام بھانپ لیا تھا وہ انگریزوں کی منظم فوجی قوت سے بخوبی آگاہ تھا اور انہوں کی کمزوریوں سے بھی۔ جب بیرون شہر سے ہاتھوں کی بڑی تعداد شہر میں آگئی اور دہلی میں جمہور دہلی سپاہیوں نے بغاوت کردی اور تمام انگریز افسروں کو قتل کر دیا تو اس کے نتیجے میں یہاں ہونے والے سیاسی اور انتظامی خلا کو پر کرنے کے لیے بادشاہ کے پاس اعلان بادشاہت کے سوا کوئی اور چارہ نہ رہا۔ لیکن بادشاہ اب بھی بے اختیار تھے۔ ان کے مسلح کرنے کے باوجود ہاتھوں نے انگریز خواتین اور بچوں کو قلعہ کے جہ خانے سے نکال کر قتل کر دیا۔ ان کے مسلح کرنے کے باوجود شہر میں لوٹ مار کی اور غنہ و سوا ہو کاروں کو پریشان بنا کر بھاری رقم وصول کیں۔ حکیم احسن اللہ خان کو باغی سردار قتل کرنا چاہتے تھے اس کی جان بچانے کے لیے بادشاہ کو خود کو اس کے لوہے گرا ہوا۔^{۱۵}

جنگ کا جو منطقی انجام ہونا تھا وہی ہوا لیکن نتائج شاہ قنبر کو جھکنا پڑے۔ ان کا خاندان بے خانماں ہوا۔ چار شہزادے ذہن قصاب کے ہاتھوں کوئی کائنات نہ بنے۔ خود ان پر بغاوت مقدمہ قائم ہوا۔ قلعہ کے جہ خانہ میں قید ہوئے۔ رنگون جلا وطنی کی سزا ملی۔ دہلی سے نکلتے ہی جا گیا۔ اس وقت تک مقام جلا وطنی سینڈرز میں رکھا گیا۔ غالب سید مرزا حسین کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

”بادشاہ میرزا جان بخت“ میرزا عباس شاہ زینت محل نکلتے پہنچے اور وہاں سے جہاز پر چڑھ چکی ہوئی دیکھتے کپ میں رہیں یا لندن جائیں۔“

۷ نومبر ۱۶ جمادی الاول سالِ حال (۱۴۷۹ھ ۱۸۶۴ء) جمعہ کے دن ابوالفضل سراج الدین بہادر شاہ قیصر تک و قیہ جسم سے رہا ہوئے۔ اٹھواڑا چالیس ماہ جموں۔ (دسمبر ۱۸۶۳ء) ¹⁷

حوالہ جات

- 1- مرتق غالب۔
- 2- دیباچہ سراج المراثت بحوالہ محمود مختار و غالب طفیل الرحمن داؤدی۔
- 3- بہادر شاہ ظفر از اسلم پریچ۔
- 4- دلی تھا جس کا نام از انتظار حسین۔
- 5- بزم آفر از غشی فیض الدین۔
- 6' 8- داستانِ خدرا از راقم الدولہ ظہیر الدینی۔
- 9- قلعہ معلیٰ کی جھنکیاں از عرش تیموری۔
- 10- چراغِ دلی از شہزادہ اسماعیل اختر گرجانی۔
- 10A- ہندوستانی اخبار نویسی محمد شفیق صدیقی۔
- 11- قلعہ معلیٰ کی جھنکیاں۔
- 12' 13- ایضاً
- 14' 15- بہادر شاہ ظفر از اسلم پریچ۔
- Twilight of Mughals. By P. Spear
- 16' 17- خطوطِ غالب مرتبہ غلام رسول میر

نصیر الدولہ کرنل جیمس سکٹر بہادر غالب جنگ..... دلی اور انگریز

ہام نامی غالب ہی رودادہ
ز اسکر کہ اداست گزین دیرے است

غالب نامور کے نام دیرینہ نیاز مند اسکر کی جانب سے۔ یہ شعر مسٹر الیگزینڈر اسکر نے اولد ہام
سراج دہلی کے ایک کریٹ کے قتلے کے ساتھ غالب کو بھیجا تھا۔ ساتھ ہی ایک قطعہ علامہ ذوالدین احمد خان عسکری
کاظم کروہ تھا جس کا ایک شعر تھا:

آتش مزاج آب فروغ بخش خوشگوار
سربایہ نشاط منشی ناب اولد ہام

اس کے جواب میں غالب نے شکرے کے ساتھ ایک قطعہ بنواں فارسی اور سال کیا جس کا آغاز
یوں ہوا تھا۔

از دوست بہر بندہ زہے شیشہ ہائی سے
از بندہ سوی دوست پہ ہر شیشہ یک سلام
سلطان شکوہ مسٹر الیگزینڈر اسکر
آن آسمان عزو شرف را مہ تمام

الیگزینڈر اسکر جو ایک صاحب کے نام سے مشہور تھے کرنل جیمس سکٹر ہی، المعروف سکندر
صاحب کے فرزند تھے۔ دلی میں ان کا خاندان الگ صاحب والوں کے نام سے مشہور تھا۔ ان کی کوٹھی اندرون
کشمیری دروازہ واقع تھی۔ کشمیری دروازے کے مقابل ان کے والد کا بایا ہوا گرجا گھر تھا جو آج بھی سائٹ
جنرل پتھ کے نام سے مشہور ہے جس کے احاطے میں ان کا خاندانی قبرستان ہے۔

”تفریح دہلی“ میں ہے۔

یہ مشہور گرجا گھر کشمیری دور از سے کے قریب جہاں کہ سوا گروں کی ولا تھی سامان و طیرہ کی شاندار دکائات ہیں ان کے بیچ میں اب سڑک واقع ہے۔ اس کو ۱۸۵۵ء کے خد کے بعد کرل جنرل اسکر نے ۹۰ ہزار روپیہ کی لاگت سے تعمیر کرایا تھا۔

خود کے بعد میدان جنگ میں جبکہ وہ دہلی ہو کر خطرناک حالت میں پڑا تھا اس نے منت مانی کہ اگر وہ زندہ رہتا تو گرجا بھونا تھا یہ گرجا اس کی منت کے مطابق اس کا عہد پورا کرنے کے لیے بنوایا۔ اس کے بنوانے والے نے گرجا کے علاوہ ایک مسجد مسلمانوں کے لیے اور ایک مندر ہندوؤں کے لیے بھی بنوایا۔^۵
نواب قرلہاش نے غلطی کی ہے کیونکہ یہ گرجا ۱۸۳۳ء میں تعمیر کیا گیا۔ مسٹر پیئر لکھتے ہیں:

”تیس سال پہلے کی ایک مرہٹہ جنگ میں جان بچنے کے شکرانے کے طور پر بنوایا گیا۔ کہا جاتا ہے یہ جرج سینٹ پال کیتھڈرل کے نمونے پر بنایا گیا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس کے اوپر موجود گنبد کرل اسکر کے اسلام سے لگاؤ کی نشانی ہے لیکن یہ دشمن میں موجود ایک جرج کے نمونے پر بنایا گیا ہے۔ اس کے معمار آری انجینئر ڈے کرل اسمتھ تھے۔ کرل اسمتھ جامع مسجد اور قلعہ بناری تعمیر نو اور تین کے ذمہ دار بھی تھے۔“
اسکر صاحب کی حوالی میں اب ہندو کا بچ قائم ہے۔^۶

جنرل اسکر دولت راہ سندھیا کی سرکار میں ملازم تھے لیکن جب سندھیا کی انگریزوں سے جنگ ہوئی تو انہیں برطرف کر دیا گیا۔ انہوں نے اپنی ذاتی رجسٹر کھڑی کی جو اسکر ہارس کے نام سے مشہور ہوئی۔ ۱۸۰۳ء میں دلی کا محاصرہ ہونے میں مسٹر اسکر کا ایک اہم کردار رہا۔ ہنگر مرہٹوں کا ایک بڑا لشکر لے کر دلی پر چڑھا یا تھا۔ آکزنوئی تاجپناہ شاہشاہ عالم کے ہمراہ دلی میں زیر محاصرہ تھے۔ دلی کی سات کلو میٹر طویل بوسیدہ فصیلیں چند روز سے زیادہ حملے کی تاب نہ لاسکتی تھیں۔ لارڈ ایک تھرا میں خیمہ زن تھے۔ دلی صرف اسی صورت میں بچ سکتی تھی کہ لارڈ ایک جلد از جلد ہاں پہنچ جائیں لیکن ہمایوں کے ساتھ ہزار بیٹوں پر لدی ہوئی ان کی رسد مقامی راجاؤں نے روک لی۔ جنرل اسکر اور اس کی زبردہ پیش رجسٹر اسکر ہارس نے یہ رسد چھڑا کر لارڈ ایک تک پہنچائی۔ لارڈ ایک کو رسد ملی تو وہ دلی پر چڑھ دوڑا۔ ہنگر کے لیے محاصرہ اٹھا کر فرار ہو جانے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔^۷

بادشاہ نے اسکر کو خیمہ الدار کرل جس اسکر بھا اور غالب جنگ کا خطاب عطا کیا۔^۸
دلی کا اسکر ہاؤس ہندوستانی اثرات کے مملکت کی مانند ایک شاندار محل تھا جس میں سنگ مرمر کے حمام اور غچے ستونوں پر قائم بڑے بڑے ہال اور ایک حرم (زنانہ) تھا جس میں چھوٹا خواتین رہتی تھیں۔^۹
جنرل اسکر کے والد برطانوی جبکہ والدہ راجست تھیں۔ گورنر جنرل اور ان کی کونسل نے ایک قانون بنایا تھا جس کے مطابق ہندوستانی ماں سے پیدا ہونے والے کسی بچے کو کیٹھڈریک نہیں دیا جاسکتا تھا چنانچہ

اپنے جیسے کئی ہندوستانی ماڈن کے بیڑوں کی طرح اس نے مقامی راجاؤں کی ملازمت اختیار کر لی۔ انگریزوں کی مدد کے صلے میں اس کا نام کئی بار اعلیٰ اعزاز کے لیے تجویز کیا گیا۔ لیکن ہر بار نکلنے سے گزر کر جنرل آفس اعتراف اعزاز CB کے اعزاز کی بات ہوتی تو اس کا راجہوت ماں کا بیٹا ہونا آڑے آ جاتا۔ جاگیر بخشے کی سفارش کی جاتی تو برطانوی باپ کا بیٹا ہونا اس میں رکاوٹ بن جاتا۔⁹

لیکن اس کے پاس سرحدوں کی دی ہوئی جاگیریں موجود تھیں۔ وہ دلہنسی میں باقاعدہ دربار لگا تا تھا۔ غریب و موصول کرتا تھا اور غلطیوں سے بچتا تھا۔ اس نے فارسی اور اردو میں شاعری کی اور بڑبان فارسی اپنی یادداشتیں بھی تحریر کیں۔¹⁰

سیرالمازول میں مسٹر سکھر کی ایک حویلی کا ذکر آتا ہے جس کی ڈیوڈ می پر تحریر تھا: "حویلی پکتان جیس" سکھر صاحب بہادر ۱۸۵۱ء تا ۱۹۲۶ء¹¹

لیڈی کلائیو کی لکھی ہیں: "میرے والد کرل سکھر کا بہت احترام کرتے تھے۔ وہ ایک دوست نواز شخص اور عمدہ سپاہی تھے۔ یہ بتانا مشکل ہے کہ ان کے خاندان کا مذہب کیا تھا۔ ان کا ایک بیٹا جو (JO) سکھر کہلاتا تھا وہ ایک شاعر اور نوجوان تھا۔ جب میں ان کے گھر گئی تو اس نے سبز کوٹ اور قرمزی چٹون پہن رکھی تھی کوٹ کے منی منبری تھے۔ شاید سونے کے ہوں۔ اس کے ہاتھ میں سونے کی مٹھہ والی ایک چھڑی تھی جسے وہ اپنے بوٹوں پر مارتا رہتا تھا۔ ایک اور بیٹا الیک سکھر تھا جب میں اس کی بچی سے ملنے گئی جو بھار انگریزی فیشن سے آگاہ اور تعلیم یافتہ خاتون تھی اس نے میرے لیے گانا گانے کی پیشکش کی لیکن جب اس نے پٹانو سنبھالا اور گانا شروع کیا تو دھن اور بول دونوں میرے لیے الجھتی تھیں۔ جب میں نے موسیقی کی کتاب دیکھی تو معلوم ہوا کہ وہ Vilikins and Dinah کا رہی تھی لیکن اس کا لہجہ مکمل طور پر تبدیل ہو چکا تھا۔"¹²

جب ندر کے دوران باغیوں نے بیٹنٹن جو جج پر حملہ کیا تو انہوں نے وہاں موجود سکھر خاندان اور حکام خاندان کی قبروں کی قسم کا قصص انہیں پہنچایا جبکہ اسی اعلیٰ میں موجود ولیم فریزر کی قبر کو توڑ پھوڑ دیا۔ (JO) جو سکھر ندر کے دوران مارا گیا۔¹³

یورپی حاکم طبقے کے لیے ہندوستان کی جاگیردارانہ طاقت خاصی پرکشش تھی۔ انہوں نے وہی طرز معاشرت اختیار کیا مقامی اشرافیہ میں شادیاں کیں۔ حرم بنائے حرم کی خواتین کو پردہ کر لیا۔ عالی شان حویلیاں باغات اور بارہاں تعمیر کرائیں۔ کرل سکھر کے حرم کا ذکر آچکا۔ سر ڈیوڈ آکٹوئیو کی تیرہ بیویاں تھیں جو ہر شام تیرہ بجے پر سوار ہو کر ہوا خوری کے لیے نکلتی تھیں۔ مقامی لوگوں کی طرح ان کے گھروں میں ملازموں کی فوج ظفر موج ہوا کرتی تھی۔ ایک متوسط یورپی خاندان کے ساتھ ۶۰ کے قریب ملازم ہوتے تھے جن میں خاندان آجدار چوہدری، بھٹی باورچی، آریا بھٹی، بھٹی، خاندان مالنی، ساہی، چھڑا، پیرہ، دلاز، قلی بدینی، درزی، دھوبی اور متعدد دوسرے نوکر ہوتے تھے۔¹⁴

وہ مقامی لوگوں کے سے لباس پہنتے تھے۔ حقہ پیتے تھے۔ صغر لگاتے تھے۔ بان چباتے تھے۔ خیر اور مرغ لڑاتے تھے۔ کبوتر اور شکرے پالتے تھے۔ رقص و سرود کی محافل منعقد کرتے تھے۔ وہ عمدہ گھوڑوں ہاتھیوں اور پاکلیوں پر لاؤٹنگر کے ساتھ سفر کرتے تھے۔ اردو اور فارسی میں شاعری کرتے تھے۔ شاعرے کراتے تھے۔¹⁵

غالب لکھتے ہیں: ”پائے مجھ جان جیکب! کیا جو ان مارا گیا بچ اس کا شیوہ تھا کہ اردو کی فکر کو مانع آتا تھا اور فارسی میں شعر کہنے کی رغبت دلواتا تھا۔ بندہ نواز یہ بھی انہی میں سے ہے جن کا میں اتنی ہوں۔“ (نام حاتم علی بیک ۳ جولائی ۱۸۵۸ء)¹⁶

مجھ جان جیکب زرین العابدین خان عارف کا شاگرد تھا۔ فارسی میں شعر کہتا تھا۔ اس نے دیوان حافظ اصلاح کے بعد شائع کرایا جس کا قطعہ تاریخ غالب نے لکھا۔

مظلیہ سلطنت کی کمزوری اور مضبوط مرکز کے خاتمے کے بعد ہندوستان میں افراتفری لاقانونیت، قتل و غارت اور لوٹ مار کا دور دورہ ہو گیا چنانچہ امراء نے حفظہ کے لیے اپنی فوج رکھنا شروع کر دیں۔ ایک نیا صنایع بھل، پیشہ جو میں آیا،... کرانے کے فوجی... کی ہم جو سردار ابھرے جو زیادہ سے زیادہ معاوضہ پر جنگجو بھرتی کرتے اور کسی اصول اور نظریہ کی پاسداری نہ کرتے ہوئے محض مناسب معاوضہ پر اپنی خدمات فروخت کرتے۔ غالب کے والد عبداللہ بیک خان چچا نصر اللہ بیک خان ناٹا غلام حسین خان کیدان چچا سر نواب احمد بھل خان ایسے ہی جنگجو سردار تھے جو کبھی مظلوں کی نوکری کرتے، کبھی سرداروں کی، کبھی اور اور محسور کی تو کبھی انگریزوں کی۔ ہرپ سے آنے والے ہم جوؤں نے اس پیشہ کو سووند پایا تو وہ بھی اپنے جیسے تکلیل دینے لگے۔ انہیں مقامی لڑاکوں پر فوجی مہارت اور تختیک میں بالادستی حاصل تھی لہذا ان کی اس منطی میں زیادہ کہت تھی۔¹⁷

ان میں دلہندہ زئی، فرانسسی، جرمن، اطالوی، برطانوی سب شامل تھے۔ انہوں نے مقامی خواتین کے ساتھ شادیوں کیں اور خود کو ہندوستانی تہذیب و تمدن میں ضم کر لیا۔ ہندوستانی نام کھلانے لگے۔ سکندر صاحب، جہاڑی صاحب، سرو صاحب وغیرہ۔ سرو صاحب جرمن تھے۔ ان کا نام رائن ہارٹ تھا۔ بادشاہ نے انہیں خطاب اور سرورہ میں جاگیر دی تھی۔ انہوں نے مقامی خاتون زریب النساء بیگم سے شادی کر لی۔ بیگم سرو صیانی ہو گئیں۔ ۱۸۷۷ء میں سرو صاحب، مارے گئے تو بیگم نے سرورہ میں رہائش اختیار کی۔ وہ چوتھائی صدی تک اس جاگیر پر قابض رہیں۔ ان کی پادشاہ ایک فوج تھی اور وہ ایک چھوٹی سی ریاست پر حکومت کرتی رہیں۔ انہوں نے اپنی جاگیر پر ایک چھ قلعہ کر لیا اور ایک ہش رکھا جس کا نام جوئیس سیز تھا۔ ۱۸۳۶ء میں انتقال کے بعد اسی چھ میں دفن ہو گئیں۔¹⁸

”گوردارہ بس گنج سے آگے بڑھیں تو دائیں ہاتھ صرف بازار آتا ہے۔ اس کا کچھ نام نہ ہے۔“

اور یہ بازار جامع مسجد جالندھار ہے اور آ کے پڑھیں تو انہیں ہاتھ تنگ سر (م ۱۸۳۶ء) کی رہائش گاہ آتی ہے۔ اب وہاں ٹینک قائم ہو گئے ہیں۔¹⁹

غالب لکھتے ہیں:

”میرا دارا تو جان بیک خان شاہ عالم کے عہد میں سر قند سے دلی میں آیا۔ یہاں کھڑے اور غدارہ نشان سے بادشاہ کا فوکر ہوا۔ یہاں سو کا پرگنہ جواب سرور کی تنگ کمر کار سے ملا تھا وہ اس کی چاروں طرف مقرر تھا۔“²⁰

فرانسیسی مہم جوئی ہوئی ماحضرات مسند حیا کا ملازم تھا۔ وہ گیارہ برس تک شمالی ہندوستان میں اس کا نائب رہا۔ اس کی فوج میں ۳۰۰ یورپین اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے بھاگے ہوئے سپاہی تھے۔ وہ ۹۵۰ عہد میں راج پور ہوا تو اس کے پاس ۳ لاکھ پاؤں کی رقم تھی۔ وہ اپنی ہندوستانی بیوی اور دو بچوں علی بخش اور بانو کو لے کر فرانس چلا گیا۔

ایک اور فرانسیسی ہیرون ڈی ہوئی کا جائنشین ہوا۔ وہ بے پوز جھوڑا اور راجپوتانہ سے خراج لیتا تھا بعد ازاں اس نے مغل بادشاہ شاہ عالم کو مر قبال بنالیا۔ اس سے اپنی مرضی کے فرمان جاری کرا تھا۔ جنرل لیک نے ۱۸۰۳ء میں ہیرون کو کھست دے کر دلی پر قبضہ کیا۔²¹

جنرل لیک نے جب دلی پر قبضہ کیا۔ وہ انتہائی بد امنی اور افراتفری کا دور تھا۔ دلی کے نواح میں چھ سو گاؤں بے چراغ تھے۔ اہل دیہات مسلح جتوں کی ٹوٹ مار کا نشانہ بنتے تھے اور ساروں کی چیرہ دستیوں کا بھی۔ ان کے گھر لٹتے تھے، فصلیں اجڑتی تھیں اور بھر سڑا رہی کارندے کا گن وصول کرنے پہنچ جاتے تھے۔ ب اہل دیہے نے بھی خود کو مستظم اور مسلح کرنا شروع کیا۔ لگان دینے سے انکار کر دیا۔ سرکاری کارندے پہنچے جانے لگے۔ ان کا کانونجیوں کو مار دیا جاتا۔ دیہات میں قلعہ بند یاں کی گئیں۔ تجارتی قافلے کو لوٹا جانے لگا۔ بھر لٹنے سے بچنے کے لیے قافلوں نے انہیں محصول دینا شروع کر دیا۔ ان کی امت اس قدر بڑھی کہ وہ دہلی پر دھاوے بولنے لگے۔ مظاف ان دہلی دارلارڈ کی عملداریوں کو Little Republics کہتا ہے۔²² چارلس مظاف نے ان حکومتوں کا خاتمہ کیا۔ دیہات کو غیر مسلح کیا۔ اس نے گاؤں کے مقدمین کو اہمیت دی۔ ان کے ساتھ مذاکرات کیے۔ ان کے جھگڑے کے اقتدارات کیے۔ کاشتکاری کے فروغ کے لیے نہریں مردان کو سسے سرے سے کھدوایا۔ شہر کا پانی جب چاندنی چوک پہنچا تو اہل دہلی نے پھولوں کی بارش کر کے اس کا استقبال کیا۔

زیر کاشت رقبے میں اضافہ ہوا۔ دہلی کے نواح میں باغات لگائے جانے لگے۔ کاشتکاروں کی حالت بہتر ہوئی۔ محصولات میں اضافہ ہوا۔ امن و امان کی صورتحال اچھی ہوئی تو لوگ فیصل شہر کے باہر مکانات تعمیر کرنے لگے۔ دیوان عمارات اور مقابر پر مشتمل سرورلی کا قصبہ جو لٹیروں کی آماجگاہ تھا اہل شہر کی تفریح گاہ میں بدل گیا۔²³

چارلس مظاف نے مقامی لوگوں کو ریونیو کی تربیت دی۔ اس کے حملے میں کم سے کم ایک اور زیادہ

سے زیادہ تھیں۔ بریلی افسر رہے اور نہ راج پور کا قیام مقامی اہلکار چلائے رہے۔ ملکاف نے سرائے سموت اور حتیٰ پر بھی پابندی عائد کر دی۔

دلی کے اطراف میرٹھ اور کرنال میں برطانوی چھاؤنیاں قیام امن میں کافی مددگار ثابت ہوئیں۔ راستے محفوظ ہوئے تو تہارت کو فروغ ملا۔ لوٹ مار اور لکھتی کی داروالتوں میں کمی ہوئی تو خیر اور گاؤں و دیوں ترقی کرنے لگے۔ ۱۸۳۳ء تک دلی کے لوگ میں واقع ۶۰۰ بے چراغ دیہات میں سے ۳۰۰ آباد ہو گئے۔²⁴ تعلیمی ادارے قائم ہوئے۔ علوم شرقیہ کے ساتھ ساتھ جدید مغربی علوم کی تعلیم بھی دی جانے لگی۔ مشرقی علوم پر تحقیق کے کام کا آغاز ہوا۔ ہندوستان کی قدیم دانش کی تلاش اور تدوین کے کام کا آغاز دارن ہیسنک نے کیا تھا۔

حکومت کے فورٹ ولیم کالج نے اردو کو حیثیت نو بخشی۔ ہندوستانی معاشرے پر چھائے ہوئے فکری جمود کے خاتمے کا آغاز ہوا۔ افکار اور زبان پر بھی تقدست کی برف کھلنے لگی۔ امن و امان کی صورت حال بہتر ہوئی تو جنگجوؤں اور لڑاکوں کی اہمیت اور ضرورت کم ہوئی۔ ان کی جگہ فنکاروں نے لیتا شروع کی۔ زراعت اور تہارت کو فروغ ملا۔ محصولات میں اضافہ ہوا۔ مقامی لوگ راج پور و فیصلہ جہتی ہونے لگے۔²⁵

مختلف دیہاتی اور فوجداری عدالتوں کا قیام عمل میں آیا۔ منصفوں، وکلاء اور عدالتی اہلکاروں کی ضرورت بڑھی۔ تعلیمی اداروں کے لیے اچھے اساتذہ کی تلاش ہوئی پھر بھی ادارے خود اساتذہ پیدا کرنے لگے۔ پریس قائم ہوا۔ اخبارات کی اشاعت شروع ہوئی تو ہندوستان کی تاریخ میں پہلی بار رائے عامہ بنی۔ انڈیا ریڈیال و الفار کے مواقع میسر آئے۔ بینک قائم ہوئے۔ یوں ہندوستان میں جدید عالمی اداروں کی بنیاد پڑی۔ برصغیر پر حاکم ایسٹ انڈیا کمپنی ایک تہارتی ادارہ تھا۔ تہارت کے فروغ کے لیے امن و استحکام اور لوگوں میں قوت و طرہ کا ہونا لازمی ہوتا ہے۔ چنانچہ کمپنی کے بعض حکام نے ہندوستان کے عوام کی معاشی حالت کو بہتر بنانے کے لیے مشرقی سماجی اور تعلیمی اصلاحات کی تہا بیز دیں۔ یوں پے ہوئے عوام کے لیے منظم اعلیٰ سطح سکھانوں، سائیکلو کاروں، جاگیرداروں اور پھاریوں کے چنگل سے نکلنے کی راہیں کھلنے لگیں۔²⁶

الگستان میں صنعتی معاشرے کے قیام اور جاگیرداری کی کمزوری نے نئی مشاشرقی اور سماجی روایات کو جنم دیا تھا۔ انہی اقتدار کو ہندوستان میں فروغ دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ آخر ہندوستان انگریزوں کے لیے سونے کا اڈا بنے۔ اہل حرفت تھا اور اسے صحت مند رکھنا لوگوں کے مفاد میں تھا۔

جانسن لندن کی ۱۸۳۷ء کی ایک اشاعت میں لکھا گیا:

”وہ دن ختم ہوئے جب ہندوستان سے ہیرے جواہرات، تخت و طاقوس اور لعل و یاقوت لوٹے جاتے تھے۔ ہندوستان کا خزانہ اب لوگوں کے اندر ہے۔ ان کی حالت کو بہتر بنایا جائے اور ان کے ذرائع اور توانائی کو استعمال کیا جائے۔ ہندوستان سے قطع ختم کرنا اور لوگوں کی جسمانی اور مالی حالت ٹھیک کرنا اس کی

پیشہ و دولت ہے۔²⁷

لاڈ ولیم ہینکس چارلس ہینکس اور لارڈ میکالے اصلاحات کے حامیوں میں قابل ذکر ہیں۔ ولیم ہینکس نے تعلیمی کا انداز کیا جس کی کوہکنے کی کامیاب کوششیں کیں، کیمپٹی کے اہلکاروں کی لوٹ مار اور رشوت خوردی کا بڑی حد تک خاتمہ کیا۔ ہینکس نے قائم مقام گورنر جنرل کی حیثیت سے پریس کی آزادی کے لیے اقدامات اٹھائے، باوجودیکہ کیمپٹی کے بااثر یورپی اہلکار اس کی مخالفت کر رہے تھے۔ میکالے کا نام آتے ہی تعلیمی اصلاحات کا تصور ذہن میں آ جاتا ہے۔²⁸

۱۸۳۸ء کی افغان جنگ نے اصلاحات کے عمل کو سست کر دیا جبکہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی نے تو اسے بالکل ہی روک دیا۔ جنگ کے بعد ہندوستانوں سے راجہ و رسم کے نئے اصول ترقی پ دئے گئے۔ وقار و شہریوں اور ”غورخوار باغیوں“ میں تو آخر بہت فرق پڑا ہے۔

انگریزوں کی آمد سے قبل ہندوستان کے لوگ بنیادی انسانی حقوق کے تصور سے غفلت نہ آ سکتے تھے۔ تعلیمی اداروں، عدلیہ اور ادارات نے پہلی بار انہیں حقوق سے روشناس کرایا۔ سپاہ کے ساتھ لوٹ مار کا تصور وابستہ چلا آ رہا تھا۔ سپاہی عوام کا خون سے چیزیں مفت اٹھا لیا کرتے تھے۔ لوگوں کے سونپٹی پکڑ لیا کرتے تھے۔ اناج اور گھاس چھین لیا کرتے تھے۔ لیکن برطانویوں کی طرف سے ایک منظم فوج کے قیام کے بعد یہ باتیں قصہ پارینہ ہو کر رہ گئیں۔ سکھوں، مرہٹوں اور راجپوت سپاہیوں نے لوٹ مار، بکسڑ ڈک کر دئی، کیمپکس آپ انہیں معقول محضو ملنے لگی تھی جو باقاعدگی سے ملتی تھی²⁹۔ اگرچہ ۱۸۵۷ء میں دہلی کی بغاوت کچلنے کے بعد انگریزوں نے اپنے تمام اصول فراموش کر دیئے تھے لیکن ان کے رویے بہر حال تیمور شاہ اور شاہ اور ابدالی سے کہیں بہتر تھے۔

انگریزوں کا بنیادی مقصد ہندوستان کے وسائل کو زیادہ سے زیادہ اپنے استعمال میں لانا تھا۔ وہ ہندوستان کی دولت، بنو کر انگلستان لے جاتے رہے۔ اگرچہ ان کا طریق کار محمود غزنوی، تاج شاہ اور احمد شاہ ابدالی سے مختلف تھا۔ انہوں نے ہندوستان کو محض خام مال مہیا کرنے والی سرزمین بنا کر رکھا۔ یہاں کی صنعت کو نہ کام بنایا گیا۔ یوں بھی دستکاری مشینی صنعت کا کب تک مقابلہ کر سکتی تھی۔ ٹیکسٹائل کی صنعت کو ایک مثال کے طور پر پیش کیا جاتا ہے لیکن اس کے خاتمے میں مافیسٹری مشینی صنعت کا اہم کردار ہے جو ہندوستانی دستکاروں کے مقابلے میں کہیں سستا پکڑا بناتی تھی۔ ہندوستانی خدو سے کٹی کپڑے پر ترقی دیتے تھے۔

۱۹۰۱ء میں دارادراہائی اور دہلی دار ہندوستان کے معاشی استحصال پر مکمل کھلبلاہت کی۔ انہوں نے لکھا کہ انگریز ہندوستان سے دولت سمیٹ کر انگلستان لے جا رہا ہے جس کی وجہ سے یہ ملک اپنے ذرائع سے محروم ہو رہا ہے۔ اس سے ہندوستانی معاشرے کی مادی ترقی رک گئی ہے اور لوگ روز بروز افلاس کا شکار ہو رہے ہیں۔³⁰

برطانوی حکام کا برصغیر کے عوام کے ساتھ معمولی رویہ غیر ملکی فاتحین جیسا ہی رہا، خصوصاً انڈیا کے بعد یہ بدتر ہو گیا۔ انگریز حاکم ہندوستانیوں کے ساتھ نفسی امتیاز برتتے تھے اور انہیں اپنا کلام سمجھتے تھے۔ ہندوستانی اشرافیہ کے ساتھ انہوں نے ایسے تعلقات رکھے۔ انہیں استعمال کیا اور اس کے صلے میں ان کی سرپرستی کی۔ ہمارے ممدوح نواب اسد اللہ خان غالب کا تعلق دکنی اشرافیہ سے تھا۔ ان کے چچا ناصر اللہ بیگ خان اور چچا سسر نواب احمد بخش خان نے انگریزوں کے لیے پیش بہا خدمات انجام دی تھیں، چنانچہ انگریز حکام غالب کی پذیرائی کیا کرتے تھے۔

دینی کے ریفیڈیشن چارلس سٹاکفیلڈ اور کولیروک، ولیم فریزر جیمز، ٹامسن سب کے ساتھ غالب کے خوشگوار تعلقات رہے۔ غالب اپنی عقیدت کی بحالی کے لیے کلکتہ کے توگمور ہسپتال کے دربار میں انہیں کرسی دی گئی، اور لارڈ صاحب نے ان کی عزت افزائی کی۔ لکھتے ہیں:

"میرا نام صرف اصحاب الیمین میں درج ہوا۔ مجھے عزت کی کرسی عطا کی گئی۔ حسن اتفاق سے کرسی فیروز پر راجا محبوب سنگھ نمبر ۶ پر چائیں اور راجا کلیان سنگھ عظیم آبادی نمبر ۳ پر سفیر شاہ ولی فیروز پر سفیر شاہ اودھ نمبر ۵ پر دہلیوں جاو اب مرشد آباد کے وکیل فیروز پر وکیل راجا نیپال فیروز پر میرے قبلہ وکعب جناب علی اکبر خان بہادر دام آقبال اور دو اس فیروز دی کا قرار پایا۔... پھر کے روز بارگاہ میں حاضر ہوا۔ چونکہ فیروز جوبلی اکبر خان کا تھا خالی تھا اسے چھوڑ کر میں دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔ نواب گورنر جنرل بہادر شریف لائے۔ میں نے دعا شرفیاس تذکرکیں۔ رسم کے مطابق انہوں نے معاف فرما کر چندے تو قف کیا اور میری نیاز مندی کو سراہا اور انتہائی شفقت سے اپنے دست خاص سے علم اور پان عطا فرمائے۔"

(1994)

”جناب لارڈ کیلنگ بہادر نے کمری گورنری پر اجلاس فرمایا تو میں نے موافق دستور کے تصدیق و ذاک میں بھجوا دیے۔۔۔۔۔“ منسٹرن صاحب بہادر چیف سکریٹری کو خط آیا تو انہوں نے باوجود موجودہ سابقہ معرفت میرا القاب پڑھا یا۔۔۔ قیل ازلیہ ”خان صاحب بسیار مہربان و دوستانہ“ ”میرا القاب تھا۔ اس قدر دشمناس نے اذراء قدر افزائی“ خان صاحب شفیق بسیار مہربان غلبان لکھا۔“ (بنام مرزا حاتم علی بیگ نمبر ۱۸۵۹ء)۔³²

”بہتری سفودارت دینے صاحب ممالک مغربی کے مدرسوں کے قائم اور گورنمنٹ کے بڑے صحاب ہیں۔ امن کے دنوں میں ایک ملاقات میری ان کی ہوئی تھی۔ میں نے ایک کتاب سادہ بے جلدان کو بھیجی تھی۔ کل ان کا ایک خط مجھ کو اس کتاب کی رسید میں آیا۔ بہت تعریف لکھتے تھے۔“ (بنام نقت ۲ نومبر ۱۸۵۹ء)۔³³

”پرسوں اور کل دو ملاقاتیں جناب آریض صاحب بہادر سے ہوئیں۔ کیا کہوں کہ مجھ پر بے سبابت معرفت کیا حمایت فرمائی۔ میں یہ جانتا ہوں کہ گویا مجھ کو رسول لے لیا۔۔۔ ایک دستباز اور ایک بیخ آجک اپنے

ہاں سے ان کو نذر کر آیا ہوں۔“ (غلام شہناز مارکن آ رام ۱۵ جنوری ۱۸۵۹ء۔)³⁴
 ”سر شہید و دما راج کو بارہ بجے تو اب لیفٹیننٹ گورنر بہادر (لارڈ کلکری) نے مجھ کو بلا دیا۔ خلعت عطا
 کیا اور فرمایا کہ لارڈ صاحب بہادر (گورنر جنرل) کے ہاں کا دربار اور خلعت بھی بحال ہے۔ اقبال چاؤ کے تو
 دربار اور خلعت چالو گے۔“ (غلام قلام نوٹس بے خبر ۱۸۶۳ء۔)³⁵

حوالہ جات

- 1-2 سید یحییٰ مرزا احمد علیہ السلام خان غالب۔ مطبوعہ پنجاب پبلیشرز لاہور ۱۹۶۹ء
- 3- تفریح دلی تو اب قولہاں و شہید دارشاہی مطبع فیض آباد ۱۹۳۶ء۔
- 4-5 Twilight of Mughals. Percival Spear.
- 6- Delhi its Monuments and History. Spears.
- 7- Delhi Throughs Ages. R.E.Frykenbergh
- 8-7 آخری عہد مظلیہ کا ہندوستان از آکٹر مبارک علی۔
- 8- Twilight of Mughals Spear.
- 9- آخری عہد مظلیہ کا ہندوستان از آکٹر مبارک علی۔
- 10- Twilight of Mughals + Delhi Through Ages.
- 11- سیر المآثر ل۔ مرزا یحییٰ بیک۔
- 12-13 Twilight of Mughals. Spear.
- 14-15 آخری عہد مظلیہ کا ہندوستان از آکٹر مبارک علی۔
- 16- خطوط غالب مرتبہ غلام رسول مہر۔
- 17-18 آخری عہد مظلیہ کا ہندوستان از آکٹر مبارک علی۔
- 19- سطرنامہ ہند از پروفسر محمد اسلم۔ ریاض برادرز لاہور۔
- 20- مجموعہ نثر غالب مرتبہ ظہیر الرحمن داؤدی۔
- 21- آخری عہد مظلیہ کا ہندوستان از آکٹر مبارک علی۔
- 22-23-24 Twilight of Mughals. Spear.

- 25-26-27- برطانوی راج ایک تجزیہ از ڈاکٹر مبارک علی، نکلشن پبلس لائبر۔
- 28- کبھی کی حکومت از ہاری علیک۔
- 29-30- برطانوی راج ایک تجزیہ از ڈاکٹر مبارک علی۔
- 31- نامہ ہائی کوری عالم ترجمہ پروردہ علیہ۔
- 32- خطوط عالم مرتبہ غلام رسول مہر۔
- 33-34-35- ایضاً

دلی کے مصور

بکھے ہیں سرِ دلوں کے لیے ہم مصوری
تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیے
(عالم)

عالم اکتوبر ۱۸۵۸ء کو شیخ مارائن آقام کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:
”اچھا ہوا شیخ زادہ دی دادم زادہاں مگر وہ ایک مصوروں کو آبادی کا حکم ہو گیا ہے وہ رہتے ہیں سودہ
بھی بعد اپنے گھروں کے لئے کے آباد ہوئے۔ تصویریں بھی ان کے گھروں سے لے گئیں جو کچھ ہیں وہ
ساحبان اگر بننے پڑی شراہش سے خرید لیں۔“
تخت طاؤس نے ہمیشہ دیگر فنکاروں کی طرح مصوروں کی حوصلہ افزائی، قدر دانی اور سرپرستی کی۔
بلکہ تخت طاؤس کے وجود میں آنے سے قبل اعلیٰ حضرت نصیر الدین ہمایوں ایران میں جلاوطنی کی زندگی
گزارنے کے بعد قاضی دلی میں داخل ہوئے تو ان کے جلو میں دیگر باکمال اہل ایران کے ساتھ ساتھ ایرانی
مصور بھی تھے۔ فن مصوری کو وہ اس عروج پر لے گئے کہ یہ مغل آرٹ کہلا یا۔ آرٹ سے دلچسپی رکھنے والا کون
ایسا انسان ہوگا جو مغل مٹی اچھڑکا معترف نہ ہو۔

ہوا شاہت کزور ہوئی طوائف اسلو کی درآئی تخت طاؤس باور شاہ لے گیا۔ رنگ گل کی چاندی کی
چھت جات اتار کر لے گئے۔ روپیوں، مرنہوں اور سندھیانے دفینوں کی تلاش میں محلات کے فرش کھود
والے۔ فنکاروں کی قدر دانی میں بھی کچھ عرصے کے لیے کی ہوئی۔ لیکن پھر ان فن کاروں کو یورپ کے صنم
کدوں سے پاسان مل گئے۔ ۱۸۰۳ء میں جو انگریز لارڈ لیک کے ساتھ آئے ان میں متعدد ایسے تھے جو
کشیجہ ظلم مشرق بلکہ حارثین سرحد دلی تھے۔ انہوں نے ان فنکاروں کی سرپرستی کی۔ پاؤنڈوں سے بھری
بیجوں والے گدووں نے دلی کے فن پاروں کے لیے ایک قطع بخش منڈی فراہم کی اور پھر امن کا ایک طویل
دور بھی آیا جو پوری نصف صدی پر محیط تھا۔ فنون کی نشوونما میں امن کے کردار کا کون منکر ہو سکتا ہے۔

بادشاہ سلامت کی سلطنت دہلی کا پالم ہلکا۔ بعد ازاں تو محض قلعہ معنی تک محدود رہ گئی۔ شاہوں کے اغراجات شاہانہ تھے لیکن وظیفہ بھی کچھ کا گویا نہ تھا۔ محلات کی مرمت اور زیبائش و آرائش تو ہوی سکتی تھی چنانچہ خرمندوں اور فنکاروں کو پھر ان کا حصہ ملنے لگا۔

برطانوی ریڈیٹنٹ کے قیام مصروفیات (اور اختیارات بھی) خود سنبھال کر شاہوں کے بوجھ ہلکے کر دیے تھے اور انہیں چند سرسبز دریاؤں اور ٹھنڈی سڑکوں سے آزاد کر دیا تھا۔ چنانچہ شعر و ادب موسیقی اور مصوری میں ان کی دلچسپیاں بڑھیں۔ نتیجتاً ان خون کو بھی فروغ حاصل ہوا۔ فیصلہ شعر کے اندر رسول حکام کی کولھیاں تعمیر ہونے لگی تھیں اور پہاڑی پر فوجی حکام کی۔

کولھوں کی آرائش کے لیے مصوروں کی ضرورت تھی۔ دہلی کے مصو اب انگریز سرپرستوں کے لیے کام کرنے لگے۔ انگریز اشرافیہ کے انگلستان میں واقع گھروں کی آرائش کے لیے بھی اس طلباء دنیا کی تصاویر جانے لگیں۔ پسندیدہ موضوعات قلعہ سرخ، مسجد جامع، قطب مینار، زماہوں اور مغل جنگ کے مقبرے تھے۔ مصوروں نے جلد اپنے سرپرستوں کے حراج سے آشنائی حاصل کر لی۔ ان کی تصاویر میں برطانوی ڈرائنگ کی جھلک بھی دکھائی دی جانے لگی۔^۳

عمارات، ہوا پر بس خطر کے ساتھ سیاہ عاچیے میں دکھائی دی جانے لگیں۔ انگریزی کاغذ کے بڑے محلے قلم اور سیاہیاں، سنہری سرخ اور سبز رنگ..... لیکن ہندوستانی فنکاروں نے اپنی جزئیات ظاہر کرنے کی روایت برقرار رکھی جس سے حیران کن شاہکار معرض وجود میں آئے جنہیں دیکھ کر یورپی شائقین انگشت بدلتاں رہ گئے۔

مقامی عمارات اور یادگاروں کی تصاویر کی طلب میں اضافہ ہوا تو قدیم رسول مقبول کو نیت المساجد قدسیہ، بارخ، دریا، منج، مقبرہ، اعظم خاں کو کہ اور فیروز شاہ کے کوئلہ کو بھی مصور کیا جانے لگا۔^۳ دہلی میں محض عمارات ہی تو نہ تھیں۔ یہاں تو ہار سے لے کر بہادر شاہ ظفر تک غیر معمولی لوگوں کی ایک دکانی ہوئی کھکشاں تھی۔ بادشاہوں کی پورٹریٹس کی دہلی کے یورپی باشندوں، یہاں تک کہ یورپ میں بھی مانگ تھی۔ سب سے زیادہ مقبول اکبر اور ابوظفر بہادر شاہ ثانی تھے۔ اکبر تو خیر اکبر اعظم تھے لیکن بہادر شاہ ظفر کیوں؟ جواب ملتا ہے کہ ایک فلسفی اور شاعر بادشاہ ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ایک باوقار اور مہربان بزرگ بھی تھے۔ A Good Kind Old man۔ مقبول ترین تصویر دہلی عام میں تخت پر ٹھہر گیا۔ بہادر شاہ ظفر کی تھی جن کے دونوں طرف شہزادے اور وڈ راہ و امراء دست بستہ کھڑے ہیں اور پیچھے کھڑے خدام ہال ملاؤس سے گھس رانی کر رہے ہیں۔^۴

ان کی بہت سی تصاویر میں برطانوی ریڈیٹنٹ ایوی آکزیلونی، آرچی بالڈین اور چارلس مکاف بھی موجود ہیں۔ انہی کے ہونے میں برابریاں پاکی تھیں اور گھوڑے پر سوار ابوظفر کی تصاویر بھی بہت مقبول

تھیں۔ برطانوی اشرافیہ کے گھروں میں شاہ کی ایک تصویر کی موجودگی تو لارڈ خیال کی جاتی تھی جس میں شاہ دو شہزادوں کے ساتھ دیوان خاص میں مقرر تھے لہذا اس کے علاوہ قلعہ میں سرگرمیوں میں کھڑا میزبان عدل ابھرا ہوا نظر آ رہا ہے۔

دلی کی رہنماؤں کی تصاویر بھی گوروں میں خاص مقبول تھیں۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے ابتدائی آفیسر جو ہندوستان اور ہندوستانی روایات سے محبت کرتے تھے اور ہندوستانی اشرافیہ کا طرز زندگی اختیار کرتے تھے، حق پہنچتے تھے، حرم رکھتے تھے اور جو ”ناب“ کہلاتے تھے۔ انہوں نے مصوروں کو باقاعدہ ملازم رکھا ہوا تھا۔ مظفر علی خان، غلام علی خان، غلام مرتضیٰ خان، جیون رام اور نعل کی چٹا پیسے مصور تھے جو یورپین حکام کی خدمت میں رہتے تھے اور صرف انہی کے لیے کام کرتے تھے۔

ڈیوڈ آکزلونی المعروف اختر لونی ۱۸۰۳ء سے ۱۸۳۵ء تک دلی میں رہا۔ جیون رام اس کا ذاتی مصور تھا۔ ۱۸۳۵ء میں تاریخ نگار ایلی جیون رام سے ملیں اور اس کے کام کو سراہا۔ جیون رام نے آکزلونی کی ہندوستانی لباس میں ملیں حق پہنچا اور گاؤں گھوٹے سے پشت لگا کر رسم دیکھتے ہوئے ان کی تصاویر بنائیں۔^۶ ولیم فریزر ۱۸۰۵ء میں دلی آیا اگرچہ وہ مختلف مہمات پر باہر جاتا رہا لیکن وہ دلی لوٹ آتا تھا اور یہیں ۱۸۳۵ء میں وہ قتل ہو کر دفن ہوا۔ فریزر دلی کے مصوروں کا ایک بڑا سرپرست تھا۔ فیض علی خان اس کے لیے کام کرتا تھا۔ ولیم فریزر کی ایک ایسی تصویر جس میں وہ ایک انتہائی حسین جات لڑکی اور ایک بچے کے ساتھ موجود ہے لندن کی اشرافیہ میں بہت مقبول ہوئی۔^۷

کرنل جیمز اسکٹر کے پاس تصاویر کا ایک بہت بڑا ذخیرہ تھا۔ وہ اپنے مہمانوں کو دلی کی رہنماؤں کی تصاویر بطور تحفہ دیا کرتے تھے۔ غلام علی خان جو بانی و بھڑاؤ کے ہمسرے سمجھے جاتے تھے، کرنل اسکٹر کے لیے کام کرتے تھے۔^۸

سر تھامس فیلیس حکلاف نے جتنا کہ کنارے حکلاف ہاؤس تعمیر کرایا۔ قلعہ صاحب میں ان کا دکھلا باغ تھا۔ یورپی لوگ اسے یورپی شاہ جہاں کہتے تھے۔ مظفر علی خان اس کے ملازم تھے۔ حکلاف محل کے کمرے اور ہال نیز دکھلا باغ کے اندر واقع محل سرا کے کمرے انتہائی خوبصورت اور نمایاں تصاویر سے مزین تھے۔^۹

دلی کے مصوروں کا یہ زریعہ دور ۱۸۵۷ء تک چلا۔ پھر وہ دلی کی اوراق مصور نمایاں رہیں نہ مصور اور نہ ان کے سرپرست۔ مصوری کے سرپرستوں کے محل لٹ گئے۔ تصاویر نذر آتش ہو گئیں۔ ان کے بعد جو حکام آئے وہ ”ناب“ نہ تھے ”چٹیلین“ تھے۔ وہ دلی سے بیزار نہ کرتے تھے بلکہ نعل دلی کے خون کے پیاسے تھے۔ ان نئے آنے والوں میں کوئی اسکٹر، کوئی حکلاف، کوئی فریزر نہ تھا۔ وہ سب ہڈن جیسی ذہنیت کے مالک تھے لیکن بہر حال مر جے اور امارت کی نشانی کے طور پر وہ مشرقی مصوروں کی تصاویر کے خواہاں ضرور تھے چنانچہ

سب سے پہلے اجڑی دلی میں مصوروں کی آبادی کا تخم ہوا۔۔۔ آئیے ہم ذرا لوٹ کر اپنے غالب کی طرف پلٹے ہیں۔ فنی شیخو خاں آ رام کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

”ایک مصور کے پاس ایک تصویر ہے۔ (بادشاہ کی) کوہ تیس روپے سے کم کو نہیں دیتا۔ کہتا ہے کہ تمہیں میں اشرافیوں کو میں نے صاحب کوگوں کے ہاتھ بیچی ہیں۔ تم کو وہ اشرافی کی دلوں کا چھٹی دانست کی چھٹی پر وہ تصویر ہے۔ میں نے چاہا کہ اس کی نقل کاغذ پر اتار دے۔ اس کے بھی تیس روپے مانگتا ہے۔ خدا جانے ابھی ہو یا نہ ہو۔“ (۱۲ اکتوبر ۱۸۵۸ء)¹⁰

وفات سے دو برس قبل نواب میر نظام بابا خاں کو لکھتے ہیں:

”ایک میرے دوست مصور کا خاں کا تارود باد کا نقشہ اجارے کو اکبر آباد گئے وہ آ جائیں تو شکل تصویر تمام ہو کر آپ کے پاس پہنچ جائے۔“ مارچ ۱۸۶۷ء¹¹

۱۱ جون ۱۸۶۷ء کو میاں داد خان سیاح کے نام ایک خط میں رقم طراز ہیں:

”تصویر کا یہ حال ہے کہ ایک مصور میرے دوست میرے چہرے کی تصویر تیار کر لے گئے اس کو میں مینے ہوئے آج تک بدن کا نقشہ کھینچنے کو نہیں آئے۔ میں نے گوارا کر لیا آئیے پھر نقشہ اتار دانا بھی۔ ایک دوست اس کا کام کرتے ہیں میں نے ان سے کہا بھائی میری شہرہ کھینچ دو۔ وعدہ کیا تھا کہ کل نہیں تو پر سوں اسباب کھینچنے کا لے کر آؤں گا۔ شوال ذی قعدہ ذوی الحجہ عمر میں پانچواں مہینہ ہے۔ آج تک نہیں آئے۔“¹²

اور اب تو گورے مصور اور فوٹو گرافر بھی دلی میں آ گئے تھے۔ غالب ۲۵ اگست ۱۸۶۷ء کو ایک خط میں میاں داد خان سیاح کو لکھتے ہیں:

”تصویر کھینچنے والا جو ہندوستانی ایک دوست تھا شہر سے چلا گیا ایک انگریز ہے وہ کھینچتا ہے۔ مجھ میں اتنا دم کہاں کہ کوٹھے پر سے اتروں پانگی میں بیٹھوں اور اس کے گھر جاؤں اور کھینچ دو کھینچ کر پی بیٹھوں اور تصویر کھینچ کر بیٹھا جاتا ہے مگر پھر آؤں۔“¹³

غالب اپنے خطوط میں دلی کے دو ہر مند فنکاروں کا ذکر کرتے ہیں۔ ایک مہر ساز اور ایک فرش نویس۔

۲۹ جون ۱۸۶۷ء کو انوار الدین شفیق کے نام خط میں تحریر فرماتے ہیں:

”آج شہر میں بدر الدین علی خان کا نظیر نہیں۔ بس مہر اور گول کھود سکے گا؟“

۲ مارچ ۱۸۶۸ء کو یوسف میرزا کے نام خط میں لکھتے ہیں:

”پنشنی صاحبان کا حال یہ ہے کہ آغا سلطان، بختاب کو گئے۔۔۔ مسعود سلطان اور یوسف سلطان

دیں ہیں۔۔۔ میر جلال الدین خوش نویس ہیں اور وہ دونوں بھائی باہم رہتے ہیں۔“¹⁴

کاتب تودر ہار کے ساتھ پینٹروں وابستہ تھے۔ شاہجہان پور پر راق لکھتے ہیں:

”لال قلعہ کے بادشاہوں کے ہاں یہ آئین تھا کہ ایک استاد خوشنویس کے ہزار پانچ سو کم مہر لکام شاگرد کو دے جاتے تھے اور وہ مشق کرتے کرتے خوشنویسی میں کامل ہو جاتے تھے اور سب کا خط ایسا ملتا جلتا ہوتا تھا کہ زیادہ کر کے لکھے میں کوئی فرق نہ معلوم ہوتا تھا۔ جب حضور والا چاہتے تھے سو جزو کی کتاب کا شیرازہ تو ان کو سوغلاموں کو ایک ایک جزو بانٹ دیتے اور فرما دیتے تھے کہ ہر کتاب اپنا اپنا جزو فروب آغالب سے پہلے لکھ کر پورا کر لے اور اس تجربے سے سو جزو کی کتاب ایک دن میں لکھی جاتی تھی پھر ساری کتاب ایک قلم ایک سیاہی کی۔ ایک کتاب کی لکھی معلوم ہوتی تھی۔ اسی طرح جدول کش، نقاش، مصور بھی ساتھ ساتھ سینکڑوں ہزاروں ہوتے تھے اور ایک ہی دن میں وہ بھی کتاب کو بنا سنوار کر دیکھ کر ہلا دیتے تھے۔¹⁵

حوالہ جات

- 1- خطوط غالب، مرتبہ غلام رسول میر۔
- 2- Twilight of Mughals. Percival Spear.
- 3- ایضاً
- 4- ایضاً
- 5- ایضاً
- 6- Delhi Through Ages, R. E. Frykenbergh. 9۲
- 10- خطوط غالب، مرتبہ غلام رسول میر۔
- 11 13۴- خطوط غالب، مرتبہ غلام رسول میر۔
- 14- خطوط غالب، مرتبہ غلام رسول میر۔
- 15- لال قلعہ کی ایک جھلک، فراق دہلوی۔

دہائی کے موسیقار اور مطرب

میں نے سات شعرا میر خسرو کی غزل پر لکھ کر ایک مطرب کو دیے۔ وہ مجلسوں میں گانے لگا۔ اکبر آباد لکھنؤ تک مشہور ہوئے وہ غزل جس کا مطلع یہ ہے

از جسم بجاں نقاب تاکے
ایک سنج دریں غراب تاکے

(غالب عام غلام ٹوٹ ہے نمبر ۱۸۶۰ء)^۱

”تم نے تم جن کا ذکر کیوں کیا؟ میں نے اس باب میں کچھ نہ لکھا تھا۔“ ”تم جن اور تم خٹا اصوات ہیں تار کے ہندی اور فارسی میں مشترک۔“ ”غالب عام تھوڑے“^۲

قلمدہ سلی نے جہاں دیگر فنون کی سرپرستی کی وہاں فن موسیقی کے فروغ میں بھی کوئی کسر اٹھانہ سکی۔ جس عہد کی جھلک ہم دکھا رہے ہیں اس عہد میں تو قلمدہ سلی ایک مرکز ثقافت ہی بن کر رہ گیا تھا۔ قلمدہ میں لا تعداد جشن منائے جاتے۔ بعض صرف خواص کے لیے ہوتے تو بعض میں عوام کو بھی شرکت کا اعلان عام تھا۔ موسیقی ہر جشن کے لیے لازم تھی بلکہ جشنوں پر ہی متوقف کیوں روزمرہ کا حصہ تھی۔ منشی فیض الدین لکھتے ہیں:

”رات ہوئی مٹھلے سوں نے روشنی کی تیاری کی۔ جہاز قانوس، خلیجہ سوز، ایک شاعری، دو شاعری، سر شاعری، پنج شاعری، چھاپاں، مٹھلے، لائینیں روشن ہوئیں۔ چار گھڑی رات آئی۔ وہ روشن چوکی کا گھٹتہ طبلہ لقمیری بھتی ہوئی، مٹھلے کے ساتھ دیوانی، عام دیوانی خاص کے ساتھ ہو کر جھروکوں کے نیچے آئے، مشاء کا وقت آیا نماز و غنیمت سے فارغ ہو کر تاج گانے کی تیاری ہوئی۔ جان دس خان چوکی کے طائفے حاضر ہوئے۔ تاج ہونے لگا۔ الخ سازندہ، قنات کے پیچھے کھڑے، طبلہ مار گئی، تال کی جھڑی بجا رہے ہیں۔ تاجنے والی بادشاہ کے سامنے کھڑی تاج رہی ہے۔ وہ ڈیڑھ پہر رات کی توپ چلی دو صائیں پھر اس طرح خاص کی تیاری ہوئی خاص کھایا۔۔۔“^۳

منشی صاحب نے جان دس خان کا ذکر کیا ہے۔ ان کا نام قصب بخش تھا۔ آباد اہلاد محمد شاہ کے عہد سے دوبارست واپست چلے آتے تھے۔ شاہ عالم جانی کے عہد میں پیدا ہوئے۔ اکبر شاہ جانی تخت پر بیٹھے تو ان کی

میر باج سال تھی۔ نو عمری میں ہی شہرت ہو گئی۔ جب بہادر شاہ ظفر بادشاہ ہوئے تو قطب بخش استاد مشہور ہو چکے تھے۔ بادشاہ نے دربار میں بلا لیا۔ تاجن دس خان کا خطاب ملا۔ قصہ معنی سے وابستہ گانچکاؤں کی تعلیم کی ذمہ داری بھی سونپی گئی۔ انھارہ گلوکاراؤں کو تاجن دس خان سے شرف تلمذ تھا جن میں سے ہر ایک لا جواب گانے والی تھی۔ بیاری ہائی چند ہائی مصائب ہائی سلطان ہائی زیادہ مشہور ہوئیں۔^۴

تھور کے بعد تاجن دس خان نے الور سے پور اور جودھور میں ملازمتیں کیں۔ بھر حیدر آباد چلے گئے اور نظام میر محبوب علی خان کے دربار سے وابستہ ہو گئے۔ دو بیٹوں امراؤ خان اور غلام غوث خان نے بھی شہرت پائی۔ حیدر آباد میں ہی انتقال ہوا اور شاہ خاموش صاحب کی درگاہ کے قریب جودھور میں دفن ہوئے۔

کہتے ہیں ایک دن تاجن دس خان نظام کے حضور میں یہ غمری گا رہے تھے "رات ہاں تم ہم سے لڑے تھے نظام جنگ پر لینے ہوئے تھے استاد کی باتوں نے وہ سناں ہاں دعا کہ بے تاب ہو کر اٹھ بیٹھے اور کہنے لگے "دلو تاجن دس دلو۔ دلو تاجن دس دلو۔" یہ سن کر استاد پک کر اٹھے اور چٹ پٹ جودھور نظام کی بلائیں لے لیں۔ یہ آداب کے خلاف تھا۔ سرد و گرم چشیدہ استاد حضور کی گرم گلابی کو بھانپ گئے اور دست بستہ بولے "قرآن چاؤں مدت سے آرزو تھی کہ کسی مسلمان بادشاہ کی بلائیں لوں ان ہاتھوں نے تو حضور بہادر شاہ بادشاہ کی بلائیں لیں یا آج آپ کی۔ یہ سن کر میر محبوب علی خان مسکرا دیے۔"

دربار سے وابستہ ایک گلوکارہ لاجہ موسیٰ خانم کے نام سے مشہور تھیں۔ یہ ایک خاص شادی طائفے سے وابستہ تھیں جو بادشاہ کی تخلیق کردہ غمریاں اور غزلیں گایا کرتا تھا۔ لاجہ موسیٰ خانم بے حد ذہین تھیں۔ فن موسیقی میں ماہر تھیں اور اس طائفے کی سربراہ تھیں۔ کہتے ہیں کہ جادو اس قدر بلا تھا کہ بادشاہ نے ایک بار غزل سنائی اور ادھر انھیں یاد ہو گئی۔ وجہ تھیں ان کی یہ ہے کہ پان میں چھالے بہت کمائی تھیں اور اس کو ایک طرف کٹے میں دبا لیتی تھیں۔ اس وجہ سے ایک طرف کھلا بھولا ہوا اور منہ نیچا معلوم ہوتا تھا چنانچہ لاجہ موسیٰ خانم کہلاتیں اور یہ عرفیت اس قدر مشہور ہوئی کہ ان کا اصل نام لوگوں کو بھول گیا۔^۵

ایک اور بہت بڑے فن کار تھے بہرام خان۔ علم موسیقی میں مہارت کی وجہ سے نایک بہرام خان کہلاتے تھے۔ متعدد شہزادے بھی ان فن کاروں سے موسیقی کی تعلیم لیتے تھے۔ خواجہ ناصر نے بر فراق دہلوی نے بہادر شاہ کے ایک پوتے مرزا کالے کا ذکر کیا ہے جو تھور کے بعد لال تلکے سے ستار ہاتھ میں لے کر اور گیر دا لباس پہن کر نکل گئے تھے۔ اسی مجلس میں دعویٰ سمجھتے رہے مگر کسی ریاست کے ساتھ وابستہ ہو گئے۔ ایک روز دہلی کے سامنے اپنا خرد کھارہے تھے۔ دربار میں بہرام خان اور ستار نوازمیاں امرت سین بھی موجود تھے۔ ان کی ایک جیت پڑ جب پوری بزم دلو اور کراٹھی تو بہرام خان بولے "صاحب عالم آپ کی اس تاجن کی تعریف ہو نہیں سکتی۔ اگر آپ لال تلکے میں پیدا نہ ہوتے اور لال پردہ کی آؤ میں اس کام پر لاکھوں روپیہ خرچ نہ کرتے تو یہ لاکھ حارور راگ میں ڈوبی ہوتی کبھی آپ کی انگلیوں سے نہ نکلتی۔" دہلی ریاست نے بہرام خان سے پوچھا

”صاحب عالم کون اور لال قلعہ اور لال پردہ کیم؟“ بہرام خان نے اپنے ہاتھ اپنی پیشانی پر مار کر کہا ”ان ذاتا یہ گہر و جہ بھسوت گئے اور گہر واکہ پڑے پہنے آپ کو ستار ستار ہے جسے دلی کا بادشاہ زاد اور بہادر شاہ ابو ظفر کا قرچی رشتہ دار ہے۔ مرزا کالے ان کا لاؤ لانا م ہے۔ میں نے انھیں بادشاہ سلامت کے پہلو میں مسند پر بیٹھا دیکھا تھا۔ لاکھوں روپیہ خرچ کر کے اس ہنر کو انھوں نے استادوں سے سیکھا تھا۔ دن رات لال پردہ میں بیٹھے اس کام کو کیا کرتے تھے۔“ بہرام خان کی اس گفتگو نے اہل محفل کے دلوں کو ہلا کر رکھ دیا۔ دیر تک ٹانا رہا۔ دلی نے خود بخود کرفیرواے کے گتے میں ہاتھیں ڈال دیں اور رونے لگا اور مسند پر بٹھا کر کہا یہ آپ کے بڑوں کی پیشی ہوئی گدی ہے۔“

استاد بہرام خان ایک روز کسی راجہ کی محفل میں بیٹھے تھے جو تین بھی بھلیا کرتا تھا۔ راجہ اپنی بین کاری کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے طار تھا۔ استاد برداشت نہ کر سکے اور بولے ”راجہ صاحب آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ تین کس لیے بنائی گئی ہے اور کس نے بنائی ہے۔“

راجہ بولے ”استاد آپ ہی جانتے ہوں گے کہ کیوں بنائی گئی۔“

بہرام خان نے کہا ”تو سنیے بادشاہوں کی محفلوں میں گویے گاتے تھے تو انھیں قوسنے کی اجازت نہ تھی اور اگر گلدان نہ ملتا تھا اور گانے میں گویے کو تھوک بہت آتا ہے اس لیے گویے کی جان پر بن جاتی تھی اور دربار میں گانا دو مگر ہو جاتا تھا۔ ناچار محفل مند لوگوں نے یہ بین بنائی اور دو تھو تھیاں اس میں کھلے مت کی ایسی لگائیں جہاں گلدان کا کام دیں اور محفل میں جو لوگ بین کار کے دربر و ہوں انھیں قوسنے کی خبر نہ ہو۔“

بین ذلیل چیز ہے۔ میں تین دن میں کتوں کو بین سکھا دیتا ہوں۔“ راجہ کو سخت غصہ آ پاس نے کہا ”مجھے یہ قناشا ضرور دکھائیے کہ آپ تین دن میں کتوں کو بین کیونکر سکھا دیتے ہیں۔“ استاد نے کہا ”سرکار شاستروں میں آیا ہے کہ مور کھ آدی قتل اور گدھے اور کتے سے بدتر ہے آپ ایسا ہی ایک مور کھ آدی ڈھونڈ لیجئے اور تین دن کے کھانے پینے کے بعد دوست کے ساتھ پہرا لگا کر میں ایک مکان میں بند کر دیجئے اور تین دن بعد ہم استاد شاگردوں کو طلب فرمائیے اور جلا کو بھی بلا لیجئے اور اگر میرا دھوئی قلعہ ہو تو میرا سر کٹوا دیجئے۔ چنانچہ طوطے میں سے ایک اسحق سا بھیں کو بہرام خان کے سپرد کیا گیا وہ انہوں نے تین ہی دن میں اپنا دھوئی بچ کر دکھایا۔ جب راجہ نے ہاتھ جوڑ کر کہا ”آپ میرے نزدیک نا ٹیک کیا کرشن سمجھا ہیں۔“

غالب نے اپنی ایک غزل کے لیے سر بھی تجویز کیا ہے۔ نواب امین الدین احمد خان کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

”ذیل حاضر ہاش و ہار اسد الملی یعنی علانی مولائی نے اپنے موکل کی خوشنودی کے واسطے فقیری گردن پر سوار ہو کر ایک اردو غزل لکھوائی۔ اگر پسند آئے تو مطرب کو سکھائی جائے جھوٹی کے اونچے سروں میں دھر رکھوائی جائے۔ اگر جیتا رہا تو جائزوں میں آ کر میں بھی سن لوں گا۔“

میں ہوں مشتاقِ جہاں مجھ پہ جہاں اور سہی
تم ہو پیدا ہو سے خوش اس سے سوا اور سہی

۲۶ جولائی ۱۸۶۵ء^۹

اصواتِ موسیقی کے ساتھ ایک فارسی غزل بھی غالب نے لکھی ہے۔ اس کے چند اشعار درج ذیل

ہیں:

بلد من عاشقِ دائم ہے تا با یا ہو
باغِ حسنِ مقام ہے تا با یا ہو
خلعتِ کمر میں روشنی طبعِ نگر
چشمِ آبِ حیاتم ہے تا با یا ہو
عالمِ تکتہٴ خطاب نہ بھوں حافظ
ایلِ شاعرِ حاتم ہے تا با یا ہو^{۱۰}

حوالہ جات

- 1-2۔ خطوطِ غالب مرتبہ قلامِ رسول میر۔
- 3۔ بزمِ آفرینشی فیض الدین اردو اکادمی۔
- 4-5-6۔ تکتہٴ معلیٰ کی جھلکیاں عرشِ تیموری۔
- 7-8۔ لال قلم کی ایک جھلک حکیم خواجہ ناصر بنیر فراق۔ دہلوی۔
- 9۔ خطوطِ غالب مرتبہ قلامِ رسول میر۔
- 10۔ سہدائین مرزا اسد اللہ خان غالب۔ پنجاب یونیورسٹی لاہور۔

نخستین و برفاب

سامانِ خود و خواب کہاں سے لاؤں آرام کے اسباب کہاں سے لاؤں
روزہ مرا ایمان ہے غالب لیکن نخستینہ و برفاب کہاں سے لاؤں
(دیوانِ غالب)

”میرن صاحب کو دعا پہنچے۔ بھائی میرن! اب وہ خُس کا پردہ کھول ڈالا۔ صافیاں بگھمیر رہی ہیں۔ دم پدم بگھومتا ہوں۔ وہ لو کہاں جبروے سے لپٹ کر صافی کو لگے آ کر اور پانی کو خشکا کرے؟ وہ پانی جو میر مہدی اور تم اور حکیم جی پیا کیے ہو اب کہاں؟ برف چند روز دن کی اور باقی ہے۔ آنکھ وہ خدا رزاق ہے۔“
(حکام میرن صاحب)

دلی کا موسم اپریل کے آغاز سے گرم ہونا شروع ہوتا تھا اور جولائی کے شروع میں سون سون کے آغاز تک شدید گرم رہتا تھا۔ پارخوں کی آمد سے یہ کسی حد تک خوشگوار ہو جاتا تھا۔ صاحبانِ حیثیت اہل دلی گرمی سے بچاؤ کے لیے گھروں میں تہہ خانے بنواتے تھے اور جو تہہ خانے نہ بنا سکتے وہ خفخانے بنواتے تھے۔۔۔۔۔ گرمی کا مقابلہ کرنے کے لیے برف تو ضروری تھی ہی۔

اکڑ بڑے گھروں میں بڑے بڑے تہہ خانے ہوتے تھے۔ تہہ خانوں کا وہج حرارت اوپر کے گھروں سے دس درجے کم رہتا تھا۔ سمجھا سمجھ دلی کی ایک حویلی کا ذکر کرتا ہے جہاں تہہ خانے میں ایک مکمل گھر تھا۔ متعدد کمرے، راہداریاں، نظام گردشیں، نشست گاہ، طعام گاہ، وغیرہ۔ مشرقی رخ پر آسمان کی سمت کھلنے والے دو بڑے روشنی اندر لاتے تھے اور ہوا کے رخ کھلنے والی کھڑکیاں راہداریوں میں ہوا کی آمد و رفت کو چھٹی جاتی تھیں۔

یہ تو خیر ایک بڑے گھر کا تہہ خانہ تھا۔ عام تہہ خانے روشنی اور ہوا سے محروم ہوتے تھے۔ عام آدمی کی رسائی میں تہہ خانے نہ تھے لیکن خفخانے تو وہ بنائے جکتے تھے۔ گھروں کے دروازوں یا کھڑکیوں پر ہوا کے رخ خُس کی نیلیں لگا دی جاتیں۔ خصوصاً بالائی منزلوں پر واقع گھروں پر اور پھر ان پر دھتے دھتے سے پانی چھڑکا

جاتا تھا۔ ان ٹیگس سے گزر کر آئے والی ٹھوس بہاری ہوا کی مانند خوشگوار ہوتی تھی لیکن اس میں ایک قباحت تھی کہ خس اور پانی کا بندوبست تو آپ کر سکتے ہیں لیکن ہوا آپ کی دھڑس میں نہیں۔۔۔ ابھی آپ نے پڑھا حضرت غالب فرما رہے تھے کہ وہ لو کہاں۔۔۔؟

سو جب ہوا نہ چل رہی ہو یا جس آلود موسم ہو تو نہ سنا نہ بیکارا اہل یورپ جو روشنی اور تازہ ہوا کو پسند کرتے تھے اور اہل ہند کی مانند تاریک تہہ خانوں اور کونوں کھدروں کے عادی نہ تھے اور خٹکانوں کو تہہ خانوں پر ترجیح دیتے تھے۔ انہوں نے اس مسئلے کا حل بھی نکال ہی لیا۔ اہل ہند کے قدیم وقتی چنگھوں اور امراء کے گھروں میں چھتوں سے لٹکتے ہوئے موٹی چادروں کے چنگھوں کے اصول پر جنہیں نوکر مسلسل جھلاتے رہتے تھے انہوں نے ہوا پیدا کرنے کے لیے ایک مشین بنائی۔ اگرچہ اسے بھی نوکر ہی کھاتے تھے لیکن بھلا ہندوستان میں نوکروں کی کیا کمی تھی؟

ہوا پیدا کرنے والی اس مشین کو تریاق صحت Thermantidote کہا جاتا تھا۔³

ایک بڑا سا پیپ جس کے اوپر ہوائی بجلی کے پروں جیسے پر لگے ہوتے تھے اور ایک وینڈل۔۔۔ پیپے اور وینڈل کے درمیان لکڑی کی گراہیاں جیسے رہت کی ہوتی ہیں انہیں پچکا کر دیا جاتا تھا چنانچہ معمولی جسمانی طاقت سے بہت ساری ہوا پیدا کر لی جاتی تھی۔ اس ہوا کو لکڑی کے ایک پائپ سے گزرا کر خس کی جالیوں پر ڈالا جاتا تھا۔ نوکر باری باری اسے کھاتے رہتے تھے۔

قلعہ معلیٰ کے وسیع دھڑیل سنگ مرمر کے پیلاہوں کی طرز پر امراء کے گھروں میں مختلف طول و عرض کے چھوٹے بڑے سنگ مرمر کے پیلاہ ہوا کرتے تھے۔ سنگ مرمر کے ذریعے پیلاہ کے فرش تک اترتے پاس ہی کھواں ہوتا تھا نوکر کونہیں سے ڈول کھینچ کر پیلاہ کو پھیر دیا کرتے تھے اور آقا محرم سے ڈبکیاں لگا کر مگر کی کا علاج کرتے رہتے۔⁴ عام آدمی کو اس کام کے لیے جتنا جانا پڑتا یا پھر سلطان جی کی پاؤں پر۔

بارے کچھ ذکر بر قلاب کا ہو جائے۔۔۔ منغل بادشاہ کشمیر یا گڑگھال سے ڈاک کے ذریعے برف منگوایا کرتے تھے تبھدا اس یہ پہنچا طریقہ ترک کر دیا گیا۔۔۔ برف سرد موسم میں یا محفوظ کی جانے لگی۔ اس کام کے لیے مٹی کے ساچے بنائے جاتے۔ دبھر اور جنوری کی ان راتوں میں جب ہوا کھرا آلود مرطوب ہوتی ان سانچوں میں پانی بھر کر رات بھر کے لیے باہر رکھ دیا جاتا۔ یہ کام بڑے منظم طریقے پر کیا جاتا۔ برف سازی عموماً دہلی دہواڑے اور ترکمان دہواڑے کے درمیانی علاقے میں ہوتی تھی۔ جب موسم سازگار ہوتا تو آبدار وحوالہ بھاتا تھے سن کر مزدوروں کی ٹولیاں مقررہ مقامات پر پہنچ جاتیں۔ سانچوں میں پانی بھر کر انہیں باہر کھلے میں رکھ دیا جاتا۔ برف ساز ہسکونی گاؤں کے پاس ہوتے تھے۔ صبح صبح گرم چادروں میں لپٹے مزدور سانچوں میں سے برف نکالتے۔ عموماً باہر سانچے میں ڈیڑھ جانچ موٹی برف کی تہہ بھی ہوتی تھی۔ اس مرحلہ تا برف کو محفوظ کرنے کا۔۔۔ اسے گاڑے سے بٹے کمروں میں کھدے گڑھوں میں منسود کیا جاتا۔ ان کمروں کی چھتیں خس و

خاشاک کی موٹی تھوں سے بنی ہوتھیں۔ گڑھوں میں برادہ گولے اور بھوسے کی تھیں، کوٹ کر کھجان کی گئی سخت برف کے ارد گرد ہوتھیں۔ موسم گرما میں ان گڑھوں سے ضرورت کے مطابق برف نکال لی جاتی۔ عموماً یہ ذخیرہ اگست کے آخر تک چل جاتا تھا^۳۔

برطانوی دور میں تو پاکستان برف ساز کمپنیاں بن گئی تھیں جو اپنے اراکین کو ان کے حصص کے حساب سے برف فراہم کرتیں۔ عام ہندوستانی کے لیے تو برف ایک عیاشی تھی لیکن پھر پی لوگوں کے لیے یہ ایک نامزد میرچر تھی۔

۱۸۵۷ء میں دہلی کے محاصرے کے دوران انگریزوں کو جو بڑی تکالیف پیش آئیں، ان میں سے ایک برف کی عدم فراہمی تھی۔

۱۸۴۳ء میں امریکہ سے ایک جہاز برف لے کر ہندوستان آیا جس کا گورڈوں نے خوب جشن منایا اور جہاز کے پکٹان کو گورنر جنرل نے ٹھکرے کا خط لکھا۔ بعد ازاں جہازوں کے ذریعے بھی برف منگوائی جاتی رہی^۴۔

حوالہ جات

۱- خطوط غالب مرحلہ غلام رسول مر۔

2- Twilight of Mughals Percival Spear.

3- ایضاً

4- ایضاً

5- ایضاً

6- ایضاً

قلعہ معلیٰ اور شہر دلی کے مشاعرے

”مشاعرہ یہاں شہر میں کہیں نہیں ہوتا“ جگمگے میں شہزادگان تیموریہ جمع ہو کر کچھ غزل خوانی کر لیتے ہیں۔ وہاں کے مصرعہ سطرچی کو کیا کیجیے گا اور اس پر غزل لکھ کر کہاں پڑھیے گا؟ میں کبھی اس محفل میں جاتا ہوں اور کبھی نہیں جاتا اور یہ محبت خود چند روزہ ہے اس کو دوام کہاں؟ کیا معلوم ہے اب ہی نہ ہوا اب کے ہوتو آچندہ نہ ہو۔“ (غالب بنام قاضی امداخلیلؒ، جن ۱۸۵۳ء)^۱

کیا یہ غالب کی نظیر ان بصیرت جہتی کہ انہوں نے قلعہ اور شہزادگان تیموریہ کے انجام کو بھانپ لیا تھا۔ یا پھر یہ وہ ہو کہ اس وقت تک قلعہ میں استاد شاہ حضرت ابراہیم ذوق کا طوطی بولتا تھا اور مشاعروں میں ذوق کے حماری غالب کے کلام کو گوش و زبان بند کر کے سنا کرتے تھے یا کبھی کبھار زبان کھولتے بھی تھے تو درازی طعن کے لیے بہر حال اس خط کے تحریر کرنے سے چار سال قبل غالبؒ ”نجم الدولہ“ و ”میر الملک“ خان بہادر اور کلام جنگ بن چکے تھے۔ ”تاریخ تیمور“ یہ لکھنے پر مقرر کیے جا چکے تھے اور قلعہ معلیٰ ان کے لیے مقام معلوم نہیں رہا تھا۔

خانہ ان مظہر کے بانی ظہیر الدین بابر خود ایک اچھے شاعر تھے۔ ان کے ہوتے اکبر اعظم کے دربار کے شعری مصرعے چرخی کا حصہ بن چکے ہیں۔ ان کے بعد بھی قلعہ معلیٰ میں شعر و شاعری ہوتی رہی۔ کئی شہزادے بلکہ شہزادیاں بھی شعر و سخن کا مشغلہ کھتی تھیں۔

لیکن قلعہ میں وسیع پیمانے پر شاعری کا چلن شمشیر و ساقی رخصت ہونے کے بعد عام ہوا۔ تخت طاؤس نادر شاہ افغان لے جا چکا تھا۔ رہاب کے ساتھ کلام موزوں قلعہ معلیٰ کی ”قلعہ بے“ بن چکا تھا۔

شاہ عالم ثانی آنکھوں سے معذور اور شاعری اختیار سے محروم تھے۔ جہاں بانی کے مسائل کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ معقول چٹن کبھی بہادر کی طرف سے ملتی تھی۔ اب شعر و سخن ان کی مصروفیت بن گیا۔ آفتاب گلشن کرتے تھے۔ بیانی سے محروم یہ آفتاب اردو اور فارسی کے ساتھ ساتھ پنجابی اور پنج بھاشا میں بھی اشعار تباہاں چھلکتی کرتا تھا۔ تصوف میں بھی دلچسپی تھی^۲۔

روایتوں کے مظالم کے بعد انگریزوں کے زیر سایہ اپنی اس پڑھ سکون زندگی سے خاصے مطمئن نظر آتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

شب دل آرام سے گزرتی ہے
صبح اٹھ جام سے گزرتی ہے
عاقبت کی خبر خدا جانے
اب تو آرام سے گزرتی ہے

ان کے بزرگوں میں بھی ایک نایاب شاعر اے گزرے ہیں جو شاعر تھے۔ شہزادہ کامران جنہیں ان کے اپنے بھائی اعلیٰ حضرت نصیر الدین صاحبوں نے جوانی سے عہد م کیا تھا۔ انہوں نے اس سانے کی تاریخ لکھی ہے اور کیا خوب کہا ہے^۳۔

دزمس گلاب ارچہ ہاتواں کشید
کشیدہ از زمس من گلاب
اگر از تو ہے سند تاریخ من
مگو کوشدہ دیدہ آفتاب

اگرچہ زمس سے گلاب کشید نہیں کیا جاسکتا لیکن میری زمس (آنکھوں) سے (موت) گلاب کشید کیا گیا۔ اگر کوئی تم سے اس سانے کی تاریخ پوچھے تو کہنا (جب) سورج کی آنکھیں اندھی ہو گئیں۔

ذکر ہو رہا تھا شاہ عالم آفتاب کا۔ جوانی کوٹنے سے پہلے اپنے جد امجد حضرت عالمگیر کی طرح کتابت قرآن مجید روزمرہ کے مشاغل میں شامل تھی۔ ۲۲۳ صفحات کا ایک دیوان چھوڑا۔ ایک مشکوی "مضمون اقدس" کے بھی مصنف ہیں۔ میر تقی میر مرزا رفیع سودا شاہ نصیر جیسے اساتذہ کے علاوہ کئی بڑے شعراء اعظم انشاؤں اور مضمون احسان فراق وغیرہ ان کی محفلوں میں شریک ہوتے تھے^۴۔ ۱۸۰۶ء میں انتقال ہوا۔

شاہ عالم کے فرزند اور جانشین ابوالنصیر مصطفیٰ الدین اکبر شاہ جانی کی علمی استعداد و جنت مکانی والد کے مقابلے میں کم تھی لیکن بہر حال اسی آفتاب کی شعاع تھی۔ شعاع گھٹس کرتے تھے۔ شاہ نصیر میر کاظم الدین مینون اور غالب علی خان سیدان کے دربار کے شاعر تھے^۵۔

نمونہ ملاحظہ فرمائیے:

تجھ زلف کے عہدے سے یہ دل کیونکہ بر آوے
چاشنر نہ چھوٹے یہ بلا جس کے سر آوے
واں بار شعاع ذرہ خط ہم کو کہاں ہے
دن رات جہاں مجھے کوٹس و قر آوے

۲۸ ستمبر ۱۸۳۷ء کو انتقال ہوا۔

ان کے دلی عہد شہزادہ شہر کو دارا اور والدہ دونوں سے زیادہ شہر و خن میں دلچسپی تھی۔ دادا کے چہیتے تھے۔ ان کی محفلوں میں شریک ہوتے تھے۔ جب دادا کا انتقال ہوا تو ان کی عمر ۳۱ سال تھی۔ یوں بھی انہیں تمام علوم و فنون کی تربیت دی گئی تھی۔ شاہ نصیر سے استفادہ خن کیا۔ دور دلی عہد کی میں حضرت ذوق "خاقانی ہند" کا خطاب پا کر قلعے میں آئے تو ان کے شاگرد ہو گئے۔ دلی عہد کی خنوری سے شہر و خن کی محفلوں میں جان پڑ گئی۔ میر و سدا کے شاگرد افتادہ اور مصحفی کے ہم سر وہم عصر سہبائی آذرود اور فضل حق خیر آبادی جیسی منتخب روزگار ہستیاں قلعے کی محفلوں میں شریک ہوتی تھیں۔ عالم "مومن اور شیفتہ ابھی مضر عام پر نہیں آئے تھے۔ اکبر شاہ جانی کا انتقال ہوا تو چوتھرا سالہ شہزادے ابوالفضل سراج الدین احمد بہادر شاہ تخت نشین ہوئے۔ استاد ذوق ملک اشتر اتر پا گئے۔

قلعہ مصطفیٰ کے چند معاصرین کی روداد عالم کی رہائی سنتے ہیں ؟

"مہر کا دن جب رات میں ہل گیا تو بزم خن آراستہ کی گئی چونکہ میں نے مشاعرے کے لیے غزل نہیں کہی تھی تھی دلی کی شرم کے باعث سرنگریاں تھا لیکن نواب ضیاء الدین خان نے ابن و حوائی انہیں سلامت رکھے و فرشتے میرے لیے مقرر کر دیے یعنی زین العابدین خان عارف اور غلام حسن خان محمد۔ یہ دونوں اہرام پیشہ گناشتے میرے خلوت کدہ تنہائی میں آئے اور ہاتھی نے کرائے اور جیسا کہ شیر کو شکار کر کے ہاتھی کی پشت پر بار کر کے لے جاتے ہیں مجھے انہیں میں لے گئے۔ میرے دوستوں میں سے زین العابدین خان عارف اور جواہر سنگھ جو ہرنے زمین طرح میں دو فریسیں پڑھیں اور دونوں پہ اپنی نغز کوئی کا نقش بٹھا دیا۔ میں نے وہ غزل پڑھی جو اس دن کہی تھی۔

سج شہ خیز کہ روداد اثر ہمایم

چارہ بخشہ بہ غول تاب بگر ہمایم

(ہمام مصطفیٰ خان شیفتہ ۱۸۳۳ء ماری سے ترجمہ تھویر احمد طلوی)

"نکل کہ ستارہ تابید کا دن تھا (بدھ) عہد شام میں حضرت آذرود کی بزم میں بار یاب ہوا۔ اس سے خوش کہ حرف دعا میری زبان پر آتا میں نے رنجوری کے آ جا کر کو اپنے خندہ کی پیشانی پر آ نکار پایا۔ نزلہ زکام کی شکایت تھی اور اس کا اظہار ہو رہا تھا کہ کئی راتیں انہوں نے جاگ کر کاٹی ہیں۔ مختصر یہ کہ مشاعرے میں تحریف نہیں لے گئے اور مجھے جانے کی رخصت دی۔ میں نے مشاعرے میں ریختہ گوین کا مجمع دیکھا۔ ایسی ایسی غزلیں ان لوگوں نے پڑھیں۔ غزل خوانی کے سلسلے میں جب مجھ تک نوبت پہنچی تو میں نے "ملک نہ خواست ملک نہ خواست" زمین میں گئی ہوئی اپنی غزل سنائی۔ اس کے بعد طرح پرانگی ہوئی قاری غزل پڑھی۔"

(ہمام شیفتہ ۱۸۳۳ء ماری سے ترجمہ تھویر احمد طلوی)

”جھوٹا دن تھا جب بزمِ سخن کی نوید سناؤ افروز ہوئی۔ شام کے وقت ہی دو مبارک فرشتے سے آئے اور مجھے اپنے ساتھ اس انجمن میں لے گئے۔ میر نظام الدین مینون اور مولوی امام بخش صہبائی کی طبیعت ناساز تھی اس لیے نہیں آ سکے۔ حضرت آزاد کو بلانے کے لیے آ دی بھیجا گیا۔ اگرچہ میر سے آئے لیکن ان کی آمد نے میر سے دل کو صفا اور میری زبان کو نوا بخشی۔ اس بندہ عاجز کو ”گریمتن“ دانی زمین میں قصیدہ کہنے کا اتفاق ہوا۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ اس دلی کو ناپسندیدہ محتاج کی طرح داناؤں لے جاؤں اور رشتہ گویوں کو دوسرے جگہ لے کر دوں۔ حضرت آزاد کے آنے سے میر ا دل بڑھ گیا اور میری زبان کو مزہ مٹنی کی اجازت مل گئی۔ سماجی بھی بن بلانے وہاں حاضر تھا اور اس زمین ”گریمتن“ میں اس نے بھی ایک غزل کہی تھی جب میر سے قصیدے کو سنا تو شرمندہ ہوا اور اپنی کہی ہوئی غزل کے چند اشعار کا کرواہیں لوٹ گیا۔“

(بنام شیخو ۲۶ مئی ۱۸۴۲ء)

”یہ بات نزدیکیوں کے واسطے باعثِ مسرت اور دورِ داناؤں کے لیے ایک گونہ بشارت ہے کہ بادشاہ سپہ پناہ نے فرمان جاری کیا اور ناظر بارگاہِ سخن و دلی کو اپنی نظارت میں اس امر کی اطلاع دی کہ جھوٹے دن نامزدی کی کچھیں تاریخ کو اس مجلسِ نظمیں میں آئیں اور جامِ سخن میں سے ایک دوسرے کے ساتھ دواوینائی کریں۔ شہزادگان باہرہ کی ایک جماعت اور آزادگانِ شہر میں سے کچھ اشخاص جمع ہوئے۔

سب سے پہلے سلطان الشعراء حضرت ابراہیم ذوقی نے حضرت وللا کی غزل اس خوش الحانی کے ساتھ چڑھی کہ ہر جو مغنیہ فلک ہے آسمان سے نیچے اتر آئی۔ بعد ازاں شیخو ابوسف دیار دایوں آ جاؤ مرزا خضر سلطان بہادر نے اس طرح چارہ میں اپنی غزل پیش کی کہ گویا اپنے اشعار کو ہر ثار کی صورت میں بساطِ بزم پر ستاروں کی بارش کر دی۔ اس کے بعد میرزا حیدر شکوہ مرزا نور الدین اور میرزا عالی بخت نے کہ عالی شخص کرتے ہیں اساتذہ سخن پھیراؤ و نغزات شعر کو بلند آہنگ کیا۔

غالب آشفندہ نوائے کر مرزا عالی بخت کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا اپنی طرف سے دس شعر اس بزمِ سخن میں پیش کیے۔ جموی نامی ایک امر نے کہ غم کدہ صہبائی کے سے نوشوں میں ہے اپنی صدائے طللانہ کے ساتھ اہل محفل کو متوجہ کیا۔ مرزا عالی شہرت نے کم و بیش ستر شعر اہل محفل پر اپنی غزل طرح میں چڑھی اور سامعین انجمن کو اپنا یہ شمار غزائے تھنہ پیش کیا۔ میں آپ گزاری کا بہانہ کر کے محفلِ سخن سے باہر آیا اور اپنے غم کدے کی راہ لی۔ دکانوں کے در کھلے ہوئے تھے اور چراغ روشن تھے۔ ابھی یہ کہیے نصف شب کا وقت نہیں گزرا تھا۔ میں نے پورے بے دریائی پر اپنی محفلِ سماجی۔ دو چار جام بے لور بارہ تاب کی جرہ کشی کی۔ بعد صبح بھر اہل محفل (کھڑے) میں گیا۔ چاروں محفلِ شہزادوں نے جن کے نام پہلے آچکے ہیں از سر نہ کیا نہ کا تارہ کیا۔ میں بھی دوبارہ غزل سرا ہوا۔“

(بنام میر ہمدانی بھڑا کر ترحیل اکبر نور احمد علوی)

شاہ نصیر کے ہاں ہر ماہ میں دو بار مشاعرہ ہوا کرتا تھا۔

راجم الدولہ ظہیر دہلوی نے داستانِ خدر میں ایک محفلِ مشاعرہ کا ذکر کیا ہے جس کا اجتمام حافظ قطب الدین شیر علی شاہ نصیر نے شاہ صاحب کے مکان پر کیا تھا۔ اس میں دیگر نامور شعراء کے علاوہ خاقانی ہند و دلی اور انواب مرزا خان داس بھی شریک محفل تھے۔ ظہیر دہلوی نے بھی اپنی غزل سنائی۔ اس وقت ان کی عمر چودہ سال تھی۔ (اللبابِ محفل ۱۸۳۹ء میں ہوتی تھی)¹¹۔

شہر میں مختلف خن پروروں کے ذاتی مکانوں کے علاوہ دلی کالج میں بھی مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ مفتی صدر الدین آزاد و اور انواب مصطفیٰ خان شیفتہ کے ہاں ہر ہفتے باری باری مشاعرہ ہوتا تھا جس میں امام بخش سیہانی، عبداللہ طوی، غالب، ذوق، احسان، نسکین، حکیم آغا جان بیٹش اور خود شیفتہ و آزاد و شریک ہوا کرتے تھے۔¹²

حوالہ جات

- 1- خطوطِ غالب مرتبہ نظامِ رسول مہر۔
- 2- بہادر شاہ ظفر از اسلم پروج۔
- 3- تاریخِ سندھ از اعجاز الحق قدوسی۔
- 4- بہادر شاہ ظفر از اسلم پروج، تاریخِ ادب اردو از رام پالہ سکیٹ۔
- 5- تاریخِ ادب اردو از رام پالہ سکیٹ۔
- 6- بہادر شاہ ظفر از اسلم پروج۔
- 7- بیچ آجک۔ مرزا اسد اللہ خان غالب۔ ترجمہ ڈاکٹر خواجہ احمد طلوی۔
- 8 11۱۵ ایضاً۔
- 12- اردو شاعری کا تنقیدی مطالعہ از ڈاکٹر سنبل بکار

شہزادہ جواں بخت کی شادی اور ایک ادبی معرکہ

خوش ہو اے بخت کہ ہے آج ترے سر سہرا
باندھ شہزادہ جواں بخت کے سر پہ سہرا

(غالب)

”حضور انور نے نواب احمد علی خان کی صاحبزادی کو ساتھ خطاب نہنت محل کے ممتاز کیا اور پانچ سو روپے نکو اور بیگم صاحبہ موصوفی کی اور پانچ سو نکو ان کے لواحقین کی مقرر کی۔ سات لاکھ روپے مہر یا عہد“^۱
(دہلی اردو اخبار ۲۲ نومبر ۱۸۳۰ء)

اس شادی کے وقت بہادر شاہ ظفر کی عمر ۶۵ سال جبکہ نہنت محل بیگم کی ۱۹ سال تھی۔ بادشاہ سلامت نہنت محل پر بے حد فریفت تھے۔ ان کے لیے دہلی کے بازار لال کنواں میں ایک شاندار حویلی تعمیر کرائی گئی۔ ایک بار آپ مسلسل بارہ روز تک نواب نہنت محل بیگم کی حویلی میں پڑے رہے اور تمام مصروفیات روزمرہ کی ترک کر دیں۔ ایک اخبار نے تو طنز یہ لکھا کہ بیگم صاحبہ موصوفی کی حویلی کے خاک روپ نے تھانے میں رہت درج کرائی ہے کہ بارہ روز سے بادشاہ دہلی کا قیام بیگم نہنت محل کی حویلی میں ہے، خدا را ان کو لال قلعہ واپس لے جایا جائے۔^۲

(خلاصہ اخبار ۱۲ اپریل ۱۸۳۹ء)

ان ہی بیگم نہنت محل کے ظن سے ۱۸۳۱ء میں شہزادہ جواں بخت نے جنم لیا۔ کسمن شہزادے ایک بار جس خاک و احتشام کے ساتھ پانی بت تشریف لے گئے اس بارے میں بہادر شاہ ظفر کے روزنامے ۱۰ اکتوبر ۱۸۳۵ء میں تحریر ہے:

”مرزا جواں بخت بہادر شہزادہ خود سال نے دستار زیب سرفراہ کر اور طرہ عقیش و دشالہ شالی رومال قبائے نواب سپہ اور ششیر سداقم جواہر خلعت حاصل کر کے اور چار پیرہ اور بیس سوار اور ہاتھی سواری کے واسطے ساتھ لے کر مزار انور بار حضرت شاہ ولی قلعہ نور اللہ مرقدہ پر حاضر ہونے کی اجازت حاصل کی۔ اجازت

دی گئی اور شہزادہ پانی پت کی طرف روانہ ہو گئے۔^{۳۱}

۱۸۳۹ء میں دلی عہد شہزادہ دارا بخت کا انتقال ہوا تو بادشاہ نے کبھی بہادر کی منظوری کے بغیر ہی بڑے بیٹے مرزا اختر و اور دس دیگر بیٹوں کو نظر انداز کرتے ہوئے مرزا جواں بخت کو دلی عہد بنانے کا اعلان کر دیا۔ ۹ فروری ۱۸۳۹ء کو مرزا جواں بخت درگاہ قدیم شریف جانے لگے تو دلی عہد کے جلوس کا سامان پچاس سو راور چار شاہی نشان انھیں دے دیے گئے۔^{۳۲}

۱۶ مارچ کو دلی عہد مرحوم کی سواری کی پاکی اور ہماری مرزا جواں بخت کو عطا کی گئی۔ مرزا اختر و نے اپنی حق طلبی کے خلاف کبھی حکام کو درخواست دی۔ بادشاہ سلامت سے جواب طلبی ہوئی تو انہوں نے ایکٹ بہادر کو لکھا کہ مرزا اختر و کم اصل سے ہیں جبکہ شہزادہ جواں بخت کی والدہ فرزند محل احمد شاہ ابدالی کی اولاد میں سے ہیں اور پھر مرزا اختر و بخوان ہیں جبکہ امیر تیمور کے وقت سے خاندان میں رسم چلی آ رہی ہے کہ کوئی بھی شہزادہ جس کا کوئی عضو نکلتا ہوا ہو تخت پر نہیں بیٹھ سکتا۔^{۳۳}

۱۸۳۹ء میں بادشاہ سلامت نے ملکہ معظمہ کو ایک خط لندن ارسال کیا جس کے ساتھ مرزا جواں بخت کے چٹکا کا نشان بھی بھیجا گیا اور لکھا گیا کہ میں یہ ہاتھ ملکہ کے ہاتھ میں دیتا ہوں اور دست گیری کی امید رکھتا ہوں۔ لیکن ۱۸۵۶ء میں مرزا اختر و کی بطور دلی عہد تقرری کی منظوری گورنمنٹ نے دے دی۔^{۳۴} اسی سال گیارہ برس کی عمر میں شہزادہ جواں بخت کی شادی ہوئی۔

راحم الدولہ ظہیر الدین ظہیر دہلوی شادی کی تقریبات کا حال بیان کرتے ہیں:

”ہر چند کہ تقریبات بسیار پرست ہائے ہندوستان میں نظر سے گزر رہی مگر کبھی شادی ہند پر و جمل مرزا جواں بخت بہادر کی ہوئی ایسی رعینا محفل تقریب دل فریب با جاہ و چشم اس دریاؤں کے ساتھ کہیں نظر سے نہیں گزری۔ بیان تکلفات و مسماہات مسندی و برسات و آرائش شہر و روشنی خاراخاند چات و طیر و فضول جان کر قلم اعجاز کیا جاتا ہے۔ البتہ وہ امر قابل نگارش ہیں۔ ایک یہ کہ قریب محفل سب سے جدا گانہ تھا۔ بیان کی بارہ دری میں جدا جدا محفلیں ترتیب دی گئی تھیں۔ ہر در میں ایک طاقتور جدا قلم کرتا تھا۔ شاہزادگان کی محفل جدا تھی۔ ملازمین معززین کی انجمن جدا فرق سپاہ کی بزم جدا تھی۔ اہل شہر کے لیے عجم عام تھا کآئیں اور قاضی قلم و سرور سے مخلوط ہوں۔

دعا سامان پر ہی بیکر ہر طرف سرگرم ناز و لہا تھیں و سر جہان نامید و حمہ ہر دار۔ دس بارہ روز تک یہ محفلیں گرم رہیں۔ کل ملا زمین شادی اور دوسرے شہر کے لیے تو رہ جات کا عجم تھا جس کا جی چاہے نہ رنقد رو ہے۔ تو رے کی قیمت نے خواہ تو رہے۔ چنتے قلم کے نوکر تھے نام بنام سب کے تو رے تقسیم کیے جاتے تھے۔ شلا میر سے والد کا تو رہ جدا میر سے نام جدا میر سے چھوٹے بھائی کے نام جدا وہ بھی نوکر تھا۔ میری والدہ کے نام جدا کیونکہ ایک خزانہ ان کے نام کی بھی تھی۔ میں نے مہتان تو رہ ہندی سے کپڑا بھیجا کہ آٹھ روز بعد ایک تو رہ

بھجوا دیا کہ وہ اس دریاؤنی سے تقسیم توروہ جات کی ہوئی تھی کہ جس روز توروہ آتا تھا تمام مزین و اقارب دوست اسباب کے گھر کھانا تقسیم ہوا کرتا تھا۔ ایک توروے میں طعام اس قدر ہوا کرتا تھا کہ ایک محلل غلم سیر ہو کر کھالے۔ سیرے مکان کا تمام والاں بھر جاتا تھا۔ ایک ایک ملہاق میں پانچ پانچ سیر کھانا ہوتا تھا۔ چار چار پانچ پانچ طرح کے پٹاؤ رنگ رنگ کے ٹٹے چاولی سرخ، سبز، زرد اور بے پانچ سیر کی ہاقر خانی ایک شیریں ایک خشکین اور کی قسم کے نان غرض اقسام خوردنی سے کوئی شے باقی نہ رکھی گئی تھی۔ مختصر یہ کہ کسی ریاست میں ایسی پر تکلف کوئی تقریب نظر سے نہیں گزرتی جو اس مکی گزری سلطنت میں دیکھنے میں آئی۔ اس کے علاوہ جن شعراء نے قصائد جنینیت اور سیرے وغیرہ لکھے تھے ہا جو یکے ملازم تھے مگر سب کو صلے میں خلعت و انعام عطا ہوئے۔ شاگرد پیش کو جوڑے تقسیم ہوئے۔^{۱۲}

اس مکی گزری سلطنت کو اس پر تکلف تقریب پر جو اخراجات کرنا پڑے وہ قرض لے کر کیے گئے تھے اور اس قرض کی ادائیگی کے لیے عمل سمجانی کو گورنر جنرل تک سے مدد مانگنا پڑی تھی جو محسوس کرتی تھی۔^{۱۳} شعراء نے جو قصائد جنینیت اور سیرے لکھے وہ تاریخ کا حصہ بن گئے بلکہ ایک عظیم ادبی مسرے کی شکل اختیار کر گئے۔ غالب اور ذوق دونوں قلمد معنی کے ملازم تھے۔ ذوق استاد شاہ و بیکہ غالب تاریخ نویس۔ کلکد بنت عمل نے غالب سے سہرا لکھنے کی فرمائش کی۔ غالب نے قبول میں یہ سہرا گزرا:

خوش ہو اے بنت کہ ہے آج ترے سر سہرا
باندھ شہزادہ جواں بنت کے سر پہ سہرا

مقطع تھا کہ:

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرف دار نہیں

دیکھیں اس سیرے سے کہ دے کوئی بہتر سہرا

شاہ نے سہرا دیکھا تو گمان گزرا کہ ہم پہ چٹک ہے۔ گویا استاد شاہ کو چٹخ ہے اور شاہ کے بارے میں ہے کہ وہ طرفدار ذوق ہیں جبکہ سخن فہم نہیں۔ چنانچہ استاد کو طلب فرمایا اور سہرا انہیں دکھا کر کہا استاد تم بھی ایک سہرا لکھ دو ورنہ قطع پہ نظر رکھنا۔

اللہ دے اور بندہ لے۔ ذوق کو موقع چاہیے تھا بھرور دلیق اور قافیہ موجود تھے۔ ذوق نے چٹخ قبول کیا اور دل لگا کر جوابی سہرا لکھا۔ آخری شعر تھا:

جس کو دھونی ہے سخن کا یہ سنا دو اس کو

دیکھ اس طرح سے کہتے ہیں سفنور سہرا

سہرا اخباروں میں چھپا دیا گیا۔ ادیبانہ نقطہ کو دیا گیا کہ بالا خانوں پہ گائیں۔ ایک ہی دن میں سہرا زبان رو عام ہو گیا۔ غالب نے موقع کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے ایک قطعہ بطور معذرت بادشاہ کی

منظور ہے گزارش احوال واقعی
اپنا بیان حسن طبیعت نہیں مجھے
سو پشت سے ہے پیش آیا ہے مری
بکہ شاعری ذریعہ عزت نہیں مجھے
استاد شہ سے ہو پرغاش کا خیال
یہ تاب یہ حال یہ طاقت نہیں مجھے
سرا کھسا گیا درد احتمال اور
دیکھا کہ چارہ غیر اطاعت نہیں مجھے
مقطع میں آ پڑی ہے غنم مستقرانہ باب
مقصود اس سے قطع محبت نہیں مجھے
جام بہاں نما ہے شہنشاہ کا خمیر
سوگند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے
ردائے غنم کسی کی طرف ہو تو رویا
سودا نہیں جنوں نہیں دھشت نہیں مجھے
قسمت بری سہمی پہ طبیعت بری نہیں
ہے شکر کی جگہ کہ شکایت نہیں مجھے
صادق ہوں اپنے قول میں غالب خدا گواہ
کہتا ہوں جاکر جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

نقاد کہتے ہیں کہ ذوق کا سہرا غالب کے سرے سے بڑھ گیا لیکن یہ بھی تو دیکھئے کہ بادشاہ نے خود دلچسپی لے کر یہ سہرا کھسکایا اور سرے کی اشاعت و اہتمام و دفاع میں کوئی کسر اٹھانہ لگی چنانچہ غالب کا سہرا اس مصنوعی چمک دمک کے آگے ماند پڑ گیا۔ لیکن گزارش احوال واقعی میں جس جرأت دے پاکی کا اعتبار غالب نے کیا ہے اس کی مثال نہیں ملتی۔ رہتی دجا تک غالب نے شاہ اور استاد دونوں کو کٹھرے میں کھڑا کر دیا ہے۔ آجے دیکھیں غالب خود اس قہقیرے پہ کیا فرماتے ہیں۔ نواب انوار الدین شاہ شمس کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

”ایک زمانہ ہو گیا کہ میں داستان سرائی سے کوئی سروکار نہیں رکھتا۔ یہ شہر یاہر سلیمان پیش کا رکی رضا جرنی کا باعث ہے کہ میں گاہ گاہ روایت کی طرف مائل ہو جاتا ہوں۔ خاص طور پر ملکہ عالیہ کی فرمائش کی قبول کے سبب ہوتا ہے۔ اس روایت فاردا کے ساتھ روئے مجھے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ مقطع غزل میں میں نے ایک نعرہ

مستانہ کے طور پر "ہو" کی ہوگی کہ اس شخص نے اپنے کمال کے ذمہ میں جو دراصل اسے حاصل ہی نہ تھا یہ خیال کیا کہ میرا وہ سخن اس کی طرف ہے۔ ایک غزل کے مطلع میں متمیزہ کاری دیکھنا سنانی کے انداز میں کام فرمائی کی اور اس لہجہ میں بات کی گویا وہ مجھے اس کا جواب دے رہا ہے تو میں نے یہ سبق کے عالم میں فوج سے کہ میرے خاصہ بے پردا غرام کے شحات ہیں۔ مغل سخن میں پیش کیے۔ یہ مصرعہ "آچہ درگفتار غرقت آں نیک من است" اسی سے تعلق رکھتا ہے۔ میں نے اس کے بعد کچھ نہیں لکھا۔^{۱۱}

دہلی اور دہلی اخبار ۱۸۵۲ء کی اشاعت میں اس مصرعے کی تفصیل شائع ہوئی۔ غالب کا سہرا ذوق کا جوانی سہرا غالب کا قلعہ چھاپے کے لیکن اس میں ایک مصرعہ موجود دیوان سے خاصا مختلف ہے۔

سو پشت سے ہے پیشہ آبا سپہ گری
کچھ شاعری ذریعہ عزت نہیں مجھے

کی بجائے یوں ہے:

سو پشت سے ہے پیشہ آبا سپہ گری
علم و کمال و فضل سے نسبت نہیں مجھے^{۱۲}

مرزا جواس بخت کی شادی کی تقریبات کے ضمن میں شہید دہلوی نے ساجد مہندی برات وغیرہ کو فضول رسوم کہہ کر قلم اٹھا دیا ہے۔

سہرا احمد دہلوی نے اپنی کتاب "رسوم دہلی" میں ان پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔

ساجد کے حوالے سے انہوں نے لکھا ہے کہ قلعہ میں اس موقع پر بہادر شاہ ظفر کا پایا ہوا جب زلی شادیانہ گایا جاتا ہے۔^{۱۳}

محل شادی ظفر آج بھی ہو کل بھی ہو
گھر ترا شادی کا گھر آج بھی ہو کل بھی ہو
رات کو ہو رنجا صبح کو صبح شہا
دوم یہ شام و سحر آج بھی ہو کل بھی ہو

آخر میں یہ تذکرہ خارج از موضوع نہ ہو گا کہ ۱۸۵۷ء کے فخر کے بعد جب بہادر شاہ ظفر کو درگھون جلاوطن کیا گیا تو ان کے ساتھ خواب زینت گل بیگم کے علاوہ شہزادہ جواس بخت اور ان کی دلہن زبانی بیگم بھی تھیں۔ ۱۸۶۹ء میں شہزادے کو قید سے رہائی ملی۔ تین سو روپے ماہانہ پنشن مقرر کی گئی۔ شہزادے کے دو بچے تھے۔ ایک لڑکا اور ایک لڑکی۔ ۱۹ ستمبر ۱۸۸۳ء کو گلست خور دہلیادشاہ ابو ظفر کا یہ بخت جواس صرف ۳۳ سال کی عمر میں بخت اور جوانی دونوں سے محروم ہو کر جلا وطنی میں چل بسا اور دلی سے بہت دور برما میں پولین کے مقام پر دفن ہوا۔^{۱۴}

حوالہ جات

- 1- بہادر شاہ ظفر از اسلم پروج۔
- 2-3-4 بہادر شاہ ظفر کے شب و روز از ضیاء الدین الہوری بہادر شاہ ظفر از اسلم پروج۔
- 5- بہادر شاہ ظفر کے شب و روز از ضیاء الدین الہوری۔
- 6- بہادر شاہ ظفر از اسلم پروج۔
- 7- داستانِ غدر از قائم الدولہ قسمر دہلوی۔
- 8- بہادر شاہ ظفر از اسلم پروج۔
- 9- آبِ حیات از محمد حسین آزاد۔
- 10- اردو کے ادبی سفر کے از محمد یعقوب ماسرا از ترقی اردو بیورو نئی دہلی۔
- 11- فتحِ آہنگ از مرزا اسد اللہ خان غالب۔
- 12- غلامانِ غالب از نادم بیجاوی۔
- 13- رسومِ دہلی از سید احمد دہلوی

قلعہ معلیٰ کے القاب و خطابات

عجم الدولہ دیر الملک، اسد اللہ خان، بہادر نظام جنگ

”اس گوشہ نشینی میں جو میرا مسلک اور معمول ہے، بادشاہ سلامت نے مجھے دربار میں بلایا۔ خلعت اور خطاب عطا فرمایا اور اپنے بزرگوں کی حکومت و سلطنت کے حالات کھینچ کر سامور فرمایا۔ میں نے دل میں کہا، اے غالب! علقہ سر منصب غنی گشتری کی آمدورکنا ضروری ہے اور اگرچہ افسانہ سرائی آزاد مردوں کا شیوہ نہیں، طعنہ زنیوں کو بھی موقع نہیں دینا چاہیے چنانچہ مہدم فیاض کی توفیق سے کتاب کا وہ حصہ پڑھوؤں کے اسلوب کو قائم رکھتے ہوئے ختم ہو گیا جو حمد، نعت، مدح، سلطان، خطاب زمین یوں، سبب، تالیف اور امیر، تہجد و صاحب قرآن، حضرت ظہیر الدین، دیر اور حضرت نصیر الدین، ہمایوں کے حالات پر مشتمل ہے اور یہ حصہ کاغذ کے آٹھ جروں میں آیا اور صفی نگاری کا حسین مرقع ہے۔“^۱

(مکتوب، نظام تنقزل حسین خان ۱۸۵۱ء)

بادشاہ سلامت کے روحانی پیشوا حضرت غلام نصیر الدین عرف کالے صاحب اور معالج شاہی حکیم احسن اللہ خاں کی کوششوں سے غالب کو عجم الدولہ دیر الملک، خان بہادر نظام جنگ کے خطابات عطا ہوئے۔ ملک اشعراء غافقی ہند امین الدولہ کو اس قسم کے خطاب سے کیوں نہ نوازا گیا... شاید اس لیے کہ وہ شیخ اور سپاہی زادے تھے جبکہ غالب ترک اشراقیہ میں سے تھے؟ بہادر شاہ ظفر کے عہد پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ ان کے ہاتھ سے سلطنت چاہی گئی تھی، صرف قلعہ بجا تھا اور چند بارخ اور ایک اکا ہندھا و خلیفہ، لیکن دربار شاہی کو انہوں نے اس وضع سے چلایا جیسے کوئی صاحب سلطنت بادشاہ چلاتا۔ خطابات اور خلعتوں ہی کو لیجئے۔

۱۹ جون ۱۸۳۹ء، ”احسن الاخبار“ کی خبر^۲

”اب سے پہلے جہاں پناہ شاہ دہلی رہنے لے، نہٹ دہلی کو اس خطاب سے یاد کرتے تھے۔ فرزند ارجمند معظم الدولہ امین الملک، انحصار دارخان، طاس تھا، ٹپلس، ملکاف، بہادر، فیروز جنگ۔ آج ارشاد عالی ہوا چونکہ

انہوں نے قلعہ کی مرمت و دوسری کاکافی انتظام کر دیا ہے شاعی دیہات کے انتظام و انصرام اور بعض دوسرے کاموں کے سرانجام دینے میں امید سے زیادہ کوشش کی ہے اس لیے میں ان سے بہت زیادہ خوشنود ہوا۔ اس کے بعد حکیم احسن اللہ خاں کی طرف خطاب کر کے فرمایا:

”مجھے صاحب کلاں معظم الدولہ بہادر کی خیر خواہی اور ہمدردی سے بہت خوشی حاصل ہوئی۔ اس لیے دفتر خانے میں حکم دے دیا جائے کہ ان کے چورے القاب کے ساتھ ”فرزند ارجمند بھیاں بیچہ سلطانی“ بھی ضرور رکھا جائے۔ اب سارے القاب کی یہ صورت ہوئی فرزند ارجمند بھیاں بیچہ سلطانی معظم الدولہ امین الملک اختصار میں یا رخاں طامس شہا فیلس ملکاف بہادر فیروز جنگ۔“

لیکن خاکسار ایچے ”احسن الاخبار“ اپنے ناظرین کی خدمت میں عرض گزار ہے کہ اتنا لمبا چڑا القاب لکھنے سے طوالت ہوتی ہے اور بعض لوگ پڑھتے ہوئے ٹکھراتے ہیں اور شکایت لکھ کر بھیجتے ہیں اس لیے لوگوں کو سمجھانے کے لیے ان کا نام نامی صرف ”مستم الدولہ بہادر دام اقبال“ تحریر کیا جائے گا۔ ناظرین نوٹ کر لیں اس اختصار میں کام نکل جائے گا۔ اور ناظرین کا فضول وقت ضائع نہ ہوگا۔“

اپنے فرزند مرزا محمد شاہ رخ بہادر مرحوم کے فرزند ان کو محمد نے ”مخلصین اور خطابات عطا کیے۔“

”احسن الاخبار“ کی اور چار دہ:

”مرزا محمد شاہ رخ بہادر مرحوم کے بیٹے صاحبزادے کو بادشاہ سلامت نے طلب فرما کر سواروں کی بخشی گری کا منصب عطا کیا جات پدہ کی کتاب کی قبا سر تم جواہر و دشاں دستار سر بہت سپر شیر گھوڑا پاتھی مرحمت فرمایا اور

”قرہ ہامرہ خلافت“ قرہ ہامیرہ دولت“ شیریشہ شہامت“ شہسوار میدان شہامت غنفر الدولہ“ شمس الممالک“ منیف الزماں مرزا محمد عبداللہ شاہ بہادر کے خطاب سے سرفراز فرمایا۔ مخلص صاحبزادے کو بھی تمام کارخانوں کا دیوان مقرر فرما کر

”نور مدینہ شیربادی“ نور دینہ کامگاری“ میر سپر رفعت“ باد منیر دولت“ رفیع الدولہ“ قطب الممالک“ نور الزماں“ مرزا محمد مظفر بخت بہادر کے خطاب سے معزز و مظهر فرمایا اور ایک کتاب کی قبا و دشاں سر تم جواہر دستار سپر گھوڑا پاتھی سمان مرحمت ہوا۔ سب سے چھوٹے صاحبزادے کو سیاہیوں کی پلٹن کی بخشی گری کے عہدے پر مقرر کیا اور ایک کتاب کی قبا و دشاں سر تم جواہر دستار سپر گھوڑا پاتھی مرحمت فرمائی اور گوہر درج خلافت“ اختر برج سلطنت“ یکہ تاز میدان شہامت“ جنگ در پائے شہامت“ منیف الدولہ“ نور الممالک“ مکی الزماں“ مرزا محمد غلام بخت بہادر کے خطابات سے سربلند فرمایا۔

(۱۳۰۰ء پرل ۱۸۴۷ء)^۳

شاعی حکیم احسن اللہ خاں کو جن خطابات و القابات سے نوازا گیا وہ تھے۔

”اعظم انجمنہ حاویٰ الزمان انتحاب الملک احرام الدولہ تحیم احسن اللہ خان بہادر نائب جنگ۔“ (۱۰ اپریل ۱۸۳۹ء)^۶

مرحوم شہزادے کے بچنے والے صاحبزادے کے تمام کارخانوں کا ویران مقرر کیے جانے کا ذکر ہے۔ کارخانہ جات کی تفصیل ظہیر دہلوی نے یوں بیان کی ہے:

”نامہ نگار خانہ خاصہ خروآب دارخانہ دودخانہ قوشخانہ خواہرخانہ سلاح خانہ اصطبل خانہ سانی قیل خانہ کبھی خانہ توپ خانہ شترخانہ کارخانہ جلوس نامی مراتب (چتر و علم) بخشی خانہ فرج کتب خانہ کبوتر خانہ داروغہ تندر دوا داروغہ فرش خانہ پاکلی خانہ داروغہ کھارائ داروغہ خاص پروازائ جھدار صوبان نواب ناظر افسر خواجہ سرایان۔۔۔“^۷

ملک کے اصل حاکم اور مالک ان کھیل قماشوں کے خاتمے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ آہستہ آہستہ وہ قلعہ معلیٰ کے گرد و قریب کتے چارہ تھے۔ شاہ کو بتا دیا گیا تھا کہ آپ کے بعد آپ کی اولاد کو قلعہ خالی کرنا ہوگا۔ ”فرزندار محمد بیہاں بیخود سلطان“ مسٹر جاس ملکاف کے بڑے بھائی چارلس ملکاف جب اکبر شاہ خانی کے عہد میں ریڈینٹ مسٹر جن کے نائب تھے وہ اس وقت لکھ چکے تھے۔

”میں اس پالیسی کے ساتھ موافقت نہیں کرتا جو زمین صاحب نے شاعی خاندان کے ساتھ اختیار کر رکھی ہے۔ جو شخص برٹش گورنمنٹ کی طرف سے دہلی میں بھرتائی کے لیے مقرر ہو وہ بادشاہ کی تنظیم اس طرح کرتا ہے جس سے بادشاہی قوت کے بیدار ہونے کا اندیشہ ہے حالانکہ ہم اس کو ہمیشہ کے لیے سلا دیتا جاتے ہیں۔“^۸

عیدین نوروز اور بادشاہ کی سالگرہ پر ریڈینٹ کی معرفت گورنر جنرل اور کمانڈر انچیف کی جانب سے بادشاہ کو تہنیتی کی جاتی تھی۔ لارڈ ایلن برائے اسے بند کر دیا۔ بعد ازاں بادشاہ کو کھیتی کے عہدے اوروں کو خطابات دینے سے منع کر دیا گیا۔

بادشاہ اپنے اخراجات پورے کرنے کے لیے قرضے لینے پر مجبور تھے۔ انہیں محض سوالات کا روپے میں بدولت ملتا تھا جبکہ محض دہلی کی چنگی کی آمدنی بادشاہ کے دھنیے سے زمین سے چار گنا زیادہ تھی۔ ۱۸۳۰ء میں یہ آمدنی چھتیس لاکھ نو ہزار پانچ سو اکیس روپے جبکہ ۱۸۳۶ء میں چھیالیس لاکھ اسی ہزار سو ستاون روپے تھی۔ دوسری طرف قرض خواہ بادشاہ کے خلاف دعوے دائر کر رہے تھے۔

۱۶ اپریل ۱۸۳۹ء ”احسن الاخبار“ کی ایک خبر:

”آج فوجداری کے اسٹنٹ صاحب نے پکھری اچھلتی کے دوسرے کمرے میں ان قرض خواہوں کے بیانات قلم بند کیے جن کے قرضے بادشاہ سلامت کے ذمے ہیں۔ حکم ہوا کہ قرضے کے کچے کاغذ حاضر کریں اور نہ پھر ان قرضوں کی نشوونما ہوگی۔“^۹

آخر ۱۸۵۷ء کی رستخیز نے بادشاہ کو بھارت دلا دی۔ قرضوں سے بھی اور قلعے سے بھی۔ ۱۷ اکتوبر ۱۸۵۷ء کو انھیں دہلی کو بھیٹ کے لیے خبر یاد کئے پر مجبور کر دیا گیا۔ وہ رگون جلا وطن ہو گئے جہاں ۱۰ نومبر ۱۸۶۲ء کو قید فرک سے ایٹھ کے لیے چھوٹ گئے اور۔۔۔ قید حیات سے بھی۔

مقروض و غلیفہ خوار مرحوم بادشاہ کے مقروض قاتل خوار استادا اور شاہی مورخ کی حالت دارو کیجئے۔ وہ یہ کہتا نظر آ رہا ہے:

”یہاں خدا سے بھی توقع باقی نہیں رہی۔ مخلوق کا کیا ذکر۔ کچھ ہی نہیں آتی۔ آپ اپنا کشائی بن گیا ہوں۔ رنج و ملت سے غرض ہوتا ہوں۔ یعنی میں نے اپنے کو اپنا غیر تصور کیا ہے جو کہ مجھے پہنچتا ہے کہتا ہوں الو غالب کے ایک اور جوتی تھی۔ بہت اتراتا تھا کہ میں بڑا شاعر اور فارسی دان ہوں۔ آج دور دور تک میرا جواب نہیں۔ اب قرضہ داروں کو جواب دے۔ سچ تو یہ ہے غالب کیا مرا بڑا اٹھ مرا بڑا کا فر مرا ہم نے ازراہ تعظیم جیسا بادشاہوں کو بعد ان کے جنت آرام گاہ عرش نشین خطاب دیتے ہیں، مجھ کو یہ اپنے گوشہ ہمدردی جانتا تھا۔ ”مستقر“ اور ”باوہ زادیہ“ خطاب تجویز کر رکھا ہے۔ آئے غم الدولہ بہادر ایک قرض دار کا کریبان میں ہاتھ ایک قرض دار بھوک سنا رہا ہے۔ میں ان سے بچھڑ رہا ہوں مگر حضرت نواب صاحب ”نواب صاحب کیسے اور غلام صاحب آپ سلوٹی اور افراسیابی ہیں۔ یہ کیا بے حشرتی ہو رہی ہے۔ کچھ تو اکسو کچھ تو بولو۔ بولے کیا بے حیا ہے غیرت کو کھٹی سے شراب“ گندمی سے گلاب بڑا اسے کپڑا میوہ فردش سے ام صراف سے دام قرض لیے جاتا تھا یہ بھی سوچا ہوتا کہاں سے دوں گا۔“

(مکتوب بہام قریباں علی بیگ سالک ۱۸۶۳ء)

۱۳ سال پیچھے جائے اور ملحد کھینچے کہ کس آن و بان اور کروڑ سے انھیں غم الدولہ لگی اور خان بہادری مل رہی تھی۔ ”مہر نمرود“ میں لکھتے ہیں:

”۲۳ شعبان ۱۲۶۶ھ مطابق ۳ جون ۱۸۵۰ء آفتابِ فراگاہ ماہ (برج ثور) میں مہمان تھا اور چاند نشین زہرہ (برج حمل) سے مہمان کو نگاہ محبت سے دیکھ رہا تھا۔ کھوان برج حمل میں راہ نور و اور مشتری برج سنبلہ میں خرمالیں۔ مرغی برج اسد میں زہرہ کے ساتھ اور عطارد و جوزا میں تکیا پر شاہاں۔ شہنشاہ ایسے وید بے کے ساتھ کہ گویا آفتاب بیت شرف میں تخت پر جلوہ افروز اور میں ایسی خوشی کے ساتھ کہ گویا عطارد ہوں صمیم دل سے رو برو کھڑا ہوں۔ شاہی کارکن مجھے بادشاہ کے حکم سے خلعت خانے میں لے گئے اور میرے قاصد کو خلعت شش پارچہ سے آراستہ کر کے سلام گاہ میں لائے۔ دنیا و دین کے بادشاہ نے اس بخشش آئیں ہاتھ سے کہ جس کی جھلکی ایسا دریا ہے کہ سات دریا اس کے مقابلے میں کف آب جگر گوشہ ہائے معدن۔ معنی جیدہ اور سرچ میسر ہے سر پر باندھا اور رنگ جان ابر نیسان یعنی ابر خاندی رنگوں سے چپکے ہوئے موتی بساط پارگاہ کے گوشے پر بیکھریے اور غالب سخن سرا کو غم الدولہ ویر الملک نظام جنگ کے خطاب سے پکارا۔ اس خطاب

سے جو میں نے ورنہ لو آؤ آؤ غالب سے پایا کیونکہ کہوں کہ اپنے آپ کو آؤ غالب کے برابر اہل بیت عطار کا ہم چلے پایا۔ شاہانِ جمہور کی تاریخ لکھنے کا فرمان میرے نام صادر ہوا اور میرے چرخ (عطار) کو تاکہ رنگ سے اس کا دل خون نہ ہو۔ میری پیچکاری پر ماسور کر دیا۔ نامہ نگار کا بھی ایسا ہی انداز تھا اور نظم بھی ایسا ہی ہوا کہ اس غزوہ فرزند کتاب کا آؤ آؤ بادشاہ وستم سرہنگ حاتم و خلیفہ خوار و دار اور بان اسکندر پیچکاؤ آؤ آؤ سانوں اور سات ستاروں کے منظور نظر اور شش بہت اسیں ولا تھوں کے حاکم صاحب قرآن روشن گہرا میر کا تیمور نام جو نام آؤ کے (نام سے) جو زندگی میں کیوں کے برابر بلند گل اور ستاروں بھی انجمن رکھنے والے تھے اور بعد مرگ آپ کو شہ سے میراب اور جنت میں اقامت گزری ہیں۔ اس طرح بیان کیا جائے کہ فردوسی کا شاہ نامہ تقویم پارینہ بن کر رہ جائے۔¹¹

۱۵ جولائی ۱۹۵۰ء کے اسد اللہ خاں میں غالب کی نظم الدو گلی اور خان بہادری کی خبریں شائع ہوئی: ”ان دنوں شاہ ادبی پناہ نے جناب معنی القاب مرزا اسد اللہ خاں غالب کو یہ فرط عنایت اپنے حضور طلب کر کے ایک کتاب تواریخ کے لکھنے پر جو تیمور کے زمانہ سے سلطنتِ حال تک ہو مامور کیا اور اس کے کاتبوں کے خرچ کو بالفعول پچاس روپے مشاہیر مقررہ کے آئندہ انواع پرورش کا موقع کیا اور نظم الدو گلی ویر الملک اسد اللہ خاں بہادر نظام جنگ خطاب دے کر چھ پارچہ کائیش بہا خلقت اور تین رقم جواہر عطا فرمائے۔ یقین ہے کہ تواریخ نہ کوئی دلی چپ ہوگی کہ ہر ایک اس کے لطفِ مہارت سے فیض یاب ہوگا۔“¹²

حوالہ جات

- 1- بیخ آؤ چک مرزا اسد اللہ خاں غالب۔ ترجمہ ڈاکٹر محبوب احمد بلوئی۔
- 2-3-4 بہادر شاہ ظفر کے شب و روز از ضیاء الدین لاہوری۔
- 5- داستانِ خدوا از رقم الدو گلی طبع در بلوئی۔
- 6-7-8 بہادر شاہ ظفر از اسلم پرویز۔
- 9- بہادر شاہ ظفر کے شب و روز از ضیاء الدین لاہوری۔
- 10- شلوٹ غالب۔ مرتبہ نظام رسول میر۔
- 11- میر ضرور مرزا اسد اللہ خاں غالب۔ ترجمہ پروفیسر سید عبدالرشید۔
- 12- بعدہ ستانی اخبار دہلی محمد شفیق صدیقی۔

دہلی کالج اور دہلی سوسائٹی

اٹھویں صدی کی پانچویں دہائی میں دہلی کالج کی تنظیم نو کی جا رہی تھی۔ سیکرٹری گورنمنٹ ہند مسٹر ٹامس ہارڈین کے امتحان کے لیے دہلی آئے ہوئے تھے۔ مقصد تھا سو روپیہ ماہوار پر ایک فارسی مدرس کا تقرر۔ تین نام تجویز کیے گئے تھے۔ غالب، مومن اور صہبائی۔ نام تجویز کرنے والے حضرات آزموہ نے غالب کے علمی تہم کی کچھ زیادہ تحریف کی تھی چنانچہ سب سے پہلے انہی کو طلب کیا گیا۔ آپ پاگل میں سوار ہو کر کالج پہنچے اور بھاگ بھاگ پر اس انتظار میں رہے کہ حسب دستور سیکرٹری صاحب ان کے خیر مقدم کو آئیں گے۔ جب دیر ہوئی تو سیکرٹری صاحب نے دریافت کیا کہ غالب کیوں نہیں آ رہے؟ تاخیر کی وجہ معلوم ہوئی تو انہوں نے کہلا بھیجا کہ جب آپ دربار گورنری میں تحریف لائیں گے تو آپ کا اسی طرح استقبال کیا جائے گا لیکن اس وقت آپ نوکری کے لیے آئے ہیں لہذا اس تنظیم و تہم کی توقع نہ رکھیں۔

مرزا صاحب نے جواب دیا کہ گورنمنٹ کی ملازمت کا ارادہ اس لیے کیا ہے کہ اعزاز کچھ زیادہ ہو نہ اس لیے کہ موجود اعزاز میں بھی فرق آئے.....

صاحب نے کہلوایا کہ ہم قاعدے سے مجبور ہیں۔ مرزا نے جواب دیا تو پھر ہمیں بھی خدمت سے معذور سمجھا جائے..... پاگل میں سوار ہوئے پردے برابر کیے اور یہ جاوہ جا..... بعد ازاں امام بخش صہبائی کو فارسی کا استاذ مقرر کیا گیا۔

دہلی کالج کا قیام ۱۸۴۵ء میں عمل میں لایا گیا۔ امیر علی دروازہ میں واقع مدرسہ غازی الدین حیدر کو کالج کا جدید پایا گیا تھا۔ یہ مدرسہ ۹۲ء میں قائم ہوا۔ اس کے بانی تھے نواب غازی الدین خان فیروز جنگ۔ مدرسہ کی عمارت انتہائی شاندار تھی۔ سنگ سرخ سے بنی ہوئی ایک خوبصورت مسجد طلبہ کے لیے عمدہ اقامت گاہ..... بعض مدرسے تو سرحد و بھارہ سے بلوائے گئے تھے۔ یہاں مشرقی علوم و الہیات کی تعلیم دی جاتی تھی۔ ملک میں انگریز پمیلی تو مدرسہ بھی متاثر ہوا۔ یہاں تک کہ ۱۸۴۳ء میں طلبہ کی تعداد صرف نو رہ گئی۔^۲

۱۸۱۳ء کے چارٹر کے مطابق برطانوی ہند میں فردغ تعلیم کے لیے ایک لاکھ روپے سالانہ کی رقم

تخص کی کئی جہتی تھیں اس مجموعہ کو ملٹی جامہ نہیں پہنایا گیا۔

۱۸۴۳ء میں مجلس تعلیم عامہ کی جانب سے جاری کردہ ایک سرکھر میں دہلی میں جدید علوم کی تعلیم کے لیے ایک کالج کے قیام کی تجویز دی گئی۔ دہلی کی مقامی مجلس تعلیم نے جوابی مراسلے میں اس مجموعہ کو سراہا اور واضح کیا کہ وہ اس مقصد کے لیے ساڑھے تین ہزار روپے سپرد کر سکتی ہے۔ سابقہ مدارس کے بارے میں معلومات حاصل کی گئیں۔ ان کے ذریعہ آدنی نظام تعلیم اساتذہ اور طلبہ۔ آخر طے پایا کہ مدرسہ غازی الدین حیدر کی عمارت کولاج کے لیے استعمال کیا جائے اور مدرسے کو کالج کا درجہ دیا جائے۔

۱۸۴۵ء میں کالج کا افتتاح ہوا۔ سترے انچ لیٹر کو جو مقامی مجلس کے سیکرٹری تھے ایک سو پچھتر روپے ماہوار پر کالج کا سیکرٹری کا مہم مقام پر پہل مقرر کیا گیا۔ ہینڈ مولوی کی تنخواہ ایک سو تیس روپے مقرر ہوئی۔ دو مولوی پچاس پچاس روپے ماہانہ اور ہائی ٹیچس اور تیس روپے ماہانہ پر رکھے گئے۔ طلبہ کے لیے وظائف بھی مقرر ہوئے۔ اس تمام کارخیز کے لیے کالج کے لیے سرکار کی طرف سے پانچ سو روپے ماہانہ منظور ہوئے۔^۴

۱۸۴۸ء میں سرچارلس سٹاف برٹش ریڈیٹنٹ کمشنر کی سفارش پر کالج میں ایک انگریزی جماعت کا اضافہ ہوا اور لوکل فنڈ کی تعلیمی بجٹ سے دو سو پچاس روپے ماہانہ خرچہ کالج کے لیے منظور کیے گئے۔ اس ”خدمت“ سے لوگوں میں بڑی بے چینی پھیلی اور ہندو مسلمان دونوں نے اس کی مخالفت کی مگر رفتہ رفتہ یہ تعصب کم ہو گیا۔ اسی سال گورنر جنرل لارڈ ولیمسٹن نے اس ادارے کا معائنہ کیا۔^۵

۱۸۴۹ء میں نواب احمد الدار سید فضل علی خان بہادر وزیر بادشاہ اور نے دہلی کے ریڈیٹنٹ سے یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ ایک لاکھ ستر ہزار روپے اس فرض سے گورنمنٹ ہند کے حوالے کرنا چاہتے ہیں کہ اس کی آمدنی سے دہلی میں مسلمان نوجوانوں کی تعلیم کے لیے ایک ادارہ قائم کیا جائے۔ گورنمنٹ نے نواب صاحب کا شکریہ ادا کیا لیکن جنرل کینیڈی تعلیم عامہ کی مشاورت سے انہیں تجویز دی گئی کہ نئے ادارے کے قیام کی بجائے یہ عطیہ موجودہ دہلی کالج کو دے دیا جائے اور اگر نواب صاحب اس مجموعہ کو منظور کر لیں تو انہیں کالج کے معاملات کا مجتہم یا افسر سمجھا جائے گا اور پروفیسروں کا تقرر ان کے نام پر ہوگا۔ نواب صاحب نے رقم وقف کردی اور اپنے داماد نواب سید حامد علی خان کو مصارف پر نظر رکھنے کے لیے مقرر کیا۔ ایک لوح بیچ کے دروازے پر اندر کی سمت نصب کی گئی جس کا مضمون تھا:

نہ بر لوح نقشے بماند و یک

جزائے عمل بماند و نام یک

یادداشت نواب احمد الدار ضیاء الملک سید فضل علی خان بہادر سراب جنگ کر یک لاکھ ہشتاد ہزار روپیہ برائے ترقی علوم و مدرسہ ہذا واقعہ دہلی خاص مولد وطن خویش بصاحبان کنبی انگریز بہادر تقویٰ بن محمد مقبول گرویدہ در ۱۸۴۹ء۔^۶

اس دہائی سے کالج کی آمدنی میں اضافہ ہو گیا لیکن حقوق حسب وعدہ پروفیسروں اور طلبہ کا تقرر و ادائیگہ صاحب کے نام پر ہونا نہ تھا۔ غالب ان کے نام سے دیئے گئے۔ غواب حامد علی خان نے متعدد بار اس جانب توجہ دلائی لیکن کچھ نہ ہوا البتہ انہیں کالج کیمپل کی کامیابی پر ضرور جانا پڑا تھا۔ اس کیمپل کے دیگر ممبران میں سر قاسم ملکاف، ڈاکٹر ریٹکن اور مسز ای ٹریلین شامل تھے۔

شعبہ علوم مشرقیہ میں عربی، فارسی، فلسفہ اور منطق کے علاوہ زبان اردو میں ریاضی، سائنس، تاریخ، جغرافیہ اور قانون کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔

۱۸۳۵ء میں لارڈ ولیم جیکب نے سائنس اور مغربی ادب کی تعلیم انگریزی میں دینے کا طلبہ کے مطالبہ پر جواب دیا۔ ان مشرقی زبانوں میں کتابوں کی چھاپی اور ترجمے کو موقوف کرنے کا حکم دیا۔ جب آپ کو علم ہوگا کہ لارڈ میکالے سٹر جیکب کے دست راست تھے تو آپ کو ان احکامات پر قطعاً حیرت نہ ہوگی۔ اس وقت کالج میں ۱۸۸ طالب علم پڑھتے تھے جن میں ۱۲۸ ہندو، ۵۳ مسلمان اور ۶ عیسائی تھے۔ "جیکب میکالے اصلاحات" کے نتیجے میں ۱۸۳۶ء میں یہ تعداد ۱۰۳ جبکہ ۱۸۳۸ء کے آغاز میں صرف ۸۳ ہو گئی۔

۱۸۳۹ء میں لارڈ آک لینڈ نے جیکب میکالے اصلاحات کو رد کر دیا۔ مطالبہ بحال کر دیئے گئے۔ شعبہ علوم مشرقیہ میں مشرقی طرز تعلیم کو ترجیح دینے کا حکم دیا جتنا چاہے ۱۸۳۸ء کے آخر میں طلبہ کی تعداد ۱۲۲ ہو گئی۔ یک سوساٹی قائم ہوئی جس نے ہندوستانی زبانوں میں بہت سی مفید کتابیں تیار کیں۔

۱۸۳۹ء میں ایک فرانسیسی ماہر تعلیم مسز ایف۔ جیرو پرنسپل مقرر ہوئے۔ انہوں نے ساہتہ میڈیکل مسز ٹیلر سے بھی مدد کر کالج کی خدمت کی۔

۱۸۴۳ء میں دہلی کو احاطہ بنگال سے الگ کر کے آگرہ کے تحت کر دیا گیا۔ سابق پرنسپل مسز جاسن صوبہ کے لیفٹیننٹ گورنر بن گئے جنہوں نے اردو سکولوں کے قیام کی حوصلہ افزائی کی۔ کالج میں ایک ورنا کولر سوسائٹی قائم کی گئی جس نے جدید علوم کی کتب کو اردو زبان میں منتقل کر کے گراں قدر خدمات انجام دیں۔ اس سوسائٹی کی خدمات ٹکٹ کے فورٹ ولیم کالج سے کہیں زیادہ ہیں کیونکہ فورٹ ولیم کالج کا دور قصوں اور داستانوں کی تحریر و اشاعت پر رہا جبکہ دہلی ورنا کولر سوسائٹی نے علمی اور سائنسی موضوعات پر کتابیں شائع کیں۔ گورنمنٹ خود سوسائٹی کے سرپرست تھے۔

مسز جیرو کے بعد مسز مسٹر مشرقی مسز اسپرنگر کالج کے پرنسپل بنے۔ ان کے دور میں طلبہ کی تعداد میں اس قدر اضافہ ہوا کہ کالج کی عمارت ناگانی ہو گئی۔

اسپرنگر کے بعد مسز کارنگل اور پھر ۱۸۵۲ء میں ایک ماہر مسز ٹیلر پرنسپل مقرر ہوئے۔ یہاں تک کہ ۱۸۵۷ء میں کالج کو نوٹس مارا اور غارت گری کا نشانہ بنایا گیا۔ انگریزی کتابیں پھاڑ ڈالی گئیں اور جلا دی گئیں۔ عربی فارسی اور اردو کتابیں لوٹ کر گورنمنٹ کے مول فروخت کر دی گئیں۔ سائنس ڈیپارٹمنٹ کے تمام آلات

کو توڑ پھوڑ دیا گیا^{۱۲}۔ ۱۸۵۷ء میں کالج بند ہوا تو پھر کچھ سن ۱۸۶۳ء میں جا کر کھلا لیکن اپنی عظمت رفتہ کو نہ پاسکا۔ ۱۸۷۰ء میں طلبہ کی تعداد صرف ۵۵ تھی۔ یہاں تک کہ ۱۸۷۷ء میں کالج کو توڑ کر لاہور کالج میں ضم کر دیا گیا۔ تمام عطلہ اور بھیج دیا گیا۔ اس وقت تک دہلی کو آگرہ سے الگ کر کے پنجاب احاطہ میں شامل کر دیا گیا تھا۔ لیفٹیننٹ گورنر پنجاب تمام انجمنیں اپنے دارالحکومت میں چاہتے تھے اور پھر پرنسپل لاہور کالج مسٹر لائونڈ پنجاب گورنمنٹ میں خاصا اثر و رسوخ رکھتے تھے^{۱۳}۔

دہلی کالج کی خدمات شروع تعلیم اور اشاعت کتب تک ہی محدود تھیں۔ دہلی آؤ کیو یو پبلک سوسائٹی بھی اسی کا فیض تھا۔ اس میں سید احمد خان ماسٹر رام چند اور مولوی ضیاء الدین جنسی جلیوز روزگار شخصیات شامل تھیں۔ سرسید نے محنت شناسی کے بعد دہلی کی قدیم عمارتوں کے بارے میں رپورٹ تیار کر کے سوسائٹی کے سامنے پیش کی جس نے بعد ازاں ”آجر اعلیٰ“ کے نام سے چھپ کر ایک نئی بہا مستند تحقیق کا درجہ حاصل کیا^{۱۴}۔

۱۸۵۷ء میں دہلی کالج ہی کے استاد مولوی محمد باقر نے شمالی ہند کا پہلا اردو اخبار ”دہلی اردو اخبار“ شائع کیا^{۱۵}۔

شعبہ عربی کے صدر مولوی مملوک اعظمی ناٹو تو ہی صاحب جید عالم دین تھے۔ فارسی اور اردو میں کمال رکھتے تھے۔ انہوں نے سنن ترمذی کا ترجمہ اردو میں کیا تھا^{۱۶}۔

مولوی امام بخش مہبائی صدر شعبہ فارسی شاعر ادیب اور مصنف تھے۔ تذکرہ شعرائے اردو تحریر کیا۔ ”صدائق البلاغہ“ کا اردو میں ترجمہ کیا۔ اردو صرف و نحو پر بھی ایک کتاب لکھی^{۱۷}۔

مولوی سبحان بخش بڑک پوری اور دیات الاعیان کے مترجم اور تذکرہ مفسرین اور تذکرہ حکماء کے مصنف تھے^{۱۸}۔

ماسٹر رام چندر پاضی کے ماہر تھے اس علم میں کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ ساکنس کے بھی عمدہ استاد تھے۔ چنڈت رام کشن دہلوی علم طب اصول قوانین دیوانی و فوج واری قواعد صرف و نحو اور علم زراعت پر کئی کتابوں کے مصنف و مترجم تھے^{۱۹}۔

ان کے علاوہ شمس العلماء ڈاکٹر ضیاء الدین پرمیروں پر شاہ مولوی ذکاء اللہ مولوی احمد علی اور مولوی حسن علی خان معروف اساتذہ میں سے تھے۔

کالج کے طلبہ میں جنہوں نے بعد ازاں خاصا نام پیدا کیا شمس العلماء ڈاکٹر نذیر احمد شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ شمس العلماء ڈاکٹر ضیاء الدین اور ماسٹر رام چند ماسٹر پیارے لعل پرمیروں پر شاہ اور موتی لال دہلوی شامل تھے^{۲۰}۔

دہلی کالج کے ماحول اور تعلیم نے جس طرح طلبہ کی فکر کو متاثر کیا اس کی ایک مثال دسمبر ۱۸۳۵ء کا تقریری مقابلہ چیتنے والے طالب علم خواجہ ضیاء الدین ہیں جنہوں نے دلائل کے ساتھ ثابت کیا تھا کہ قوی

حکومت شخص حکومت سے بہتر ہے۔ انہوں نے اپنی تقریر کا اختتام یوں کیا:

”جب ہم ان دونوں حکومتوں کا مقابلہ کر کے دیکھتے ہیں تو ہر طرح سے حکومت قومی حکومت شخص پر ترجیح رکھتی ہے اور محض وکیل اس حکومت کی بدائی پر شہادت نہیں دیتی ہے جس میں خطہ ایک شخص کو اختیار عمل ہو۔“
ہفت روزہ قرآن السعدین میں یہ خیران الفاظ میں شائع ہوئی:

”پامٹ حسن سنی اور خوبی انتظام ہمارے پرنسپل صاحب بہادر کے ۲۴ تاریخ ماہ حال کو عدالت دہلی کے احکام سے بالکل فراغت ہو گئی اور اسی تاریخ کو ہالیان سینی اور اکثر دو سادہ دہلی مدرسہ تشریف لائے اور جلسہ عام میں بعض طلباء نے اپنے لکھے ہوئے مضمون پڑھ کر سنائے۔ خواجہ ضیاء الدین صاحب طالب علم بدامت اول عربی نے جواب مضمون اردو کا اجلاس میں پڑھا ان کو اسی مضمون کے لکھنے پر جناب مفتی صدر الدین خان بہادر صدر العدو دہلی نے تحفہ مغربی عطا دیا۔“^{20A}

ہفت روزہ قرآن السعدین دہلی کالج کے ایک پرنسپل مسٹر اشپر ہگر نے ۱۸۴۵ء میں جاری کیا تھا وہ اسی سال کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے تھے۔ وہ خود رقم طراز ہیں:

”۱۸۴۵ء میں میں نے دہلی میں“ پتی“ سیکرین کی طرز پر ایک ہاتھ پر موقت رسالے کی دہاؤالی اس کا نام قرآن السعدین تھا گو کچھ مشرق اور مغرب مشتری اور زہرہ تھے جن کا قرآن اس رسالے میں ہوا تھا۔ یہ اپنی قسم کی پہلی کوشش تھی۔ گیارہ برس بعد جب میں ہندوستان سے رخصت ہوا تو یہ دیکھ کر مجھے خوشی ہو رہی تھی کہ اس کی تقلید میں بارہ سے زیادہ رسالے لکھ رہے تھے۔“

موجودہ کارس دہلی قرآن السعدین کے بارے میں لکھتے ہیں:^{20B}

”یہ ایک ہاتھ پر اخبار ہے جس میں سائنس، ادب اور سیاست سے بحث ہوتی ہے۔ اس کا مقصد اپنے ہم وطنوں میں مغربی خیالات کی اشاعت ہے۔“ خطبات دہلی

ماسٹر رام چندر نے ۱۸۴۵ء میں چند روزہ ”فوائد الطالبین“ کا اجرا کیا۔ یہ ہاتھ پر علمی اور تاریخی جریدہ تھا۔ سرورق پر یہ مہارت درج ہوا کرتی تھی ”قیامت اس پر چمکی چار آئے“ ماہوار جاری ہوتا ہے مہینے میں دو بار محصول ڈاک ذمہ خریدار۔“

اور اختتام اس طرح ہوتا تھا۔

رام چندر مدرسہ علم انگریزی مدرسہ دہلی کے اختتام سے مطبعی علوم دہلی میں چمپا۔

شروع میں یہ چار صفحات پر مشتمل ہوا کرتا تھا۔ بعد ازاں اسے آٹھ صفحات کا کر دیا گیا۔^{20C}

۱۳ ستمبر ۱۸۶۸ء کے شمارہ میں جدید جغرافیہ پر ایک مضمون ”کرۃ زمین کا حال“ کے عنوان سے چمپا ایک مضمون بین الاقوامی امور پر بعنوان ”حال آغا محمد شاہ ایران کا“ اور ایک معلوماتی مضمون پر عنوان حال مرور یاد یعنی مولیٰ کا تھا جس میں مصنف میں مولیٰ بننے کے عمل کا سائنسی جائزہ تھا۔ اس کے علاوہ اخبار دہلی اخبار دہلی اور اخبار

پشاور کے مہنوں سے سیاسی اور عسکری ڈگریاں تھیں۔ دلی میں لاڈل ڈیوڈی کے قدم چھو فرمائے گاؤں نہایتان میں دیوان مولاج کی بدولت اور کاسمرے کا تہ کر پشاور کی رپورٹ میں سکھ فوجیوں کے بلوے کی رپورٹ تھی۔

فوائد الہا علیہ نے فروغ تعلیم خصوصاً تعلیم نسوان کے حوالے سے بھی گراں قدر خدمات انجام دیں۔ ۱۸۶۶ء کے ایک شمارے میں ماسٹر رام چندرا نے مضمون میں رقم طراز ہیں:

”اب میں جتیم سلطان الاخبار سے سوال کرتا ہوں کہ کیا میب اور قصان تعلیم حاصل کرنے میں لڑکیوں کے لگتے ہیں اور اگر وہ یہ فرمائیں کہ شرع شریف میں پڑھنا ناظم حنفیہ وغیرہ کا لڑکیوں کو جائز نہیں تو یہ بات غلط ہے کہ قدوی بھی چند مسلمانوں سے ملاقات رکھتا ہے۔ اشتہار سے معلوم ہوا کہ شرع شریف میں اس باب میں کچھ نہیں لکھا ہے۔“

۲۸ جولائی ۱۸۶۵ء کو کشف مہلن نے دلی سوسائٹی کا سنگ بنیاد رکھا۔ فروغ علوم اور قلعہ حوی اس کے دو بنیادی مقاصد قرار دیے گئے۔..... باعث ترقی علوم و رقاء عام..... کشف مہلن سوسائٹی کے اولین صدر اور ماسٹر جی اے لال آشوب اس کے پہلے سیکرٹری تھے^{۲۱}۔

سوسائٹی کی کارروائی ضابطہ تحریر میں لائی جاتی تھی اور چھاپی جاتی تھی۔ ایسے ہی ایک مطلوبہ کتاب کی پیشانی پر تحریر تھا۔ ”سوسائٹی کی بزم علمی کا ذکر ہے علوم و حکمت و انکشاف کا ذکر ہے۔“

سوسائٹی کے اولین اراکین میں ۱۷ انگریز اور ۶ ہندوستانی تھے۔ ان میں مرزا غالب اور سرسید احمد خان بھی شامل تھے۔ مرزا الہی بخش شریک صدر جبکہ لال صاحب سنگھ نائب صدر تھے۔ فعال اراکین میں قین سید بیل کشف حضرات لال چھتال، مہیش واس اور نواب شہاب الدین خان ڈپٹی شیخ ولایت حسین شیخ محبوب بخش اور راجندر اسٹھو تھے۔ دیگر معروف اراکان نواب خیاہ الدین احمد خان، مولوی خیاہ الدین، مولوی جعفر علی چنڈت، شہر ناتھ چنڈت کو پال سیہانے، لال دتتر سنگھ نواب نجف خان اور حکیم محمود خان تھے۔

سوسائٹی کی کارروائی اردو میں ہوتی تھی اور اردو ہی میں چھاپی جاتی تھی۔ پہلے دو سال یہ طباعت ”اکمل الطابع“ میں ہوتی رہی بعد ازاں غالب کے ایک شاگرد بہاری لعل مصفاقی کے پریس میں چھاپی جانے لگی۔ اس کی مطلوبہ جات کا حجم پچاس سے ایک سو پچاس صفحات تک ہوتا تھا۔ یہ اس قدر اہم تھی کہ ان کا ذکر ممتاز فرانسسیسی سکر آٹار پلھوٹا وید کے ترجمہ مسودہ گارسیں دتاسی نے اردو لٹریچر کی صورت حال پر اپنے سلاطین پگھڑ میں بھی کیا^{۲۲}۔

۱۱ اگست ۱۸۶۵ء کو سوسائٹی کے دوسرے اجلاس میں نواب شہاب الدین نے اخلاقیات نواب علاء الدین احمد خان طائی نے زبان اردو زمانے جیون لال نے تاریخ زمانے جی لال نے خطوط طاعت لال چند دلال نے دیوناگری زمانے صاحب سنگھ نے مہاجنی نظام، شہر ناتھ نے انتقال جانیدا اور شیخ محبوب بخش نے فروغ تجارت پر گفتگو کی۔ مرزا غالب نے بھی ایک مختصر مضمون پڑھا جس میں خد کا ذکر دلی کے عوام کی مشکلات کا

ذکر آفات ارضی اور بلیات سماوی کا رونق اور سرکار انگریزی سے اپنی وفاداری کا اظہار تھا۔ ۱۸۶۸ء کے ایک اجلاس میں پنجاب میں حقوق مزارعین کے بل پر بحث کی گئی۔ ایک مسکرت سکول کے قیام کی بات ہوئی۔ پنجاب یونیورسٹی دہلی میں قائم کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔

لارڈ بیارے لال نے اہل ہند اور اہل یورپ کے درمیان تعلقات کی بات کی اور تجویز پیش کی کہ یورپی باشندوں کو باقاعدہ ہندوستان میں آباد ہونا چاہیے۔ نسلی امتیازات اور تفضیلات کو ختم کر دینا چاہیے۔ اور کان اس بات پر متفق تھے کہ اگر ہندوستان کو انگریزوں جیسی تعلیم دی جائے تو امتیازات کا خاتمہ ہو جائے گا لیکن حتم علیٰ یہ کہ اسی سوسائٹی کے پلیٹ فارم پر معزز رکن رانے پیش داس نے چھاروں اور بھلی ذات کے لوگوں کو تعلیم دینے کی سخت مخالفت کی اور اسے ”علم کی آلودگی“ قرار دیا۔²⁵

سوسائٹی کے ارکان کی اکثریت ”ہوا خواہاں سرکار“ پر مشتمل تھی جو انگریزوں کی طوفانوں کی کوہنیاں سلجھانے کے لیے تھے۔ انگریز بھی انہیں اہمیت دیتے تھے۔ ۱۸۶۸ء میں مسٹر کلین کرافٹ نے کہا کہ سوسائٹی کوئی زیادہ بہتر کام نہیں کر سکتی کیونکہ اس کے ارکان قدیم معززین ہیں جو اجلاسوں میں مجلس کثرت صاحب بہادر کو تسلیم کرنے آتے ہیں۔

۱۸۶۹ء میں بنگال سے بھولا ناتھ چند دہلی آئے تو انہوں نے سوسائٹی پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ اس نے رائے عامہ بنانے ”عوامی اجلاس بنانے“ لوگوں کو سیاسی شعور اور اپنے حقوق کی آگاہی بخشنے کے لیے اخبارات کے ذریعے اپنے مقاصد کی اشاعت کے سلسلے میں کوئی پیش رفت نہیں کی۔²⁶ سیکرٹری بیارے لال آشوب کا تبادلہ لاہور ہوا تو ۱۹ دسمبر ۱۸۶۸ء کو انہوں نے اپنے صمد سے استعفیٰ دیا۔ اس موقع پر سوسائٹی کے ارکان نے ان کی خدمت میں سپاس نامہ پیش کیا۔ جس پر دھڑا کرتے ہوئے غالب نے تحریر کیا۔

”فقیر اسد اللہ خان غالب کہتا ہے کہ باوجود بیارے لال کی مفارقت کا جو غم و اندوہ ہوا ہے میرا بھی جانتا ہے۔ بس باب میں نے جانتا کہ میرا دہلی میں کوئی نہیں۔“²⁷

غالب سوسائٹی کے قیام سے لے کر اپنی وفات تک اس کے مستقل ممبر رہے اور اس کی سرگرمیوں میں حصہ لینے رہے۔ لارڈ بیارے لال کی جگہ مشن سکول کے ایک استاد اور ایک بے عیسائی لارڈ چند و لال کو سیکرٹری بنایا گیا جسے مسٹر کرافٹ اور مشنری حضرات نے خوش آمد قرار دیا اور موقع ظاہر کی کہ اب سوسائٹی کے پلیٹ فارم پر فروغ و اشاعت عیسائیت کی بات ہوگی جس پر مصلحت نے پابندی مانع کر رکھی تھی چنانچہ سوسائٹی دھڑوں میں بٹ گئی۔ مشنری حضرات کے روپے کے خلاف احتجاجاً مسلمانوں نے سوسائٹی میں دلچسپی لینا کم کر دی اور مسلم ارکان کی تعداد کم ہو گئی۔²⁸

سوسائٹی میں مسکرت اور عربی کی تعلیم کے فروغ پر بھی بات ہوئی جس کے محرک انجیل تعلیم مسٹر ہارنبرٹ تھے چنانچہ لارڈ چٹائل نے دہلی مسکرت سکول کے قیام اور اس کے تمام اخراجات برداشت

کرنے کا اعلان کیا۔ نواب محمد امین آف لوبارد نے اپنے گھر پر عربی سکول کا اجراء کیا۔ مرزا الفی بخش نے ۱۸۵۷ء کے بقیۃ السیف مظلوموں کے بچوں کے لیے عرب مراٹے میں ایک سکول قائم کیا۔ سوسائٹی کی کاوشوں سے شاہی خاندان کی تعلیم یافتہ خواتین کو لڑکیوں کے سکولوں میں ملازمتیں دی گئی۔ بعد ازاں سوسائٹی، دانشورانہ مسائل پر گفتگو کا ایک فورم بن کر رہ گئی۔²⁷

حوالہ جات

- 1- یادگار غالب از مولانا الطاف حسین حالی۔
- 2-3- مرحوم دہلی کالج از مولوی عبدالحق موبین لال کشمیری از ہری رام پیتا۔
- 4- اردو شکر کا تحقیدی مطالعہ از ڈاکٹر سنیل نگار مرحوم دہلی کالج از مولوی عبدالحق۔
- 5- مرحوم دہلی کالج از مولوی عبدالحق۔
- 6- چمک دہلی از میرزا حیرت دہلوی۔
- 7- مرحوم دہلی کالج از مولوی عبدالحق۔
- 8- Delhi, between two Empires. Naraini Gupta.
- 9- موبین لال کشمیری از ہری رام پیتا۔ لیکن بکس ملتان۔
- 10- اردو شکر کا تحقیدی مطالعہ از ڈاکٹر سنیل نگار۔
- 11-12-13- مرحوم دہلی کالج۔ مولوی عبدالحق۔
- 14-15- Twilight of the Mughals. Spear
- Delhi between two Empires. N.Gupta.
- 16-20- مرحوم دہلی کالج از مولوی عبدالحق
- 20A- بعد و حسانی سہافت محمد شفیق صدیقی
- 20B- دلی کالج میگزین قدیم دلی کالج نمبر 1957
- 20C- دلی کالج میگزین قدیم دلی کالج نمبر 1953
- 21-24- Delhi between two Empires. N.Gupta
- 25- مجموعہ نثر غالب مرتبہ فطیل الرحمن داؤدی۔
- 26-27- Delhi between two Empires. Naraini Gupta.

دلی کے کتب خانے کتب زیر مطالعہ غالب، تصانیف غالب

”میرا ایک سہمی بھائی ہے نواب ضیاء الدین خان وہ میری نظم و ستر کو فراہم کرتا رہتا تھا چنانچہ مجموعہ نثر اور کلیات اردو سب مجھے اس کے کتب خانے میں تھے۔ وہ کتب خانہ ذکر کر عرض کرتا ہوں۔ میں ہزار روپے کی مالیت کا ہو گا۔ لٹ میا ایک درہن نہیں رہا۔“^۱

”میرا کام میرے پاس کبھی نہیں رہا نواب ضیاء الدین احمد خان اور نواب حسین مرزا جمع کر لیتے تھے جو میں نے کہا انہوں نے لکھ لیا ان دونوں کے گھر لٹ گئے ہزاروں روپے کے کتب خانے پر باد ہو گئے۔“^۲

نواب ضیاء الدین احمد خان کی لائبریری میں کتب تاریخ کا ایک بہت بڑا ذخیرہ تھا اور بہت سے نایاب قلمی نسخے بھی تھے۔ سیکرٹری گورنمنٹ ہند ایچ ایم ایلیٹ نے اسی کتب خانے سے استفادہ کیا اور ضیاء الدین خان اور دکن کی لائبریری کی مدد سے اپنی معروف تاریخ مہرج کی۔ دیباچہ میں انہوں نے نواب مذکور کی مساعی کا اعتراف کیا ہے۔^۳

غدر کے بعد انہوں نے پھر کتب جمع کرنا شروع کیں اور خاصاً ذخیرہ کتب فراہم کر لیا۔ ان کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادے سعید الدین احمد خان نے یہ ذخیرہ غزوہٴ اہلماہ کو صلہ کر دیا۔^۴

نامیہ ملکاف کے پاس بھی ایک بڑا ذخیرہ کتب تھا۔ اس کا ایک حصہ ملکاف محل میں تھا جبکہ دوسرا حصہ گلشناباغ میں جو قلعہ بنار کے نزدیک واقع تھا۔

مسٹر ملکاف کی بیٹی گھنٹی چن کہ میرے والد اپنی تمام کتب کو خوبصورت روپی چڑے سے جلد بندی کراتے تھے۔ وہ ہر سال انگلستان سے کتابوں کا ایک بڑا صندوق منگواتے تھے۔ ہندوستان میں اپنے چالیس سالہ قیام کے دوران انہوں نے کچیس ہزار کتب پر مشتمل ایک لائبریری قائم کر لی تھی جو ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں غارت ہو گئی۔^۵

مکتبہ محمد فخر محمد سہلوار ڈاکٹر عبدالحق ملک پورہ

یہ دور سانی نامزد

۱۹۹۵

۱۹۹۵

۱۹۹۵

۱۹۹۵

پہنکات غالب و قعات غالب



تصنیف جناب ابجد حسن کا

محمد سادہ قلیان کی طبع سلی من طبع ہوئی

برسکیل تذکرہ یہ بتاتا چلوں کہ مسٹر مظاف ان مسودہ سے چند انگریزوں میں سے تھے جو اپنے تمام عائدانی نوادر انگلستان سے ہندوستان لے آئے تھے۔ وہ نپولین کے ایک بڑے عارج تھے۔ مظاف محل میں ایک نپولین گیلری تھی جس میں نپولین بونا پارٹ کے نوادر جمع کیے گئے تھے اور اس میں نپولین کے کئی مجسمے اور تاباں تصاویر بھی تھیں۔^۶

ایک کتب خانہ دلی کالج کا تھا۔ دلی کالج کی درتیکلر سوسائٹی نے سو سے زیادہ ترے اور کئی دیگر کتب چھاپے۔^۷

شمیری دروازے میں دارالحکومت کے محل کے اندر شاہی کتب خانہ تھا۔ اسی عمارت میں انگلش سوسائٹی کا دفتر بھی تھا۔ کلکتہ سے انگریزی کتابیں یہاں آتیں اور ترجمہ ہو کر ہاتھوں ہاتھ لے لی جاتیں۔ بنگال میں اسی نام کی سوسائٹی محل دلی تھی لیکن دلی کی سوسائٹی پر سائنسی رنگ غالب تھا۔^۸

قلعے میں کتبہ سلطانی تھا جس کی کتب سے ہر دن قلعہ کے تشنگان علم بھی مستفید ہوتے تھے۔ یہاں مطبع سلطانی بھی تھا جس نے غلہ الہی کے دواغ ان کے علاوہ کئی دیگر گراں بہا کتب شیعہ کیں۔ دلی عہد بہادر مرزا فرد کے نام سے فخر المطابع تھا۔^۹

اردو بازار میں کتابوں کی دکانیں تھیں۔ کئی کاتب تھے جو کتب نقل کر کے فروخت کرتے تھے۔ کئی حضرات کرائے پر کتب قارئین کو قراہم کیا کرتے تھے۔

مولانا حالی لکھتے ہیں:

”جس طرح مرزا نے تمام عمر رہنے کے لیے مکان نہیں خریدا اسی طرح مطالعے کے لیے بھی ہاؤس جو دیکھ ساری عمر تصنیف کے شغل میں گزری، کبھی کوئی کتاب نہ خریدی۔ الا ماشاء اللہ۔ ایک شخص کا بھی بیٹہ تھا کہ کتب فروشوں کی دکانوں سے لوگوں کو کرائے کی کتابیں لاویا کرتا تھا۔ مرزا ہمیشہ اسی سے کرائے پر کتابیں منگوا یا کرتے تھے اور مطالعے کے بعد واپس کر دیتے تھے۔“^{۱۰}

غالب کے خطوط سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنی تصانیف کے علاوہ دیگر کتب خرید کر یا کتابوں سے نقل تیار کر دیا کرتے تھے اور ساتوں کو ارسال کیا کرتے تھے۔

غالب نے اپنے مکاتیب میں جن کتب کا ذکر کیا ہے عاشقان غالب کی دلچسپی کے لیے ان کی ایک فہرست درج کی جاتی ہے۔

اکبر نامہ..... ابطال ضرورت..... بوستان سعدی..... بہار نجم..... بوستان خیال..... بیان
جنتانکس..... انشائے ظیل..... تلخہ العراقرین..... تاریخ ابوالہد ام..... تذکرہ صہبائی..... توذک جموری.....
جامع الخوارق..... صمدیہ الحق..... حدائق الاقطار..... جام جہاں نما..... صیوب المسمر..... پستان.....
داستان امیر خسرو..... دماحیر..... داستان المذہب..... دواغ ان حیل..... دواغ ان تاریخ..... دواغ ان حکیم..... دواغ ان

نقد۔ دیوان عالم۔ دیوان حافظ۔ دیوان نظامی۔ دیوان صاحب۔ رقعات جاکیری۔ رومناک
دہلیہ۔ روح الصفاء۔ میر الباقری۔ مردی خن۔ سکندر نامہ۔ شرف نامہ۔ سہیل خان۔ شاہ
نامہ فردوسی۔ شعاع مہر۔ نظریات۔ عجائب القصص۔ سفر نامہ سیاح۔ فرہنگ رشیدی۔ فرہنگ
سرودی۔ فرہنگ جہانگیری۔ فرہنگ اللغات و سائنس۔ فسانہ عجائب۔ قابوس نامہ۔ گلستان خن۔
گلزار سرودی۔ قاسمی و صرہ۔ گلشن بے خار۔ مراد البصاف۔ مصطلحات الشعراء۔ مطلع
الصدق۔ مویہ بردان۔ بحر قاطع بردان۔ معز نامہ۔¹¹

ایک مہم تھا جب اکبر اعظم نے فرہنگ پرکھ لگانے کی تجویز یہ کہہ کر رد کر دی تھی کہ وہ اپنے
خوشنویسوں کو بے روزگار نہیں کرنا چاہتے لیکن دلی کے اس مہمزدال میں یعنی اکبر شاہ جانی کے دور میں یہاں کئی
مطالع قائم ہو چکے تھے اور طباعت کتب کا کام زور و شور سے جاری تھا۔

ایضاً بہادر شاہ کا پہلا دیوان ۱۸۳۵ء میں مطبع سلطانی نے چھاپا۔ دیوان جانی ۵۰-۱۸۳۹ء میں
اسی مطبع سے شائع ہوا۔ ایک ایلیٹیشن مولوی محمد باقر نے مطبع دلی اردو اخبار سے دیوان حضور والا کے نام سے
چھاپا۔ اس کے مؤلف اول یہ ہے عبارت تحریر ہے۔ ”یہ دیوان اول مطبع سلطانی میں چھاپا تھا مگر اکثر جگہ صحت کو نہ
پہنچا تھا سو اب ترمیم و تصحیح اصح الصحفاء مطبع اہل قادیان نے ہندوستان میں مولوی محمد ابراہیم ذوق دام برکات جم بندہ خاکسار چنڈت
مولیٰ لعل پور پبلشر مطبع دلی اردو اخبار مکان مولوی محمد باقر صاحب میں چھاپا ہوا۔“¹²

دیوان سے قبل تصوف پر بہادر شاہ ظفر کی ایک کتاب خیابان تصوف مطبع سلطانی سے ۱۸۳۳ء میں
شائع ہوئی۔ اس سے قبل بہادر شاہ اللغات اور اصطلاح کے موضوع پر ایک کتاب تالیفات ابو ظفری ۱۸۱۱ء میں
اور گلستان سہی کی تصوف شرح ۱۸۱۲ء میں مکمل کر چکے تھے جو شائع ہو گئیں۔¹³

غالب فرماتے ہیں:

طے دو مرشدوں کو قدرت حق سے ہیں دو طالب

لکھام الدین کو خسرو سراج الدین کو غالب

سراج الدین ابو ظفر بہادر شاہ کی تالیفات کا ذکر ہو چکا اب ذرا ان کے مرید کی تصانیف و تالیفات

پہ نظر آلیں۔

اکتوبر ۱۸۳۹ء دیوان اردو کا پہلا ایلیٹیشن مطبع سید لاخار دلی سے طبع ہوا۔

۱۸۳۵ء دیوان قاری مطبع دارالسلام دلی نے شائع کیا۔

۱۸۳۷ء دیوان اردو کا دوسرا ایلیٹیشن مطبع دارالسلام دلی نے چھاپا۔

۵۵-۱۸۵۴ء مہر خرمزہ فخر الطالع دلی سے شائع ہوئی اور ایک ہی سال میں محسن دار شائع

ہوئی۔

۱۸۵۶ء	قادر نامہ غالب۔ مطبع سلطانی دہلی میں طبع ہوا۔
۱۸۵۸ء	دستجو۔ مطبع مفید لطافت آگرہ میں طبع ہوئی۔
۱۸۶۱ء	دیوان اردو کا تیسرا ایڈیشن مطبع احمدی دہلی نے چھاپا۔
۱۸۶۲ء	طالع برہان۔ مطبع اقبال مطبع نوکلشور رکھنؤ۔
۱۸۶۲ء	چوتھا ایڈیشن دیوان اردو مطبع نظامی کانپور
۱۸۶۲ء	پانچواں ایڈیشن دیوان اردو مطبع مفید لطافت آگرہ
۱۸۶۳ء	کلیات فارسی دوسرا ایڈیشن مطبع نوکلشور رکھنؤ
۱۸۶۳ء	شعری ماہر گہر بار۔ اکمل المطابع دلی
۱۸۶۳ء	قادر نامہ۔ دوسری اشاعت اور اضافہ فیضی مجلس پریس دلی
۱۸۶۵ء	سوانح حیدر گڑھ۔ اکمل المطابع دلی
۱۸۶۵ء	دستجو۔ دوسرا ایڈیشن انگریزی سوسائٹی روٹنل کھنڈ
۱۸۶۵ء	دش کا دیوانی۔ اکمل المطابع دلی
۱۸۶۷ء	دعائے صباح۔ منظوم فارسی ترجمہ مطبع نوکلشور رکھنؤ
۱۸۶۷ء	تجہ حیر۔ اکمل المطابع دلی
۱۸۶۷ء	نکات واقعات غالب۔ مطبع سراجی دلی
۱۸۶۷ء	سہد بنگن۔ مطبع محمدی دلی
۱۸۶۸ء	کلیات نثر فارسی۔ مطبع نوکلشور رکھنؤ
۱۸۶۸ء	عمود ہندی۔ مطبع مہتابی میرٹھ (۴۷/اکتوبر)
۱۸۶۹ء	اردوئے معلیٰ۔ اکمل المطابع دلی (۶ مارچ وقات کے ۱۹ دن بعد) 14۔

حوالہ جات

1-2 خطوط غالب مرتبہ نظام رسول میر۔

3- حواشی خطوط غالب میر۔

4- خلاصہ غالب از مالک رام

Twilight of the Mughals. Spear -5

6- ایضاً

7- مرحوم دہلی کالج از مسعودی عہد الحق

Twilight of the Mughals. Spear. -8

9- بہادر شاہ ظفر از اسلم پریچ۔

10- یادگار قالب از الطاف حسین حالی۔

11- غلطو قالب مرتبہ علامہ رسول مہر۔

12-13- بہادر شاہ ظفر از اسلم پریچ۔

14- قالب دروہی خانہ از کالی داس گیتا رشا

دہلی اردو اخبار..... مولوی محمد باقر..... ایک صحافی..... ایک مجاہد آزادی

”میر احمد حسین ولد میر روشن علی خان نے مجھ سے کہا کہ حضرت جب بہادر شاہ تخت پر بیٹھے ہیں تو میں مرشدآباد میں تھا وہاں میں نے یہ سنا تھا۔ ان کے کہنے سے مجھے یاد آیا کہ مولوی محمد باقر نے خبر وفات اکبر شاہ جیلوں بہادر شاہ چنایا تھا اور جیلوں بہادر شاہ کو تبرکے میں ۱۸۳۷ء یا ۱۸۳۸ء میں ہوا ہے۔ بعض صاحب انہار جمع رکھتے ہیں۔ مگر وہاں اس کا پتہ پاؤ گے اور وہ پر چنا اخبار اصل محتشم مجھے بنگلوڑ کے قویہ اکام کرو گے۔“^۱

یہ خط ۱۸ جون ۱۸۵۹ء کو غالب نے نواب حسین مرزا کو لکھا تھا۔ گوری شکر نامی چاسوں نے اپنے روزنامے میں لکھا کہ اسد اللہ خان غالب نے یہ سنا کہ کہہ کر گزرانا تھا:

ہر روز در سکھ کشور ستانی
سراج الدین بہادر شاہ جانی

کشف دہلی نے غالب کو طلب کر کے دریافت کیا تو غالب نے اس الزام سے انکار کیا اور کہا کہ میرے ہاتھ کا لکھا ہوا کاغذ کہیں دفتر میں ہونا چاہیے اور یہ بھی کہا کہ حکیم حسن اللہ خاں سے پوچھ لیجئے۔ کشف اس وقت تو چپ رہا لیکن روپکار میں لکھ گیا کہ یہ جہاں اسد اللہ خان فارسی کا عالم مشہور ہے۔ یہ شخص بادشاہ کا نوکر تھا اور اس نے سنا بھی لکھا۔^۲

ایک اخبار انہار نویس نے یہ بھی لکھی کہ فلاں تاریخ اسد اللہ خاں غالب نے یہ سنا کہ کہہ کر گزرانا

ہر روز در سکھ کشور ستانی

سراج الدین بہادر شاہ جانی

مجھ سے علاء الملاحات کشف نے پوچھا کہ یہ کیا لکھتا ہے؟ میں نے کہا غلط لکھتا ہے۔ بادشاہ شاعر بادشاہ کے بیٹے شاعر بادشاہ کے نوکر شاعر خدا جانے کس نے کہا۔“ (غالب نام نواب حسین مرزا ۱۸ جون ۱۸۵۹ء)^۳

اس حوالے سے غالب مولوی محمد باقر کے ”دلی اردو اخبار“ کا ۲۲ سال پرانا پتہ پتہ ہندوستان کے طول و عرض میں تلاش کر رہے تھے کیونکہ غالب کا خیال تھا کہ یہ عہدیت سکس جلوس کی ہے جبکہ ہندو کے دورانِ جو کہ لکھا گیا اس کی عہدیت تھی۔

چہ زر زر سکے نصرت طرازی
سراج الدین بہادر شاہ غازی

بہر حال اخبار دستیاب نہ ہوا اور غالب راجہ دودھ پاشی رہے۔ لیکن اس خط سے ہمیں یہ پتہ چلتا ہے کہ ۱۸۳۷ء میں مولوی محمد باقر کا دلی اردو اخبار شائع ہوا کرتا تھا اور غالب اس کا مطالعہ کیا کرتے تھے۔ مولوی محمد باقر کے جد امجد محمد شاہ کے عہد میں ایران سے ترک وطن کر کے ہندوستان آئے تھے۔ ان کے والد غلیظ محمد اکبر انک کر اردو پڑھتے تھے۔ محمد باقر نے دلی کالج کے شعبہ علوم شرقیہ میں تعلیم پائی۔ معمولی سرکاری ملازمت سے آغاز کیا پھر ملازمت ترک کی اور صحافت کے ہو کر رہ گئے۔

دلی کالج نے نئے مضامین کی طباعت اور مطبعی فنکارانہ سائنس کے اردو تراجم کے فروغ کے لیے چھاپہ خانہ لگایا۔ اس چھاپہ خانہ میں سو سے زیادہ کتب چھاپی گئیں لیکن معاشی طور پر یہ ایک بوجھ ثابت ہوا کیونکہ کالج سے باہر اس کی شائع کردہ کتب کی زیادہ مانگ نہ تھی۔ نیز طباعت پر بہاری خرچ اٹھتا تھا چنانچہ پہلے مسٹر جیلز سے جان چھڑاتا چاہتے تھے۔ سوائے ان کے پڑھنے والوں نے دوسروں کو فروخت کر دیا گیا۔ خریدار تھے مسٹر جیلز کے دوست مولوی محمد باقر۔ ۱۸۳۶ء میں یہ پریس مولوی محمد باقر کی اندرون کشمیر ورنہ واقع حلی میں نصب کیا گیا اور اس پر ”دلی اردو اخبار“ کی طباعت کا آغاز ہوا۔ یہ شمالی ہند کا اولین اردو اخبار تھا^۳۔

برصغیر کا پہلا اردو اخبار ننگت سے شائع ہونے والا جام جہاں نما تھا۔ دلی اردو اخبار کا سالانہ چندہ بیس روپے تھا جس میں ایک بڑی رقم تھی چنانچہ اسے صرف خوشحال طبقہ ہی خرید سکتا تھا۔ اخبار میں محض خبریں ہی نہ چھپتی تھیں بلکہ اس کا ایک حصہ ادب کے لیے بھی مختص تھا۔ شہزادہ جہاں بخت کے سرے کے حوالے سے ذوق اور غالب کی سرکردہ رائی کی مفصل رپورٹ اس اخبار میں چھپی^۴۔

۱۸۳۰ء میں مسٹر جیلز کے مشورے سے مولوی محمد باقر نے غیر ملکی تاجروں کے لیے ایک سرائے اور ایک عوام گھر تعمیر کیا تھا۔ باہر سے آنے والے تاجر اپنے مال کے نمونے یہاں نمائش کے طور پر رکھتے تھے۔ یہ سرائے دلائی مال کی ایک بڑی منڈی کی حیثیت اختیار کر گئی جس سے مولوی محمد باقر کے خاندان کے حصول میں خاصا اضافہ ہوا^۵۔

۱۰ جون ۱۸۳۶ء کو مولوی محمد باقر کے گھر ایک بچے نے جنم لیا جس کا نام محمد حسین رکھا گیا اور جرجیا ہو کر خنس العلماء مولوی محمد حسین آزاد کے نام سے مشہور ہوا۔ آزاد نے ۱۸۴۷ء میں دلی کے شعبہ علوم شرقیہ میں داخلہ لیا۔ انہوں نے استاد محمد ابراہیم دوق کی شاگردی بھی اختیار کی جو ان کے والد کے انتہائی قریبی دوست تھے^۶۔

مولوی محمد باقر نے ایک مسجد اور ایک امام بارگاہ تعمیر کرائے۔ مسجد ”مجموعہ اہل مسجد“ کے نام سے مشہور تھی۔ امام باڑہ خدر کے بعد انگریزوں نے منہدم کر دیا۔^۷

غالب ۲۸ جولائی ۱۸۵۳ء کو یسٹ میرزا کے نام خط میں لکھتے ہیں:

”آغا باقر کا امام باڑہ اس سے علاوہ کہ خداوند کا عزا خانہ ہے ایک نئے قدیم رفیع مشہور ہے۔ اس کے انہدام کا فہم کس کو نہ ہوگا۔“^۸

مولوی محمد باقر نے ۱۸۵۷ء کے انقلاب میں بھرپور حصہ لیا۔ انہوں نے اپنے اظہار کا نام بدل کر ”اخبار القلندر“ رکھ دیا۔ لکھا گیا کہ حضور ﷺ نے ازراہ کامل رافت و عظمت ”اخبار القلندر“ بہ خط خاص مرحمت فرمایا۔^۹

”دہلی اردو اخبار“ میں مولوی محمد باقر نے جہاد کا فتویٰ بھی شائع کیا۔ متن کچھ یوں تھا:

استفسار

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس امر میں کہ انگریز دہلی پر چڑھ آئے ہیں اور اہل اسلام کے جان و مال کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس صورت میں اب اس شہر والوں پر جہاد فرض ہے یا نہیں؟ اور اگر ہے تو فرض عین ہے یا نہیں؟ اور جو لوگ شہروں اور بستیوں میں رہنے والے ہیں ان کو بھی جہاد فرض ہے یا نہیں؟ بیان کرو:

جواب:

در صورت مرقومہ فرض عین ہے اور ہر اس شہر کے تمام لوگوں کے اور استلاحت ضرور ہے۔ اس کی فرضیت کے واسطے۔ چنانچہ اب اس شہر والوں کو طاقت مقابلے اور لڑائی کی ہے اور یہ سبب کثرت اجتماع افواج کے اور مصیبت اور موجود ہونے آفات حرب کے تو فرض عین ہونے میں کیا شک ہے اور اطراف و حوالی کے لوگوں پر جہاد ہے اور جو دغیر فرض تھا۔ اور اگر اس شہر کے لوگ عاجز ہو جائیں مقابلے سے یا سستی کریں اور مقابلہ نہ کریں تو اس صورت میں ان پر بھی فرض عین ہو جائے گا۔^{۱۰}

جہاد باہقلم کے ساتھ ساتھ مولوی محمد باقر نے جہاد بالسیف میں بھی حصہ لیا۔ نغزوں کے روزناموں میں ان کے فوجی دستوں کی قیادت کرنے کی اطلاعات بھی ملتی ہیں۔

چون لال کا روزنامہ..... بے امنی..... ایک سپاہی نے آ کر بیان کیا کہ کئی لاکھ خزانہ پیدل فوج کی ایک چٹائی اور چند سواروں کی زیر حفاظت گڑ گاؤں سے دہلی آ رہا ہے اور یہ کہ میواتوں کی ایک جماعت نے ان پر حملہ کر دیا ہے اور میں اعداد کے لیے بھاگ کر آ گیا ہوں۔ مولوی محمد باقر نے پیدل فوج کی دو چٹائیوں اور سواروں

کے ایک دست کو ختم دیا کہ جا کر خزانہ کی حفاظت کریں۔^{۱۱}

۴ جون

ایک سوار نے خردی کی جو چٹن مگر گاؤں سے غزانہ لارہی تھی اس پر سواروں نے حملہ کر دیا ہے۔ مولوی محمد باقر کے نام فوراً احکام جاری کیے گئے کہ پیدل فوج کی دو چالٹوں اور سواروں کے ایک دست کو ساتھ لے جا کر خزانہ کی حفاظت کرو۔^{۱۲}

جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد مولوی محمد باقر کو بھارت کے متحدہ کاساسٹا کرپنڈا انہیں دہلی کالج کے پرنسپل مسٹر ٹیلر کے قتل کی سازش میں شامل ہونے کے جرم میں سزائے موت سنائی گئی اور پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔^{۱۳}

مسٹر ٹیلر نے دیگر برہمن حضرات کے ساتھ دہلی میگزین میں پناہ لے رکھی تھی۔ میگزین پھانسی پر حواس باختہ ہو کر بھاگ نکلے اور کالج کے احاطہ میں واقع اپنے خانہ سالن کی کونفری میں جا چھپے جس نے بعد میں انہیں مولوی محمد باقر کے گھر پہنچا دیا۔ مولوی محمد باقر ان کے گھر سے دوست تھے۔ مسٹر ٹیلر بھی ان کے بھی خواہ تھے۔ ان کے مالی معاملات تک میں دلچسپی لیتے تھے اور ان کی مدد کرتے رہتے تھے۔ مولوی صاحب نے ایک رات انہیں اپنے امام باڑہ کے چہ خانے میں رکھا اور اگلے دن یہ بتا کر کہ محلے کے لوگوں کو خبر ہو گئی ہے اور ٹیلر صاحب کی جان خطرے میں ہے انہیں ہندوستانی لباس پہنا کر چھپا کیا۔ وہ چند قدم ہی گئے ہوں گے کہ ایک مطلقہ بیگم نے انہیں گھیر لیا اور لالچیاں برسار کر ہلاک کر دیا۔^{۱۴}

مولوی محمد باقر کے فرزند محمد حسین آزاد جو اخبار کے مدیر بھی تھے ان کا ادارت بھی جاری ہوا۔ وہ فرار ہو گئے۔ پہلے لکھنؤ اور پھر پنجاب میں پناہ دے رہے۔ آخر کار مدھانی حلانی ہو گئی۔

قلمرہ مٹھی میں مالی بدعنوانی اور بدانتظامی کے حوالے سے دہلی اردو اخبار کی ایک خبر کا اعداد و ملحوظ کیجیے:

”سنا جاتا ہے کہ گنواہ کی بڑی دادیلا ہو رہی ہے۔ جیسے جیسے میں دو مہینے بڑی مشکل سے ملتی ہے۔ اور اس پر کوئی کام چلا لگا ہوا ہے۔ کہتے ہیں کہ ملتا رہا ہے نام ہے۔ ایک تحیم کا حکم بڑا گرم سنا جاتا ہے یا دو ایک جنوں کی بن آئی ہے۔“^{۱۵}

ملا رنواب سید حامد علی تھے جن سے مولوی محمد باقر کے ذاتی اختلافات تھے اور ”ایک تحیم“ حسن اللہ خاں ہیں ان سے بھی مولوی صاحب کی نہیں ملتی تھی، لیکن بدانتظامی بہر حال تھی۔

۱۸۵۳ء میں ”دہلی اردو اخبار“ میں چند ایسی خبریں شائع ہوئیں جن کے اثرات ۱۸۵۷ء کے بعد بہادر شاہ ظفر کے قتل سے پر مرتب ہوئے لیکن ان ایام میں بھی یہ خاص ہی جنگاں نہیں تھیں۔

۴ ستمبر ۱۸۵۳ء

”چهارشنبہ کو حضور والا نے نقشا ایک علم کا بیت تھا اپنے ہاتھ سے مع طہرائے ام مبارک حضرت عباس علیہ السلام کے کھینچ کر کاری گروں کو دیا اور حکم ہے جلد تیار کرو اور صاحب عالم مرزا نور الدین بہادر سے حضور والا نے فرمایا کہ تم جا کر کھنڈو میں آداب شائستہ دو گاہ میں جناب عباس علیہ السلام کے چن حاکم جلد پھر حضور میں حاضر ہو۔ سنا جاتا ہے کہ اس کی بظاہر ہوتی تھی۔“

۱۹ اکتوبر ۱۸۵۳ء کی ایک خبر ہے:-

بدھ کے دن مرزا عالی بخت کے مکان میں بادشاہ شریک مجلس ہوئے اور دیر تک مرچے سنے اور آپ بھی فضیلت آخر بیان کرتے رہے اور جمرات کو علم جو حضور والا نے تیار کرایا ہے اور وہ بہت خوب صورت بن کر آیا ہے۔ حضور والا نے کمال آداب و قدرے سے اپنے سر مبارک پر رکھا اور صاحب عالم مرزا نور الدین بہادر کو وہ علم سپرد کر کے پھیل ڈاک کھنڈو رخصت کیا۔۔۔

پھر چند علم مبارک کے بنانے پر اکثر آل تہود مخفون مانع بھی رہے مگر حضور نے کسی کی بھی نہ سنی اور جو ذہن مبارک میں آیا وہی کیا۔ بعض لوگ اس بات سے بہت رنجیدہ ہوئے کہ حضور والا سے ان کے برخلاف یہ امر جلیل ہوا ہے بلکہ حضور والا نے اکثر اپنی زبان مبارک سے حاضرین و باور مٹھی سے فرمایا کہ اکثر آل تہود اور اشخاص نے مجھ سے عرض کی کہ اس علم مبارک کو بنانے میں اور کھنڈو پیچنے میں آپ راضی مشہور ہوں گے۔ میں نے جواب دیا مجھ کو الفت و محبت پاک میں یہ سب باتیں منظور ہیں۔ اگر ان کی محبت سے آدمی راضی ہوتا ہے تو جو جس کا بھی چاہے کہنے کہنے والے اپنا سامان لے کدہ گئے۔“¹⁷

ان خبروں کے پیچھے اور علم چن جانے کے بعد کھنڈو میں اٹھنے والی مسرت کی لہر سے یہ شور اٹھا کہ بادشاہ شہید ہو گئے چنانچہ سنی علماء نے بادشاہ سے وضاحت چاہی۔ بادشاہ نے اس خبر کو نارست قرار دیا اور مہر شاهی سے شیعیت سے انکار کا شہرہ جاری کیا اور ایک مشغولی اس موضوع پر مرزا غالب سے بھی کھسوا لی۔ کھنڈو کے مجتہد العصر کے نام خط میں مرزا نے لکھا کہ میں ملازم شاهی ہوں۔ جو کچھ بادشاہ کا حکم ہوتا ہے اس کی تعمیل کرتا ہوں۔ اس مشغولی کا مضمون بادشاہ اور حکیم احسن اللہ خان کی طرف سے اور الفاظ میری طرف سے تصور فرمائے جائیں۔۔۔“¹⁸

انگریزوں نے اس خطرے کو محسوس کرتے ہوئے کہ کہیں دلی اور اودھ کی حکومتوں کے درمیان کوئی افہام و تفہیم اور اتحاد کی صورت پیدا نہ ہو جائے اس بات کی کوشش کی کہ بادشاہ پر اہتمام شیعیت کی تردید شائع کی جائے۔ کہیں فریز نے ”دستور العمل اودھ“ میں ایک خط میں لکھا:

”مرزا سلمان گھوہ کے چاقوں نے..... ہندوگان والا کو راضی نہ ہو قبول کرنے سے بدنام کیا اور

متم کیا یہ سب غلط و بے اصل واقعات ہیں۔²⁰

لطف کی بات یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کی شورشِ ناکام کے بعد انگریزوں نے بہادر شاہ پر انعام لگا دیا کہ بغاوت ایک سو پچاس تھیں۔ بادشاہ نے شیعہ مذہب قبول کر لیا تھا۔ ایران کے ساتھ بادشاہ کی خط و کتابت چل رہی تھی۔ یوں دہلی آدھ اور ایران کی شیعہ مشائخ کا خم کرنے کی کوششیں کی جا رہی تھیں۔ مثنیٰ مکتد کمال اور حکیم حسن اللہ خان نے اس دسر پر گواہیاں بھی دیں۔²¹

ایک اور دلچسپ بات یہ کہ دہلی اردو اخبار کے مالک مولوی محمد باقر جن کے اخبار میں چھپنے والی مذکورہ افواخروں نے اس ہنگامے میں خاصا عجیبی چیز پیدا کی خود شیعہ علماء کے ایک فتوے کی رو سے کافر قرار پائے تھے۔ اس موضوع پر ایک ہمسو رسالہ چھپا تھا۔

”رسالہ سقاہ پارشا والیونین مضمونہ قادی حضرت مجتہدین علیہ السلام مقدمہ خارج ہو جانے محمد باقر مالک اردو اخبار کے دائرہ ایمان سے علی تاریخ پانچویں ماہ رجب ۱۲۷۰ ہجری کے۔“²²

بات شروع ہوئی تھی غالب کے اردو اخبار کے جاری ہونے سے آجے دیکھیں غالب اور کون کون سے اخبارات اور مسائل چڑھا کرتے تھے۔

زبدۃ الاخبار:

میں نے ”زبدۃ الاخبار“ میں دیکھا کہ دلی صاحبہ مرگئیں۔ تمام ہر گواہ پال قادی ۱۸۵۲ء۔²³

بغاوت ہند معیار الشعراء:

رسالہ بغاوت ہند ماہ بامداد اور ”معیار الشعراء“ ہر مہینے میں دو بار نکلتا رہا ہے۔ تمام شاعرانِ آرام ۲۲ جولائی ۱۸۵۹ء۔²⁴

اودھ اخبار:

یہ اودھ اخبار بھائی ضیاء الدین کے ہاں آتا ہے اور وہ میرے پاس بھیج دیا کرتے ہیں۔ تمام شاعرانِ آرام ۱۳ نومبر ۱۸۵۹ء۔²⁵

اکمل الاخبار:

ایک عبارت دکن میں مرتب کر کے اکمل الاخبار میں میں نے چھپوا دی ہے۔ تمام نواب ابراہیم علی خان

اشرف الاخبار:

محمد میرزا خان میرے سہیلی بھائی کا نواسہ ہے۔ اس نے ایک اخبار نکالا ہے۔ مکی بہ اشرف الاخبار۔ تمام میاں داد خاں سیاح ۱۴ فروری ۱۸۹۷ء۔²⁵

وید بہ سکندری:

اسد اللہ ہر پلٹے وید بہ سکندری کے معائنے سے سرور اٹھاتا ہے۔ تمام محمد حسین خاں اپریل ۱۸۹۷ء۔

آئینہ سکندرا اور جامِ جہاں نما:

میری آنکھیں آئینہ سکندر کے مشاہدے سے روشن ہوئیں۔۔۔۔۔ اس دیار کے رہنے والے جامِ جہاں نما کی نامستری سے بدل ہیں۔ تمام سراج الدین²⁷۔

اسعد الاخبار صادق الاخبار:

اس کو آگرہ بھیجئے تاکہ اس کو اسعد الاخبار میں اور زبدۃ الاخبار میں چھاپا جائے۔۔۔۔۔ میں نے یہاں صادق الاخبار میں چھپا دیا ہے۔ تمام ہر گوبال تختہ اگست ۱۸۹۷ء۔²⁸

حوالہ جات

- 1- خطوط قالب مرتبہ نظام رسول میر۔
- 2- فسانہ قالب از ملک رام۔
- 2A- خطوط قالب نظام رسول میر۔
- 3- محمد حسین آزاد احوال و آثار از ڈاکٹر محمد صادق۔
- 4- خیابان قالب از نامہ سچا پوری۔
- 5-6-7- محمد حسین آزاد احوال و آثار از ڈاکٹر محمد صادق۔

- 8- خطوط غالب - مرتبہ غلام رسول مہر۔
- 9-10- محمد حسین آزاد احوال و آثار از اکبر محمد صادق۔
- 11-12- جنگ آزادی 1857ء کے دو خفیہ روزنامے - محمد حسن خان جیلوں لال۔
- 13- محمد حسین آزاد احوال و آثار از اکبر محمد صادق۔
- 14- مرحوم دہلی کالج از مولوی عبدالحق۔
- 15- بہادر شاہ ظفر کے شب و روز از ضیاء المومنین لاہوری بہادر شاہ ظفر از اسلم پریز۔
- 16-17- بہادر شاہ ظفر از اسلم پریز۔
- 18- یادگار غالب از الطاف حسین حالی۔
- 19- بہادر شاہ ظفر از اسلم پریز۔
- 20- چراغ دہلی از مرزا حیرت دہلوی۔
- 21- محمد حسین آزاد احوال و آثار از اکبر محمد صادق۔
- 22-25 خطوط غالب - مرتبہ غلام رسول مہر۔
- 26- بیچ آنکے از مرزا اسد اللہ خان غالب۔
- 27-28- خطوط غالب - مرتبہ غلام رسول مہر۔

غالب پس دیوارِ زنداں..... دلی کی انتظامیہ عدلیہ رائے عامہ اور صحافت

پاسپاں بچم آنیہ کر من ی ایم
دہ زنداں بکشانید کر من ی ایم
(غالب)

مئی ۱۸۴۷ء کے اوائل کی کوئی شام تھی کہ ایک باپروہ پاگل کی غالب کے گھر کے دروازہ پر دلی اور کہا روں نے اسے کل سراسر داخلے کے دروازے کے اندر اتارا جہاں مہمان خواتین کو استراحتا تھا۔ وہاں نے باپروہ خواتین کو دیکھ کر دیواری طرف متوجہ کر لیا۔ برقعہ پوش پولیس والے بعد کو قوال شریف فیض الحسن زمان خانے سے ہوتے ہوئے غالب کے کمرے میں داخل ہوئے جہاں چوسر کی باڑی چل رہی تھی۔ دیگر لوگوں کو جو معززین شہر میں سے تھے کھٹک جانے کا موقع فراہم کیا گیا جبکہ غالب کو گرفتار کر کے حوالات میں بند کر دیا گیا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ کوئی مشوق بھی تھا اس پر وہ زندگاری میں..... بقا بہت کی وجہ سے کو قوال شہر غالب سے ذاتی متاثر رکھتا تھا۔ محسوس ہے غالب کو چھ ماہ قید یا مشقت اور دوسروں پر جرمانہ کی سزا سنائی۔

”مرزا اسد اللہ خان غالب پر عدالت فوجداری میں جو مقدمہ دائر تھا اس کا فیصلہ صادر کیا گیا۔ مرزا صاحب کو چھ مہینے کی قید یا مشقت اور دوسروں پر جرمانے کی سزا ہوئی۔ اگر دوسروں پر جرمانہ ادا نہ کریں تو چھ ماہ قید میں اور اضافہ ہو جائے گا۔ مقررہ جرمانے کے علاوہ اگر پچاس روپے زیادہ ادا کیے جائیں تو مشقت معاف ہو جائے گی۔ جب اس بات پر خیال کیا جاتا ہے کہ مرزا صاحب عرصے سے طویل رہتے ہیں۔ سوائے پرہیزی غذا تھیں چھاتی کے اور کوئی چیز نہیں کھاتے تو کہنا پڑتا ہے کہ اس قدر مشقت اور مصیبت کا برداشت کرنا مرزا صاحب کی طاقت سے باہر ہے بلکہ

ہلاکت کا اندیشہ ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ اگر سیشن بیچ کی عدالت میں اپیل کی جائے اور اس مقدمے پر نظر ثانی ہو تو نہ صرف یہ سزا موقوف ہو جائے بلکہ عدالت نوعدہاری سے مقدمہ اٹھالیا جائے۔ یہ بات عدل و انصاف کے بالکل خلاف ہے کہ ایسے پاکمال دیکھ کو جن کی عزت و شہرت کا وہ بہ لوگوں کے دلوں پر بیٹھا ہوا ہے معمولی جرم میں اتنی سزا دی جائے جس سے جان جانے کا قوی احتمال ہو۔“

(احسن الاخبار دہلی ۲ جولائی ۱۸۴۷ء)^۲

”نمبر ۱۱۶ اخبار ۵ جولائی ۱۸۴۷ء کی خبر کے مطابق سیشن بیچ نے قمار بازی سے متعلق بمسٹر جٹ کے حکم کی توثیق کر دی ہے۔“^۳

اس واقعہ سے چند روز قبل دہلی کے اخبارات میں انتشار قمار بازی کے متعلق اعلیٰ دستہ شیع ہوئے تھے اور کوٹوال فیض الحسن کا اعلان بھی کہ وہ دلی سے جوئے کی دہا کا خاتمہ کر کے رہے گا۔^۴ مولانا حالی ”یادگار غالب“ میں لکھتے ہیں کہ مرزا کو شطرنج اور چوہر کھیلنے کی عادت تھی اور چوہر چب کھیلنے تھے برائے نام چوہر بازی بد کر کھیلا کرتے تھے۔ اسی چوہر کی بدولت ۱۲۶۳ ہجری میں مرزا پر ایک سخت ناکار واقعہ گزرا..... یہ واقعہ مرزا صاحب پر نہایت شاق گزرا تھا۔ اگرچہ مجملہ چوہر کھیلنے کے عین میں جہان کو قید خانے میں گزرے ان کو کسی طرح کی تکلیف نہ ہوئی۔ وہ بالکل قید خانے میں آئی آرام سے رہے جیسے گھر پر رہتے تھے۔ کھانا اور کپڑا اور تمام ضروریات حسب دلخواہ مکر سے ان کو پہنچتی تھیں۔ ان کے دوست ان سے ملنے جاتے تھے اور وہ صرف بطور نظر بند ان کے قید خانے کے ایک علیحدہ کمرے میں رہتے تھے مگر چونکہ اس وقت تک شہر کے شرفاء و اعیان کے ساتھ بھی اس قسم کا سلوک مرزا نے نہیں دیکھا تھا اس لیے وہ اس کو ایک بڑی بے آبروی کی بات سمجھتے تھے۔^۵

مولانا حالی جن سہولیات کا ذکر کر رہے ہیں شاید اس طرح ہو یا شاید نہ ہو..... کیونکہ غالب نے زندان میں سناکنے کے لیے آنے والے ڈاکٹر کی طرف سے حال پوچھنے پر کہا تھا:

ہم غمزدہ جس دن سے گرفتار ہلا ہیں

کپڑوں میں جو کچھ کپڑوں کے ناگوں سے سوا ہیں

اور پھر ڈاکٹر نے اپنی رپورٹ میں غالب کی رہائی کی سفارش کی تھی.....^۶

احسن الاخبار کی مذکورہ بالا خبر میں بمسٹر جٹ کے فیصلے کو عدل و انصاف کے منافی قرار دیا گیا تھا اور یہی رائے شہر کے بے شمار لوگوں کی تھی۔ لیکن ایسے لوگوں کی بھی کمی نہ تھی جو اس فیصلے کے حامی تھے۔ شہر وہ کچھوں میں بٹ گیا تھا۔ ایک طرف انتظامیہ انگریز اور علماء..... دوسری طرف رائے عامہ اور اس خلق خدا کے ساتھ ان کا بادشاہ بھی تھا جس نے غالب کے حق میں سفارش کی جوت مالی تھی۔

۲۵ جون ۱۸۳۷ء کا "حسن الاخبار" کہتا ہے:

"مرزا اسد اللہ خان بہادر کو دشمنوں کی غلط اطلاعات کے باعث قمار بازی کے جرم میں گرفتار کیا گیا۔ معظم الدولہ بہادر (ریڈینٹ) کے نام سفارشی چٹھی لکھی گئی کہ ان کو رہا کیا جائے۔ معززین شہر میں سے جس جو کچھ ہوا محض حاسدوں کی فتنہ پر دازی کا نتیجہ ہے۔ عدالت فوج داری سے نواب صاحب نکلاں بہادر نے جواب دیا کہ مقدمہ عدالت کے سپرد ہے ایسی حالت میں قانون سفارشی قبول کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔"

استاذ وفق کے دوست مولوی محمد باقر کے اخبار میں اس واقعے کی خبر جس انداز میں مجھیں اسے آج کی صحافت زبان میں جہاں ساقی زور صحافت کہا جاسکتا ہے۔

"سنایا گیا کہ ان دنوں گورکھ پور میں مرزا نوشہ کے مکان سے اکثر نای قمار باز پکڑے گئے۔ مشکل ہاشم خان وغیرہ کے جو سابق بڑی عتقوں میں دور تک سپرد ہوئے تھے۔ بڑا قمار ہوتا تھا لیکن بسبب رعب و کثرت مردان کے یا کسی طرح سے کوئی قمار خانہ دار دست انداز نہیں ہو سکتا تھا۔ اب تھوڑے دن ہوئے یہ قنادار قوم سے سید اور بہت جری ساما جاتا ہے مقرر ہوا ہے۔ یہ مرزا نوشہ ایک شامیاری رکھیں زاوہ نواب شمس الدین قاسم ولیم فریدز کے قراوت قریب میں سے ہے۔ یقین ہے کہ قنادار کے پاس بہت رئیسوں کی سنی و سفارشی بھی آئی لیکن اس نے دیانت کو کام فرمایا۔ سب کو گرفتار کیا عدالت سے جرم ثابت ہوا۔ مرزا نوشہ پر سوروپے نہاد کر دیے تو چار مہینہ قید۔ لیکن ان قنادار کی خدا خیر کرنے دیانت کو کام فرمایا انہوں نے لیکن اس علاقہ میں بہت رشتہ دار متحمل اس رکھیں کے جس کچھ قحب نہیں کہ وقت بے وقت چوٹ چوٹ کر رہے اور یہ دیانت ان کی دہال جان ہو۔ حکام ایسے قنادار کو چاہیے کہ بہت مزید رکھیں۔ ایسا آدمی کم یاب ہوتا ہے۔ دلی اردو اخبار ۲۴ اگست ۱۸۳۳ء۔"

دالہ رسل اور خورشید الاسلام لکھتے ہیں:

"غالب کی گرفتاری عوام میں ایسی بے چینی کا باعث ہوئی کہ بادشاہ جہان سے کوئی خاص انتظامات نہیں رکھتے تھے انتظامیہ سے غالب کی رہائی کا مطالبہ کرنے پر مجبور ہو گئے لیکن ان کو یہ جواب ملا کہ یہ عدالت کا معاملہ ہے اور انتظامیہ اس میں دخل دینے کی مجاز نہیں۔"

غالب کے خلیفہ اول نواب ضیاء الدین احمد خان اور ان کے چار باریوں میں سے ایک نواب امین الدین احمد خان جن کی نواب شمس الدین خان سے خاصیت کے دور میں غالب نے بھرپور رملہ ادبی تھی اور نواب شمس الدین کے مستوب نمبرے تھے یہاں تک کہ تاریخ کے نام ایک خط میں انہوں نے اپنی جان کو خطرہ درپے ہونے کا ذکر بھی کیا۔ ان دونوں حضرات نے باقاعدہ اخبار میں وضاحت چھپوائی کہ ان کا غالب کے ساتھ کوئی یک ہدی رشتہ نہیں۔

غالب کے دوست، مداح اور شاگرد نواب مصطفیٰ خان شینو نے فوراً دوسو پچاس روپے جرمانہ ادا کر کے قید کی میعاد میں اضافے اور دورانِ اسیری مشقت سے جان چھڑادی۔ آخر کار رائے عامہ کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے اور ڈاکٹر کی سفارشی رپورٹ کے بعد نصف سزا پوری ہونے پر مرزا کو رہا کر دیا گیا^{۱۸}۔

۲۸ مارچ ۱۸۴۸ء کو قاضی حسین خان کے نام خط میں لکھتے ہیں:

”آپ نے جو اعلیٰ راج لطف فرمایا ہے اور سرگزشت پوچھی ہے تو سنئے:

کوٹوال دشمن تھا اور بمسٹرٹ نا آشتا۔ قذیہ گھات میں تھا اور ستارہ گردش میں۔ باوجودیکہ بمسٹرٹ کوٹوال کا حاکم ہے لیکن میرے باب میں کوٹوال کا حکوم بن گیا۔ سیشن جج باوجودیکہ میرا دوست تھا ہمیشہ مجھ سے میرانی کے ساتھ پیش آتا تھا اور اکثر صحبتوں میں بے تحفظانہ ملتا تھا لیکن اس نے بھی بے اعتنائی اور بے گامگی اختیار کی۔ صدر میں اعلیٰ کی گئی لیکن شغوائی نہ ہوئی اور وہی فرمان بے داد بحال رہا۔ نبھائے کیا مسودت پیش آئی کہ جب نصف میعاد ختم ہونے آئی تو بمسٹرٹ کے دل میں رحم آیا۔ اس نے خود اپنے حکم کی منسوخی اور میری رہائی کے لیے صدر سے درخواست کی۔ حکام صدر نے نہ صرف درخواست منظور کی بلکہ بمسٹرٹ کے اس فعل کو سراہا۔ شاہی کرڈمائے قوم نے اس فیخیرہر بمسٹرٹ کو طاقت کی تھی اور میری آزاد و روی اور خاکساری اس پر واضح کی تھی۔ آخر خود میری رہائی کی درخواست کر کے اس نے گویا عذر خواہی کی اور اس کے سوا بھی بہت مسودت اور جوبی کا اٹکھار کیا۔

میں ہر صفت ہر فعل اور ہر امر کو خدا کی طرف سے مانتا ہوں اور خدا سے جھگڑنا روا نہیں اس لیے جو کچھ گزرا اس کے شک سے آزاد اور جو گزرنے والا ہے اس پر راضی ہوں۔ لیکن چونکہ آرزو کرنا آئینی بندگی کے متنافی نہیں:

عشق است و صد ہزار تنہا مراچہ جرم
مر خواہشی کند دل شیدا مراچہ جرم

اس لیے چاہتا ہوں کہ اب دنیا میں نہ رہوں بلکہ اگر رہوں تو ہندوستان میں نہ رہوں۔ روم ہے مصر ہے ایمان ہے بلدا وہ ہے خود کہہ آ زادوں کی جائے پناہ اور سنگ آستانہ رحمت اللعالمین عاشقوں کی تحیہ گاہ ہے۔ اس کے سوا کیا چاہیے۔ دیکھئے وہ وقت کب آئے گا کہ قید فردمانہ گی حیات سے جو اس گزری ہوئی قید سے زیادہ جاں فرسا ہے نہایت پاؤں اور کسی منزل کو مقصود بنائے بغیر سرسبز گل جاؤں۔ یہ تھا بیان اس کا جو مجھ پر گزری ہے اور یہ ہے وہ آرزو جو دل میں ہے۔^{۱۹}

حوالہ جات

- 1- فسانہ غالب از مالک رام
- 2-3- بہادر شاہ ظفر کے شب و روز از ضیاء الدین لاہوری۔
- 4- غالب از مٹا لیا پری گارینا۔ مکتبہ انجیل کراچی
- 5- یادگار غالب از الطاف حسین حالی۔
- 6- فسانہ غالب از مالک رام۔
- 7- بہادر شاہ ظفر کے شب و روز از ضیاء الدین لاہوری۔
- 7A- ہندوستانی صفحات محمد شقیق صدیقی۔
- 8-9- غالب از مٹا لیا پری گارینا۔
- 10- یادگار غالب از الطاف حسین حالی۔
- 11- شیخ آجک از مرزا اسد اللہ خان غالب۔

گلی قاسم جان، فخر الدولہ، معروف، شمس الدین خان ایک قاتل ایک شہید

اسی ہے نور اندھیری سی گلی قاسم سے
ایک ترتیب چراغوں کی شروع ہوتی ہے
ایک قرآنِ سخن کا صوف کھتا ہے
اسد اللہ خان غالب کا پد پتا ہے

(نگار) ^۱

”قاسم جان کی گلی، میر خیراتی کے پھانک سے فتح اللہ بیگ خاں کے پھانک تک ہے چراغ ہے۔
ہاں اگر آبادی ہے تو یہ ہے کہ غلام حسین خاں کی حویلی میں ہسپتال ہے اور ضیاء الدین خاں کے کمرے میں
ڈاکٹر صاحب ٹھہرے ہوئے ہیں۔“

(غالب بنام عزیز الدین دہلوی، ۱۸۵۸ء) ^۲

قاسم جان کی گلی کبھی بھی بے نور اور بے چراغ نہ رہی تھی.... کبھی یہاں بے شمار چراغ جھلکاتے
تھے اور نور برستا تھا۔

اسد اللہ غالب، حضرت علی ابن ابی طالب کے صاحبزادے حضرت محمد بن الحنفیہ کی نسل میں
سے ایک صاحبِ خواجہ، مہدارِ سخن، شیخ کی ریاست میں پختہ دیہات اور مہتمم دارالاضرب شاہی کے منصب پر فائز
تھے۔ ان کے تین بیٹے تھے قاسم جان، عالم جان اور عارف جان۔ یہ تینوں بھائی ۵۰ء ہجری کے قریب ترک
شہسواروں کا ایک دست لے کر ہندوستان آئے۔ یہ قاتلِ انگ میں دہاں کے صوبہ دار مرزا محمد بیگ کے
ہاں ٹھہرا۔ اسی قیام کے دوران میں مرزا عارف جان کی شادی صوبہ دار کی دختر تک اختر سے ہوئی۔ ان لوگوں
کی شہرت دارالسلطنت پہنچی تو شاہ عالم ثانی نے انہیں طلب کر لیا۔ چنانچہ یہ حضرات دہلی پہنچ گئے۔ دربار میں

پذیرائی ہوئی۔ قاسم جان کے اقبال کا ستارہ بلند ہوا۔ منصب 'جاوہ ختم' عمل سرائیں۔ انہی قاسم جان کے نام پر دہلی کی مشہور گلی قاسم جان ہے۔^۳

جناب حمید اللہ خان لکھتے ہیں: (۱۹۳۸ء)

”چاندنی چوک سے مڑ کر کئی ماروں کے اندر کچھ دور تک چلے جائیے تو شخصی دواخانہ کی عمارت اور حکیم محمد شریف خان کی مسجد کے درمیان ایک کشادہ گلی نظر آتی ہے۔ کچھ ہی کچھ پرانی عمارتیں کچھ سنور جے کچھ گڑتے ہوئے مکان ہماری نگاہوں کے سامنے ہیں۔ گلی کے دونوں طرف کی عمارتیں زیادہ تر چھوٹی اینٹ کی پرانی عمارتیں ہیں لیکن جس خاص بات کو آپ ایک سرسری نظر میں محسوس کیے بغیر نہیں رہتے۔ وہ ان عیم مشہور عمارتوں میں ادنیٰ ادنیٰ اور کئی محرابوں کی کثرت ہے۔ ان بلند محرابوں سے پتہ چلتا ہے کہ اس گلی کے گزشتہ کئیوں کی زندگی عظمت و شان سے خالی نہ تھی۔ یہ گلی قاسم جان کی گلی کہلاتی ہے اور اٹھارہویں صدی کے دوسرے نصف سے لے کر تاج محل کی نام سے مشہور ہے۔“

”پہلے قاسم جان کے اقبال کا ستارہ چکا۔ خود گلی کا نام اس کا شاید ہے کہ جاوہر وراثت کے لحاظ سے قاسم جان اپنے بھائیوں کے سر تاج تھے لیکن انیسویں صدی کے شروع میں تقدیر ایک بار پھر سسکرائی اور اس مرتبہ عارف جان کا بیٹا نوہارہ فیروز پھر جھمک کی ریاست پر حاکم نظر آیا۔ قاسم جان اور عارف جان کی اولاد اب بھی اسی گلی کی حویلیوں اور محل سراؤں میں موجود ہے۔۔۔۔۔ اسی گلی میں شاید غالب کی پیدائش سے بھی پہلے غالب کے چچا (نصر اللہ بیگ خان) کا عقد عارف جان کی بیٹی (مشرقیہ بیگم بیگم خان معروف) سے ہوا تھا۔“^۴

اور اسی گلی میں ۱۹ اگست ۱۸۱۰ء کو تیرہ سالہ مرزا نوشہ کی بہات عارف جان کے فرزند قاسم جان کے بچے خواجہ ابوالحسن خان معروف کی گل سرا پر اتری تھی اور مرزا سید اللہ بیگ خان عرف مرزا نوشہ کا عقد ابوالحسن خان کی گیارہ سالہ صاحبزادی امراؤ بیگم کے ساتھ ہوا۔^۵

اس کے دو تین سال بعد غالب آگرہ سے ترک وطن کر کے دہلی چلے آئے۔ غالب کی تقریب عروسی کی تفصیل مجھے کسی تذکرے میں نہیں ملی (فقیر کی طبی بے بغاقتی)۔۔۔۔۔ ہاں ان کے چھوٹے بھائی مرزا یوسف کی شادی کا دعوت نامہ جو غالب کے دست مبارک کا تحریر کردہ ہے نظر سے گزرا جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالب کی شادی کی تقریب میں کیا کچھ ہوا ہوگا۔ میرزا یوسف کی شادی غالب کے دہلی آنے کے دو تین سال بعد ہوئی۔

فردوس انجمن طوے میرزا یوسف قرار یافتہ ہیں مہنگم رب و روز
دو شنبہ دست و دوم روز از مہ شعبان دے کہ ہر نہد سوئے قبلہ سرجمہ و
کرم کند و فزاید زبدم نکلا بہ فر فرخ فرشتہ کی فزائے و روز
ہر برند شب انظار کہ تاسفیدہ صبح ہمیں نظارہ رقص است و استعارہ سر

پییدہ دم کہ ز فیض شمول کھبت گل دم ضمیمہ سر شکاہہ خواہد بود
 شومہ جانب کا شانہ عروں رواں بہ شادمانی بخت مبارک و مسعود
 بس بھر ہی صبح وقت پریشانی سپاہ بندہ نوازی ہی تو اس افزود
 احباب سے گزارش کی گئی ہے کہ جو ۲۲ شعبان کو غروب آفتاب کے وقت دہلیا کے گھر تشریف لائیں
 اور وہاں شب بھر کی ملائیں اور یہ کدات پھر محفل رقص و سرور برپا رہے گی۔ صبح کو رات دہلیا کے گھر کی طرف
 روانہ ہوگی اور اسی روز وہاں آ جائے گی۔

مرزا عارف جان کے صاحبزادے احمد بخش خان ۱۸۶۵ء میں ایک میں پیدا ہوئے۔ خاندان دلی
 منتقل ہوا تو وہ کوئلیار میں ملازم ہو گئے۔ پھر گھوڑوں کی تجارت کرنے لگے۔ تجارت کے سلسلے میں انگریزوں کے
 واپسی پر مہاراجا راجاؤں کے ساتھ اور ان کے ملاقات ہو گئی۔ انہوں نے ملازمت کی پیشکش کی تو قبول کر کے ان
 کے ساتھ چلے گئے۔ جب انگریزوں اور ان کے درمیان معاہدہ ہوئی ہوا تو انگریزوں کے ہاں ریاست کے
 وکیل (سفیر مقرر ہوئے)۔ اسی زمانے میں انگریزوں اور بھارت کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ قلعہ و یک کا محاصرہ
 ہوا تو احمد بخش خان کی کوششوں سے مہاراجا اور ان کے سردار اور خوراک کے ساتھ ساتھ سواروں کا ایک دستہ بھی
 انگریزوں کی مدد کے لیے روانہ کیا۔ دستے کی کمان خود احمد بخش خان نے کی۔ سوازی کی جنگ میں انگریز
 کمانڈر جنرل فریزر کو کوئی گئی۔ احمد بخش خان نے اسے سنبھالا اور دشمنوں کے نرغے سے نکال کر لے گئے۔
 جنرل فریزر دشمنوں کی جانب نہ لاکر بل بلایا لیکن مرنے سے پہلے وہ احمد بخش خان کی جانبازی کی روداد اور
 مناسب انعام کی سفارش قلم بند کر چکا تھا۔

فتح کے بعد لاہور ایک نے فیروز پور جہلم کی نوای اصلاح بطریق احترام احمد بخش خان کو عطا کیے
 سند میں خیر الدین لاہور الملک نواب احمد بخش خان بہادر رحمہ جگ کے خطابات و القابات تحریر کیے گئے۔ مہاراجا
 بہادر رنجیت بھی دربار میں موجود تھے۔ انہوں نے پیچھے رہتا رہتا جی شان کے خلاف سمجھا اور لوہار کا پرگنا اپنی طرف
 سے معرفت کیا۔ غالب کے بچے خیر الدین جگ خان انہی خیر الدین کے بہنوئی تھے۔ احمد بخش نے ایک مقامی خانوں
 مدی سے شادی کی (اکثر تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ انہوں نے اس عورت کو گھر میں ڈال رکھا تھا)۔ اس سے دو
 لڑکے اور لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ بڑا بیٹا شمس الدین خان ان کا چالیسین عا اور بیٹیوں میں سے بڑی بیٹی نواب بیگم
 بیگم غالب کے بھانجے اور غالب کے منہ بولے بیٹے زین العابدین خان عارف کے نکاح میں آئیں۔

نواب احمد بخش خان نے بعد ازاں ایک برلاس محل نیاز احمد یک کی صاحبزادی سے شادی کی جن
 سے سات بچے ہوئے۔ ان میں سے نواب امین الدین احمد خان غالب کے خلیفہ جانی ملاؤ الدین احمد خان
 طائی کے والد اور ضیاء الدین احمد خان خیر عثمان (غالب کے خلیفہ اول) معروف ہوئے۔ نواب شمس الدین
 خان کی والدہ کیونکہ نکاح نہ بھی جاتی تھیں لہذا تمام خاندان اور احباب شمس الدین خان کی جانشینی کے خلاف

تھے چنانچہ ۱۸۴۲ء میں انگریزوں اور دہلوی کی منظوری سے فیصلہ کیا گیا کہ شمس الدین خان فیروز پور بھر کی گدائی پر نہیں گئے جبکہ لوہارو امین الدین خان اور ضیاء الدین خان کو دی جانے کی اہلیت ان کے لیے بڑے بھائی کی اطاعت کرنا ضروری ہوگا۔ اس دستاویز پر جنرل آکٹر لونی اور سر چارلس مکلف نے بطور گواہ دستخط کیے۔^۹ نواب احمد بخش نے اکتوبر ۱۸۴۲ء میں وفات پائی اور قطب صاحب میں دفن ہوئے۔

عارف جان کے ایک اور بیٹے نے بھی خاصی شہرت پائی لیکن وجہ شہرت ذرا مختلف تھی۔ یہ تھے نواب الہی بخش خان اسد اللہ خان غالب کے خسر۔ ان کی وجہ شہرت شاعری اور دولہائی تھی معروف تخلص تھا۔ مصنفی نے تذکرہ ہندی میں لکھا ہے:^{۱۰}

”الہی بخش خان معروف تخلص پسر عارف جان جوان خوش اشتیاق و وجہ است..... بہ شاکر دی میاں نصیر تازش دارو.....“

قدرت اللہ قاسم نے اپنے تذکرہ شعراء ”مجموعہ نفوس“ میں لکھا:^{۱۱}

”معروف تخلص الہی بخش خاں طلف عارف خان برادر زادہ قاسم خان کہ از امرائے نامدار ایام دولت ذوالفقار الدولہ نجف خان بود..... الہی بخش خاں حوالے است خوش طلق و صحت سیرتیک خوشی کلام یار باش خوش معاش، گھرش درست و کلامش چست، طبع سلیم دارو..... دریں ایام دلش از دنیا سرگردید..... اکثر اوقات بیا در ب تہائی کر اردو.....“

موسد کلام میں ایک دہائی بھی درج ہے:

اس ماہ قلام کے تصدیق جاؤں
محبوب کے نام کے تصدیق جاؤں
معروف اگر پاؤں تو سو جان سے آہ
سلطان قلام کے تصدیق جاؤں

سلسلہ چشتیہ سے تعلق رکھتے تھے۔ مولانا فخر الدین اور میر ضیاء الدین کے مرید تھے۔ خود بھی لوگوں کو مرید کرتے تھے۔ نواب احمد بخش خان بھی مولانا فخر الدین کے مرید تھے اور اسی حوالے سے انہوں نے سرکار سے فخر الدولہ خطاب کے حصول پر اصرار کیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ مولانا نے احمد بخش خان کے دہلی ریاست بننے کی پیشین گوئی کی تھی۔^{۱۲}

الہی بخش خان نے عیشیتس اور چالیس سال کی عمر کے درمیان ترک دنیا کیا۔ شاعری میں ذوق کے استاد شاہ نصیر کی شاگردی اختیار کی۔ آزاد کا دھڑنی ہے کہ ذوق سے بھی اصلاح لیتے رہے۔ ۱۸۴۶ء میں انتقال ہوا۔ دو دیوان مرتب کیے۔ دیوان اول ۱۸۳۵ء میں نکلی پر تیس ہجڑوں سے طبع ہوا۔ دیوان دوم جو ۳۰۰۰ اشعار پر مشتمل ہے غیر مطبوعہ ہے۔^{۱۳} ان کی شاعری کا ذکر خطوط غالب میں بھی ہے۔ ۲۷ جولائی ۱۸۶۰ء کو عطاء

المدین احمد خاں ملائی کے نام خط میں لکھتے ہیں:

”پچاس برس کی بات ہے کہ اٹھنی بخش مرحوم نے ایک زمین بنی نکالی۔ میں نے حسب اہم غزل کہی: بیت الغزل یہ ہے:

پلا دے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے
بیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے¹⁴

”مرگ اب نامکھائی کہاں رہی۔ اسباب و آسار سب فراہم ہیں۔ بڑے الہی بخش خان منظور کا کیا معرہ ہے۔ آہی جاؤں نکل جائے اگر جان کہیں۔“

(بنام ملائی ۳ جولائی ۱۸۶۳ء)¹⁵

الہی بخش خان معروف لکھتے ہیں:

لکھن دل سوا کھو دے تو گھر نیلام ہو جائے

(بنام تقدیرنگرانی)¹⁶

ایک جناحی بخش خاں اور دو بیٹیاں امراؤ حکیم زوجہ غالب اور بیٹیادی حکیم زوجہ غلام حسین خاں

مسرورہ و زین العابدین عارف چھوڑیں۔¹⁷

اس خاندان کے ایک فرد کو اہل وطنی نے شدید بھی قرار دیا اور وہ بھی اس شخص کو جو قبل ازیں کوئی خاص پسندیدہ شخص بھی نہ تھا یہ تھے نواب شمس الدین احمد خاں دہلی فیروز پور جھڑک۔ وہ لوہارو کی ریاست اپنے چھوٹے بھائیوں کے حوالے کیے جانے پر ناراض تھے۔ انہوں نے لوہارو کے کسانوں کو اکسایا کہ وہ امین الدین احمد خاں کو مال گزاری دیتا ہے کہ وہ بھی کئی طرح کی مشکلات کھڑی کیں چنانچہ ۱۸۳۳ء میں وہ لوہارو کو دوبارہ اٹھیا نے میں کامیاب ہو گئے۔ ولیم فریزر ریڈنٹ وطنی اس خاندان کا پرانا دوست تھا۔ تینوں نواب زادے اسے بچا کہتے تھے۔ وہ اس کے سامنے ملی کر جواں ہوئے تھے۔ اسے شمس الدین کی زیادتیوں کا بھی علم تھا چنانچہ اس نے امین الدین خاں کو اپنا مقدمہ نکلنے جا کر گورنر جنرل کے سامنے پیش کرنے کا مشورہ دیا¹⁸ امین الدین احمد خاں نکلے گئے۔ غالب نے اپنے نکلنے کے احباب کو ان کی مدد کے لیے خطوط ارسال کیے¹⁹۔

شمس الدین خاں ولیم فریزر کے سلام کو آئے تو اس نے نہایت دو شقی کے ساتھ سلام قبول کرنے سے انکار کیا بلکہ چھوٹے بھائیوں کی حق تلفی پر ان کی سرزنش کی۔ نواب شمس الدین خاں یہ بے عزتی برداشت نہ کر سکے اور انتقام لینے کی تھائی۔ یوں بھی فریزر ان کی ریاست کے لیے خطرہ بنا ہوا تھا۔ انہوں نے اپنے ایک وقار ملازم کریم خاں کو اس پر بھیج دیا۔ کریم خاں چھ ماہ تک کئی ماراں میں نواب کے مکان پر ٹھہرا رہا۔ وہ فریزر کا حاقب کرتا رہا لیکن اسے وار کرنے کا موقع نہ مل سکا کیونکہ فریزر ہر وقت محافظوں اور ملازموں میں گھرا رہتا تھا۔ آقا اور ملازم میں باقاعدگی کے ساتھ خط و کتابت جاری رہی۔ ان کا خفیہ کوڑا تھا ”مکتوں کی خرید واری“۔

ایک خط میں نواب نے دریافت کیا "کتوں کی خریداری کا کیا ہوا؟" کریم خان نے جواب میں لکھا "میں کوشش کر رہا ہوں.... کتوں کی بہت حفاظت کی جاتی ہے۔"

نواب نے ایک خط میں لکھا:

"تم نے لکھا ہے کہ کتوں کے ساتھ ایک اردلی تھا۔ مجھے بتاؤ کہ کتوں کے ساتھ موجود یہ افراد ان کے سر پرست ہوتے ہیں یا انہی کتوں کے ساتھ گھومنے والے کسی اور گروہ کے افراد تھیں ہر صورت میں یہ کتے خریدنے ہیں لیکن اس طرح کہ کسی کو اس سودے کا علم نہ ہو۔"

ایک خط میں کریم خان نے لکھا:

"کچھ دن پہلے کتوں کے حصول کا ایک موقع پیدا ہوا تھا لیکن میں خریداری نہ کر سکا کیونکہ وہ بہت زیادہ قیمت مانگتے تھے۔ مجھے خدا پر بھروسہ ہے۔ آپ کا یہ غلام اس طرح سے کتے لے کر آئے گا کہ آپ خوش ہو جائیں گے۔" یہ غلام خط و کتابت بعد ازاں برآمد کر لی گئی اور عقدے میں ثبوت کے طور پر استعمال ہوئی۔

۲۴ مارچ ۱۸۳۸ء کی رات ولیم فریز روڈی کے مضافات میں کشن گڑھ کے راجہ کی دعوت پر گیا۔ کریم خان اس کے معمولات کی خبر رکھتا تھا اور سائے کی طرح اس کا تعاقب کرتا تھا۔ وہ اندھیرے میں فریز کے گھر کے قریب گھات لگا کر بیٹھ گیا۔ جیسے ہی فریز روڈی آگیا کارین سے فائر ہوا اور پھر گھوڑے کی ٹانگوں کی آواز سنائی دی۔ ولیم فریز روڈی پر ہلاک ہو گیا تھا۔ گینٹیش کی دوسری مسٹر جان لارنس کو سونپی گئی۔ اس نے گھوڑے کے سموں کے نشان دیکھے تو معلوم ہوا کہ گھوڑے کی تازہ فصل ہندی ہوئی ہے۔ فصل بندوں سے پہلے چھ گھنٹے پہلے گھوڑا کریم خان کا ہے۔ کریم خان دہلی میں ہی روپوش تھا۔ اسے حراست میں لے لیا گیا۔ اسی دوران سر جارجس ملگراف کو کسی تجربے کے مطابق دی کہ نواب شمس الدین خان اس قتل میں ملوث ہو سکتے ہیں۔ ان کے گھر کی تلاش لی گئی تو کتوں کی خریداری کے حلقہ غلطو برآمد ہو گئے۔ اسی دوران میں ایک میواتی پاشے آئے انہوں نے خود کو حکام کے حوالے لیا اور اعتراف کیا کہ وہ اس جرم میں کریم خان کا ساتھی ہے اور یہ قتل نواب کے حکم پر کیا گیا ہے۔

ہوا میں تھا کہ آیا جو پہلوں میں روپوش تھا اسے کسی نے بتایا کہ نواب شمس الدین خان ثبوت ملانے کے لیے اسے قتل کرنا چاہتے ہیں چنانچہ اس نے خود حاضر ہو کر اقبال جرم کر لیا۔ ایک کوئیں سے کارین برآمد ہو گئی۔²¹

نواب کے چچا اور بھائی فتح اللہ بیگ اور غالب پر بھی انگلیاں اٹھیں کہ انہوں نے عجزی کی اور جموں کی باتیں اپنی طرف سے بنا کر شمس الدین خان کو پھانسا ہے۔ عدالت نے کریم خان اور نواب کو مجرم قرار دے کر سزائے موت سنائی۔ ۱۳ اکتوبر ۱۸۳۵ء کو نواب کو پھانسی دی گئی۔ پھانسی گھاٹ پر ہزاروں لوگوں کا جم خضر اٹھا ہو گیا۔ نواب نے سبز لباس پہنا ہوا تھا۔ دلی میں مشہور ہو گیا کہ سولی پر ان کا جسم خود بخود دھو کر قبلہ رخ ہو گیا تھا۔ انہیں نقب صاحب میں دفن کیا گیا۔ عوام نے انہیں شہید قرار دیا اور ان کی قبر زیارت گاہ بن گئی۔²²۔ ریاست فیروز پور جھر کر سکر کرنے ضبط کر لی۔ ولیم فریز کو سیٹل جھڑ چڑھا میں دفن کیا گیا۔ اس کے دوست کرل سکر

نے رنگ مرمر کا ایک خوبصورت سائیکلو پڈیا ۱۸۵۷ء میں چھاپا اور ہاکروڈیا کہتا۔
ڈاکٹر ڈی لیا پری کا رہنا لکھنؤ میں:

”ہندوستانی سماج کے متحد طبقات میں بڑھتی ہوئی عوامی تاراجی کو احتجاج کی ایک علامت کی ضرورت تھی اور نواب شمس الدین ایسا ہی ایک علامت ثابت ہوئے۔ عوام کے لیے بھی اور مثل بادشاہت کی بحالی اور نظام کھن کی ترویج کوئے خواہش مند پرانے مسلمان جاگیردار طبقے کے نمائندوں کے لیے بھی۔ اس وقت ہندوستان میں انحطاط اور مساوات کے ان پورٹ والی مفروضوں کی قدر و قیمت کا جن سے وہ انگریزوں کی رسالت سے متعارف ہو سکتے تھے صحیح معنوں میں اندازہ لگانے والوں کی تعداد کچھ ایسی زیادہ نہ تھی اور ان اصولوں کے سامنے والوں کا تو بالکل نقدان تھا۔ اس لیے فریزر کے طور طریقوں کی مجسودیت پسندی خود اس سے رہا میں آنے والے لوگوں کو ناراض کرنے کے لیے کافی تھی۔ اس کے علاوہ فریزر میں چاہے کبھی بھی ذاتی غولیاں کیوں نہ رہی ہوں زیادہ تر ہندوستانوں کے لیے وہ بہر حال ان بدیسوں میں سے ایک تھا جو ہندوستان کی دولت لوٹ رہے تھے اور بدیسوں کی ایک بڑی تعداد کی نظروں میں جن میں اعلیٰ ترین طبقات کے افراد بھی شامل تھے اس کی حیثیت ایک زمانے سے چلے آ رہے نظام کی بنیادوں ہی کو غارت کرنے والی تھی۔ عوام الناس کی نظروں میں اس ڈرامے کے کرداروں کی نوعیت میں بنیادوں تبدیل آ گئی۔ مجرم اور انگریزوں کے واقعات کا سرلیس اور حاشیہ نشین نواب شمس الدین کو انہوں نے بے گناہ مظلوم بنا دیا اور نواب کے حکم سے مارے جانے والے فریزر کو اسی کے قاتل کی شہادت کا ذمہ دار قرار دیا۔“²⁴

آئیے دیکھیں غالب اس واقعے کو کسی نظر سے دیکھتے ہیں۔ شیخ امام بخش پانچ کے نام ایک خط میں یوں رقمطراز ہوتے ہیں:

”کسی ظالم خدا نافرمان نے کہ ہمیشہ عذاب ابدی میں گرفتار رہے۔ ولیم فریزر صاحب بہادر ریڈیٹنٹ وہلی کو جو غالب مظلوم کے مریدوں میں سے تھے شب تاریک میں بدوق کی گولی سے ہلاک کر دیا اور میرے لیے باپ کی موت کا غم تازہ ہو گیا۔... تقدار جو نشان اٹلائے مجھے اور اس دنیا پر جو قلعہ نہیں تھی ایک سوار کو جو عالی فیروز پور کے ملازموں میں سے ہے اس ستودہ مقامات شخص کے قتل کے جرم میں پکڑ لیا۔ شہر کے صاحب مجسٹریٹ بہادر کو پہلے مجھ سے واقف تھے اور میری ذمہ دہنشی کے زمانے میں کہ یوم کی طرح میری پردہ صرف رات کے وقت ممکن تھی شبانگاہ میں کبھی کبھی ان سے ملنے چلا جاتا تھا اور کچھ لمبے سکون و عافیت کے گزارتا تھا۔ جب یہ واقعہ پیش آیا تو اس نے حقیقت حال تک پہنچنے اور اس پر پڑے ہوئے اسرار کی پردہ کشائی کی غرض سے مجھے اپنے پاس بلا لیا۔ یہاں تک کہ والی فیروز پور مجرم قرار پایا اور سرکاری پولیس اس کی جاگیر پر جا کر بیٹھ گئی۔ چند گھنٹے بعد اس کے مابین نا اطمینانی چل رہی تھی اور شہر کے لوگ اس سے واقف تھے کبھی نے میرے خلاف اور اس کا فرقت کی گرفتاری کو جس نے اپنے محسن کو مار ڈالا میری طرف سے جبری کا نتیجہ قرار

دیا۔ یعنی مردمان شہر خاص و عام یہ دہسہ رکھتے ہیں کہ عیسٰی الہ بن بیکناہ ہے فتح اللہ بیگ اور اسد اللہ خان نے انگریزوں کو اس کے خلاف بھڑکایا ہے اور بھوئی جی باقیں لگا کر اس بھارے کو مصیبت میں مبتلا کر دیا ہے۔ طرفہ قریبات یہ ہے کہ فتح اللہ بیگ خاں دہلی فیروز پور کا برادر عم زاد ہے۔ مختصر یہ کہ قہر یہاں تک پہنچ گیا کہ مجھ پر لعنت طاعت دہلی کے بادشاہوں کا دہلیہ بن گئی ہے۔²³

اکتوبر ۱۸۳۵ء میں لکھے گئے ایک اور خط میں اسد اللہ خان کو لکھتے ہیں:

”بقیہ اللہ مفر کو الہ آباد کے حکام شہر میں سے ایک حاکم اس دیوانہ پھانچا اور گورنر جنرل بہادر کی طرف سے اس امر پر مامور کیا گیا ہے کہ وہ حکام دہلی کی تحقیقات کے خلاف کو حزیہ گہری نظر سے دیکھیں اور قیامت جرم کے بعد سزا کی قرارداد کو سرحد بہ سرحد بروئے کار لائے۔۔۔۔“

وہ سنگم ختم ہوا اور اس کے ہر کردار کو جیسا کہ چاہیے تھا اس کے عمل کی پاداش مل گئی اور دہلی میاں کو ان کے سر بیگ کریم خان کے ساتھ تختہ دار پر لٹکا دیا گیا اور اس نے عدم آباد کی راہ لی۔ یہاں جس آدمی نے جو بویا ہے وہ کانا بھی ہے۔²⁴

حوالہ جات

- 1- چاند بکراج کا گلزار۔
- 2- خطوط غالب مرتبہ غلام رسول مہر۔
- 3- غالب درون خانہ از کالی داس گپتا رخصا ساکار پبلشرز بکنی
- 4- 6۳۶- ایضاً۔
- 7- 13۶- ایضاً
- 14- 16۳- خطوط غالب - مرتبہ غلام رسول مہر۔
- 17- غالب درون خانہ از رخصا
- 18-19- Twilight of Mughals. Percival Spear
- 20- فتح آجنگ از مرزا اسد اللہ خان غالب۔
- 21- Twilight of Mughals. Percival Spear
- 22- غالب - غالب الیہ پری گارجا غالب درون خانہ از رخصا
- 23- Twilight of Mughals. Percival Spear
- 24- غالب از مرزا الیہ پری گارجا۔
- 25- فتح آجنگ از مرزا اسد اللہ خان غالب

بلاقی بیگم کے کوچے سے سلطان جی تک..... رُسومِ دہلی..... رُتِ بسنت

غدر سے پہلے کی دہلی میں اگر ایک نمازی جامع مسجد کے شمالی دروازے سے بیڑھیاں اترتا ہوا دریا اور کوٹوالی کی سمت جا رہا ہو تو وہ زیادہ دور نہیں گیا ہوگا کہ اس کے دائیں طرف بلاقی بیگم کا کوچہ آ جائے گا۔ غالب ۲ دسمبر ۱۸۵۹ء کو میر مہدی بھڑوچ کو لکھتے ہیں:

”چلے آؤ جاں نثار خاں کے چھتے کی سڑک خان چند کے کوچے کی سڑک دیکھ جاؤ بلاقی بیگم کے کوچے کا ڈھنچا جامع مسجد کے گرد ستر گز گول میدان لکھنا سن جاؤ۔“^۱

اس کے صرف دو ہفتے بعد حسین مرزا کے نام خط میں تحریر فرماتے ہیں:

”قل خانہ ظک بھڑالال ڈکی کے کھادی کے مکانات سب گرائے گئے۔ بلاقی بیگم کا کوچہ اتوا میں ہے۔ اہل فوج و عوام چاہتے ہیں۔ اہل قلم بچاتے ہیں پانچاون کارو کیسے کیا ہو۔“

..... یہاں اہل قلم سے مراد سولیتین حکام ہیں۔ بہر حال آدمی کا مالیاتی دونوں طبقوں کو حاصل ہوئی۔ اہل سیف کوچے کا کچھ حصہ گرائے میں کا سیاب ہوئے جبکہ اہل قلم کچھ حصہ بچاتے ہیں۔“^۲

اسی بلاقی بیگم کے کوچے میں ۲۸ جنوری ۱۸۳۶ء بروز سر شنبہ حضرت غوث اعظم کی آل سے حسنی سادات کے ایک گہرائے میں ایک بچہ پیدا ہوا جس کا نام سید احمد رکھا گیا۔ اس نام کو ایک روز اہل قلم کے افق پر مثل آفتاب چمکنا تھا۔ سید احمد سات ماہ کے تھے والد نے جامع شاہ صابر بخش میں مکان خرید لیا اور وہاں منتقل ہو گئے۔ بعد میں یہ علاقہ دریا گنگا کہلا گیا۔ سید احمد نے ہارٹل سکول دہلی میں تعلیم حاصل کی۔ سرکاری ملازمت کا آغاز محکمہ تعلیم سے کیا۔ انھیں محکمہ تعلیم میں ملازمت دلوانے والے غالب کے شاگرد ”رُسوم ہنر“ کے معتمد ماسٹر پیارے لال آتشوب دہلوی تھے۔ صرف ۲۲ سال کی عمر میں یعنی ۱۸۶۸ء میں انہوں نے ایک تخت کی ترتیب دہلیلیک کا کام شروع کیا۔ اس تخت کی تکمیل میں انھیں تیس سال لگے اور اس نے ”فرہنگِ آصفیہ“ کے

نام سے شہرت دوام حاصل کی۔ ۱۸۶۹ء میں یعنی غالب کی وفات کے سال ان کی کتاب ”کنز القواعد“ شائع ہوئی اور سرکار سے انعام حاصل کیا۔ لغت کی طباعت کے لیے قدرت کی طرف سے یہ ہمدوست ہوا کہ ۱۸۸۵ء میں جب سید صاحب ملازمت کے سلسلہ میں حیدرآباد میں مقیم تھے وہاں حسن اتفاق سے وزیر دکن سر آسمان چاہ بہادر سے ان کی ملاقات ہو گئی۔ انہوں نے فرہنگ کے کچھ حصے دیکھے۔ پسند کیے اور اپنے ساتھ حیدرآباد لے گئے۔ وہاں مولوی سید علی بگلرانی سے رائے لی گئی۔ مثبت رائے کے بعد مختلف اوقات میں حضور نظام و قار والد و سر آسمان چاہ بہادر اور یحییٰ السلطنت مہاراجہ سرکشن پرشار نے میں ہزار روپے فرہنگ کی طباعت کے لیے دینے جس کا نام فرہنگ آصفیہ رکھا گیا۔ ۲۲ جون ۱۹۱۳ء کو ان کی علمی خدمت کے اعتراف میں برطانوی ہند کی حکومت نے انہیں خان صاحب کا خطاب عطا کیا۔ ان کی دیگر کتب میں لغات النساء لغات المدارس، روزمرہ دلی، مرقع زبان دلی، محاکمہ مرکز اردو، قواعد اردو، سیرۃ مناظرہ، تقدیم و تہذیب، اخلاق النساء، تصنیف شہر اردو، رسوم دلی شامل ہیں۔ سید صاحب کا بہتر سال کی عمر میں ۱۹۱۸ء کو انتقال ہوا^۳۔

رسوم دلی کی تمہید سے چند اقتباسات ملاحظہ کیجیے:

”پہلے اس سے کہ میں ان رسوم کو شروع کروں اس قدر عرض کر دینا مناسب جانتا ہوں کہ مسلمانوں کی عورتوں اور ان کے سبب ان کے مردوں میں جس قدر یکساں عروج ہیں وہ تقریباً سب کی سب ہندوئی یکساں ہیں جن میں سے بہت سی یکساں تو ہوں گی توں ہیں۔ بعض کے نام تو وہی ہیں مگر طریقے بدل گئے ہیں۔ بعض میں بدائے نام فرق کر دیا ہے۔ بعض کو مذہبی امور میں یہ تغیر نام شامل کر دیا ہے۔“

”جلال الدین محمد اکبر بادشاہ ہند نے چونکہ استحکام سلطنت والہ دیا اور جلال و سلاست کی غرض سے ہندی عطا کردہ مراسم کو اختیار کر لیا تھا اور اس کا یہاں تک رواج ہو گیا تھا کہ اب اس اخیر وقت میں بھی جو شہزادہ تخت کا حقدار خیال کیا جاتا تھا وہ آداب تخت ہند کے پاس دلچاسپ سے منتقل نہیں کراتا تھا۔“

”شاہ عالم کے وقت سے تو سلطوں میں رانگی ہاتھ دھنا ہوئی دلی دلی دوسرے کا تہوار منانا شای خاندان میں ایک عام دستور ہو گیا تھا۔“

”پھر مسلمان کے گھر پیدا ہوتا ہے، گیت کرشن جی کے نظم یا ان کی مناسبت کا گایا جاتا ہے۔ جیسے:

الہی جہا مان کرے نہ لال سے
سہاگن جہا مان کرے نہ لال سے

”اگرچہ علما نے مذہب نے ان رسوم کے اٹھانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا مگر چونکہ گھر کے اندر کی بلا اور گھٹ میں بیٹھی ہوئی وہ اپنا اثر کے بغیر نہیں رہتی، کچھ بھی پیش رفت نہ گئی۔“

ان رسوم اور میلوں ٹھیکوں میں ایک میل ہنسٹ کا بھی تھا۔ آجے ڈراما دلی کی ہنسٹ کی روایتیں دیکھیں..... یہاں کا موسم آج ہاتھوں میں پھول کھلے کھیتوں میں سرسوں پھولی دلی کے اطراف ہنسٹ کے چاروں

نظر تک زور پھولوں کے ایک بے کراں مستند.....

ہندوؤں نے دیوتاؤں کے مستندوں میں سرسوں کے پھول چڑھا کر شروع کیے۔ مسلمانوں نے اپنے بزرگوں کے حزاؤں پر..... لیکن یہ کوئی پابندی نہیں..... بے شمار ہندو مسلمان بزرگوں کے حزاؤں پر ہست کے پھول چڑھانے کی عادی ہو گئی اور بہت سے مسلمان ہندو مستندوں کی ہست میں چلے جاتے..... دہلی میں دسویں صدی ہست چڑھائی جاتی..... اور کئی کئی روز ہست چڑھتی..... آج حضرت سلطان الاولیاء کی ہست چڑھ کر حضرت حسن رسول ٹٹا کی..... پر سوں ہرے بھرے صاحب کی ہے تو اگلے دن شہر بڑے صاحب کی..... بھر حضرت قطب الدین، بختیار اور حضرت نصیر الدین چراغ دہلی کی..... ختم چڑھا جاتا شیرینی تقسیم ہوتی..... مزار کی پانچویں سرسوں کے پھول رکھے جاتے پھر قوالی ہوتی..... عقیدت مند اپنے دایاں رقص کر کے پہنچ جاتے..... کہتے ہیں حضرت نظام الدین الاولیاء رحمت اللہ علیہ کی پیشروہ کے پوتے سید تقی الدین نوح کا انتقال ہو گیا..... حضور اس بیچ سے بہت محبت کرتے تھے..... آپ بے حد شگفتہ ہوئے..... چہرے سے مسکراہٹ غائب ہو گئی..... ہونٹ گویا مل گئے..... سید تقی الدین کی قبر کے نزدیک کوٹک والے لال گنبد میں تمباکو جھکائے پیشہ رہے..... انہی دنوں ہست آ گئی..... ہندوؤں کا ایک اہم باتھوں میں سرسوں کے پھولوں کے ٹکڑے لے کر کاٹا ہوا پانی کے مستند کی طرف چار ہاتھ..... حضرت امیر خسرو نے یہ مٹھو دیکھا تو انہوں نے بھی ٹکڑے باتھوں میں لیے تو پانی میں ڈگائے اور سلطان المشرع کے گھر کا رخ کیا..... راستے میں خواجہ محمد خواجہ سید موسیٰ اور امام احمدیاء دہلی گئے..... وہ بھی ساتھ ہو لیے..... جب سلطان المشرع کے پاس پہنچے تو کھانا کچ کی اور رقص کے انداز میں جمونے لگے..... حضور بے ساختہ مسکرا پڑے اور دریافت فرمایا کہ کتنا خوش کیا ہے..... حضرت امیر خسرو نے پڑھ کر سرسوں کے پھول قدموں میں رکھ دیے اور کہا:

عرب یار قوری ہست مٹائی

آج ہندو اپنے مستند پر ہست کے پھول چڑھانے جا رہے ہیں..... میں بھی اپنے بت پر پھول چڑھانے لایا ہوں اور پھر یہ شعر سب نے مل کر گا دیا.....

اکھ رنج آدھ ابر بہار

ساتیا مکی رنج بادہ ہزار

اور پھر یہ دم چل پڑی کہ ہست ہٹنے کی سر پر ٹھیک چار بجے اسی جگہ اجتماع ہوتا قوال یہی کام گاتے..... کالہ میں ہندو اور سلطان جی میں مسلمان ایک ہی دن ہست کے میلے کی ابتدا کرتے اور پھر وہی ہست کے گزردہ گلوں میں دیکھ جاتی.....

شاہد احمد دہلوی لکھتے ہیں:

سرسوں پھولی گویا دھرتی کے ہاتھ پہلے ہوئے..... ہاتھ پر تھاپ پڑی..... گیت گائے جانے لگے..... لڑکیاں دایاں ٹکڑیاں گائے لگیں.....

رت بہت میں اپنی انگ سوں
 پی ڈھونڈنے میں گھسی گھر سوں
 ملے تو لال گردا لگا لوں
 پاگ بندھاؤں پیلی سرسوں
 رت بہت میں اپنی انگ سوں
 رنگ ہے سبزہ رنگس یوں کا
 کہے شوق رنگ رنگ ہے واں کا
 ان بھیدوں کو کوئی نہ جانے
 واقف ہوں میں وا کی خبرسوں
 رت بہت میں اپنی انگ سوں

بہار شاہ شوق رنگ (ظفر)*

ٹھوسر سید احمد خاں کے نانا خواجہ فرید کی قبر پر چڑھ کر کہے میں بہت کا میلہ ہوا کرتا تھا۔ عہد جوانی
 میں سر سید اپنے بھائیوں کے ہمراہ اس میلے کے منتظم و مہتمم ہوا کرتے تھے۔
 مولانا الطاف حسین حالی لکھتے ہیں:

اس زمانے میں خواجہ محمد اشرف ایک بزرگ دلی میں رہتے تھے۔ ان کے گھر بہت کا جلسہ ہوا
 کرتا تھا۔ شہر کے خواص وہاں جمع ہوتے تھے۔ نای نای خواجہ نہیں زرد ہاں یکن کرواں آتی تھیں۔ مکان میں
 بھی زرد فرش ہوتا تھا۔ دالان کے سامنے ایک چھوڑا تھا جس میں خوش تھا۔ اس میں زرد پانی ہی کے فوارے
 چھوٹتے تھے۔ گن میں جو جمن تھا اس میں جھڑواں زرد پھول کھلے ہوئے ہوتے تھے طوائفیں باری باری بیٹھ کر
 گاتی تھیں۔ سر سید کہتے تھے کہ میں ہمیشہ وہاں جاتا تھا اور اس جلسے میں شریک ہوتا تھا۔

حوالہ جات

- 1-2۔ خطوط غالب مرتبہ غلام رسول مہر۔
- 3۔ فرہنگ آصفیہ از سید احمد دہلوی۔ رنگ میل پبلی کیشنز لاہور۔
- دوسم دہلی۔ سید احمد دہلوی۔ اردو اکادمی دہلی۔
- 3-4۔ ایضاً
- 5-8-9۔ آجڑا دارالشاہ احمد دہلوی۔ مکتبہ انبیا ل کراچی۔
- 10۔ حیات جاوید از مولانا الطاف حسین حالی۔

دلی کے پانچ شمس العلماء حضرات

الطاف حسین حالی، نذیر احمد، محمد حسین آزاد، ضیاء الدین، ذکاء اللہ

1- خواجہ الطاف حسین حالی

”جناب بھائی صاحب قبلہ! یقین ہے کہ آپ مع الخیر اپنے دایرہ ریاست میں پہنچ گئے ہوں اور بہ جمعیت خاطر روزہ رکھتے ہوں۔ سواپان کے کوئی خیال اور مولوی الطاف حسین کے فراق کے سوا کوئی وجہ نکال نہ ہو۔“

یہ غالب کے ایک خط سے اقتباس ہے جو انہوں نے ۷ فروری ۱۸۶۵ء کو نواب مصطفیٰ خان بہادر شیفتہ کے نام لکھا تھا..... ان دنوں خواجہ الطاف حسین جہانگیر آباد میں نواب صاحب کے دامن دولت سے وابستہ تھے اور ان کے صاحبزادے نقشبند خان مجبور کے اتالیق بھی تھے۔ خواجہ الطاف حسین ۱۸۳۶ء یا ۱۸۳۷ء میں پانی پت کے ایک انصاری گھرانے میں پیدا ہوئے۔²

پانی پت اگرچہ ضلع کرنال میں تھا لیکن اسے بیٹہ دلی کے مصافحات میں سے سمجھا گیا ہے اور جب جناب مالک رام خواجہ موصوف کو دلی والا مانتے ہیں تو ہم کون ہوتے ہیں انہیں پانی پتی کہنے والے۔ جیسے آج اگر آپ سے کوئی کہے کہ جاسمور حیدر آباد کا نہیں، دادو کا حصہ ہے تو کیا آپ نامیں گے؟

الطاف حسین نے ابتدائی تعلیم پانی پت میں حاصل کی۔ لڑکیں میں ہی دلی آ گئے۔ ۱۸۵۵ء میں منطق، فلسفہ اور عربی میں سند فیضیات حاصل کی۔ ۱۸۵۶ء میں ضلع حصار کی کلکٹری میں قلیل مشاہرے پر ملازم ہوئے۔ ۱۸۵۷ء میں ملازمت جاتی رہی۔ ۱۸۶۳ء سے ۱۸۷۰ء تک جہانگیر آباد میں نواب مصطفیٰ خان شیفتہ کے دربار سے وابستہ رہے۔ بعد ازاں گورنمنٹ پنجاب کے لاہور بک ڈپو میں ملازم ہو گئے اور وہاں چھپنے والی کتابوں کی اصلاح زبان کا کام ان کے سپرد ہوا۔ آٹھ ماہ لاہور چھپنے کالج میں استاد رہے۔ پھر انگوٹھ بک

سکول دلی میں استاد ہے۔ وہاں سے سرسید کے پاس ملی گڑھ چلے گئے۔ حیدرآباد سے خواب سرآسمان جاوہر علی گڑھ کے دورے پر آئے تو سرسید کی سفارش پر ان کا وکیلہ مقرر کر دیا جس سے غلامحاشی سے آزادی ملی اور نکسو ہو کر تصنیف و تالیف میں مصروف ہو گئے۔

۱۹۰۳ء میں ان کی قطعی خدمات کے صلے میں حکومت نے انھیں استقامت کا خطاب دیا۔ ۳۱ دسمبر ۱۹۱۳ء کو انتقال ہوا اور پانی پت میں حضرت بوعلی قلندر کے حرم مبارک کے احاطہ میں دفن ہوئے^۳۔

مولانا الطاف حسین حالی کو اردو میں سوانح نگاری کا لام کہا جاتا ہے۔ حیات سعدی حیات جاوید اور یادگار غالب سوانح نگاری کے فن میں ان کی مہارت کا مت یوں ثابت ہیں۔ حالی مضمون نگار تھے نثر تھے شاعر تھے اور مصنف تھے۔ ”مقدمہ شعر و شاعری“ نے اردو کی ادبی دنیا کے مجدد کو تازہ۔ اگرچہ یہ کتاب خاصاً قضاہ مدد رہی لیکن ان کی شہرت کا سنگ بنیاد اسی کتاب سے رکھا گیا۔ مگر جس کتاب نے حالی کو شہرت دوام عطا کی وہ نثر کی نہیں شاعری کی کتاب تھی۔ ”مسدس حالی“ جس کے بارے میں سرسید کہا کرتے تھے کہ بروئے مشر وہ اپنی محتاج اخروی کے طور پر مسدس اور اس کے مصنف کو بروئے محشر کے حضور پیش کریں گے^۴۔

شاعری میں شیخوۃ اور غالب کے شاگرد تھے۔ حالی انھیں کرتے تھے۔ ان کے کلام پر شیخوۃ کا رنگ زیادہ غالب ہے۔ شیخوۃ کے ہاں قیام نے حالی کی شخصیت کو نکھارنے میں بہت مدد دی۔ ان کی معیت میں حالی کو اس عہد کی ناہنر و نگار شخصیات غالب آرزو، فیاد، الدین خان اور حکیم احسن اللہ خان سے صحبت کے مواقع میسر آئے اور انہوں نے ان ناہنوں سے خوب کسب فیض کیا۔

حالی سخن میں شیخوۃ سے مستفیض ہوں

شاگرد میرزا کا مقلد ہوں میر کا^۵

”یادگار غالب“ کے دباپے میں تحریر کرتے ہیں:

”حیر ہویں صدی ہجری میں جبکہ مسلمانوں کا سزول و جہ غایت کو پہنچ چکا تھا اور ان کی دولت عزت و حکومت کیساتھ ظلم و فظول اور کمالات بھی رخصت ہو چکے تھے۔ حسن اتفاق سے ویرانہ فودلی میں چند اہل کمال ایسے جمع ہو گئے تھے جن کی محبتیں اور جلے عہد اکبری و شاہجہانی کی صحبتوں اور جلسوں کی یاد تازہ کرتی تھیں جن میں سے بعض کی نسبت مرزا غالب مرحوم فرماتے ہیں:

ہندو خوش نفساوند سخاوت مند

بادور غلوت شاں ملک فطاش ازوم شاں

مومن و نیر و صہبائی و ملوی و اگاہ

حسرتی اشرف و آرزوہ بود اعظم شاں

اگرچہ جس زمانے میں کہ بلی باد نام کا دلی جانا ہوا اسی زمانے میں اس باغ میں پت بھڑ شروع ہو

مکی تھی۔ کچھ لوگ دلی سے باہر چلے گئے تھے اور کچھ دلیا سے دھست ہو چکے تھے مگر جو باقی تھے اور جن کے دیکھنے کا کچھ کو بیش ضرور ہے گا وہ بھی ایسے تھے کہ نہ صرف دلی سے بلکہ ہندوستان کی خاک سے بھر کوئی وہی اہمیت نظر نہیں آتا کیونکہ جس سانچے میں وہ بچلے تھے اور جس ہوا میں انہوں نے نشوونما پائی تھی وہ ہوا پلٹ گئی۔ علی الخصوص مرزا اسد اللہ خان غالب جن کی عظمت و شان اس سے بالاتر تھی کہ ان کو بارہویں یا تیرہویں دہری کے شاعروں یا انکشاف وازوں میں شمار کیا جائے۔^{۹۱}

آگے چل کر لکھتے ہیں:

”میرا طیال ہے کہ اس ملک میں مرزا پر فاری نظم و نثر کا خاتمہ ہو گیا ہے اور اردو نظم و نثر پر بھی ان کا کچھ کم احسان نہیں ہے۔“^{۹۲}

2- محمد حسین آزاد

آزاد کا کچھ بت کرہ تو ان کے والد مولوی باقر کے ضمن میں ہو چکا ہے۔ دلی کالج سے تعلیم حاصل کی۔ دلی اردو اخبار کے مدیر رہے۔ خد میں جان بچا کر اور بقول خود اپنے استاد حضرت ذوق کی غولیں لے کر بھاگے۔ دو سال آوارہ رہے خانقاہ رہے۔ بنگراؤں چاندھرا اور پھر لاہور چلے گئے۔ دلی سے فرار کا حال ”مقدمہ دیوان ذوق“ میں اپنے مخصوص ڈرامائی اعزاز میں یوں بیان کرتے ہیں:

”میرا یہ حال ہوا کہ فتح باب لشکر کے بہادر دفعہ گھر میں گھس آئے اور بندوبست دکھائیں کہ چلو نکلو..... دنیا آنکھوں میں اندھیر چھی۔ بھرا ہوا گھر سامنے تھا اور میں حیران تھا کہ کیا کیا کچھ اٹھا کر لے چلوں.... ان کی غولوں کے جنگ پر نظر پڑی۔ یہی خیال آیا کہ محمد حسین زندہ کی باقی ہے تو سب کچھ ہو جائے گا مگر استاد کہاں سے پیدا ہوں گے جو غولیں بھرا آ کر کہیں گے۔ اب ان کے نام کی زندگی ہے اور ہے تو ان پر منحصر ہے۔ یہ ہیں تو سر کر بھی زندہ ہیں۔ یہ نہیں تو نام بھی نہ رہے گا وہی جنگ اٹھا بھٹل میں مارا بچے سوائے گھر کو چھوڑا۔ ہاتھیں نیم جانوں کے ساتھ گھر سے بکھرے نکلا.... آوارہ ہو کر خدا جانے کہاں نکل آیا۔“^{۹۳}

۱۸۶۰ء میں لاہور میں جنرل پوسٹ میں سر رشتہ دار مقرر ہوئے۔ جنوری ۱۸۶۳ء میں ڈائریکٹر پبلک انکوائری کے چھلکے میں چھوٹی سی ملازمت ملی۔ ۱۸۶۵ء میں ڈاکٹر لائسنس نے انجمن پنجاب قائم کی جس کے مقاصد تھے تہذیب مشرقی علم و حکمت کا احیاء مقامی زبانوں کے ذریعے ہر طرح تعلیم کی فراہمی عام دلچسپی کے معاشرتی ادبی اور سائنسی مسائل پر بحث اور تعلیم یافتہ اور پائز طبقوں کی عمالی حکومت سے مداخلت۔ آزاد نے جوش و خروش کے ساتھ انجمن کی سرگرمیوں میں حصہ لیا۔

۱۸۶۵ء میں حکومت نے انہیں وسط ایشیا میں جاسوسی کی مہم پر بھیجا۔ ۱۸۶۸ء میں کرنل بالرائیڈ کی ہدایت پر قصص ہند کا دوسرا حصہ تحریر کیا۔ پہلا حصہ پیارے لال آشوب نے تحریر کیا تھا۔ بعد ازاں محمد ان قادری

آب حیات اور سیر ایران مضر عام پر آئیں۔ آزادانہ کمال چاکیہ تھی سے اپنے وسط ایشیا کے مشاہدات کو ایران پر قصبہ دیا۔ لاہور سے نکلنے والے سرکاری ٹرین کے ”ایٹلیٹ پنجاب“ کے سب ایٹلٹ ہزارہ ہے۔ اس کے بعد ہو جانے کے بعد ”پنجاب ٹیکسٹ“ کے سب ایٹلٹ ہزارہ ہے۔

گورنمنٹ کالج لاہور میں عربی اور فارسی کے استاد رہے۔ ۱۸۸۸ء میں ملک وکنڈر یہ کی جوبلی کے موقع پر محترمہ کا خطاب ملا۔ ۱۸۸۹ء میں انگلستان ڈیمن میں جھکا ہوئے۔ ۲۲ جنوری ۱۹۱۰ء کو انتقال ہوا۔^۹ آجے ذرا دیکھیں تکیہ ذوق آفرین قالب کے بارے میں کیا رائے رکھتے تھے۔ ایک اور محترمہ انصواء مفتی ذکا اللہ کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

”مرزا قالب کا یہ حال ہے کہ سوائے شاعر ہونے کے کوئی ٹولہ اس میں نہ تھی۔ جسداں ہند تھا کہ کسی کی عزت کو نہ دیکھ سکتا تھا۔ تنگ دل ایسا تھا کہ سارے بھائی بھندوں کی حق تلفی کرنے میں اس کو انہوں نے نہ تھا۔ جس روز ذوق مرگیا تو خوش ہو کر کہتا تھا کہ آج بھندوں کی بولی بولنے والا مر گیا۔ رند مشرب ایسا تھا کہ کہا کرتا تھا کہ صبا کی شعر کہتا کیا جانتے؟ اس نے شراب پی ڈقار بازی کی نہ معشوقوں کے ہاتھوں سے جو تیاں کھا کیں؟ دیکھ لٹانے میں پڑا طامع ایسا تھا کہ ایک ایک قصیدہ اس دس بجے پڑھا تھا۔ اس لیے قصائد میں یہ نہیں لکھا کہ کس کی تعریف میں ہے بلکہ نمبر ان پر لگائے ہیں۔ سبز دہم دہم خیم۔ میرے نزدیک نقطہ اس کی شاعری سے آپ غرض رہیں اور کچھ فسادک و اخلاق سے بحث نہ ہو۔۔۔۔۔ عام اعتقاد مرزا پر یہاں کے لوگوں کا یہ ہے کہ فارسی کا شاعر اچھا تھا لیکن اردو کی نظم و شعر اس کی یہاں کے لوگوں کو پسند نہیں۔ نکات قالب سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان کی تحقیق میں غفلت کتب تھا۔ سوائے چند مصداق کی تحقیقات کے اس کو کسی اور محترمہ سے خبری نہیں۔“^{۱۰}

3۔ مولوی نذیر احمد دہلوی

۱۸۳۶ء میں بجنور کے ایک گاؤں ریڑھ میں پیدا ہوئے۔ لڑکپن میں دہلی آ گئے۔ اورنگ آبادی مسجد میں مولوی عبدالخالق کے شاگرد ہوئے۔ بعد ازاں ان کی پوتی سے شادی ہوئی۔ پھر دہلی کالج میں تعلیم حاصل کی۔ مولوی ضیاء اللہ بن اور مفتی ذکا اللہ ان کے ہم درس تھے۔ عربی میں مولوی ملک علی خان قوی اور فارسی میں صدر الدین آزاد و ذوق کے شاگرد تھے۔ ۱۸۵۳ء میں کجاہ ضلع گجرات میں چالیس روپے ماہوار پر مدرس مقرر ہوئے۔ دو برس بعد دہلی انسپکٹر مدارس ہو کر کانپور چلے گئے۔ انگریز انسپکٹر سے نہ نئی مستعفی ہو کر دہلی واپس آ رہے تھے کہ ۱۸۵۷ء کی شورش شروع ہو گئی۔ اس ہنگامے میں مولوی صاحب نے ایک انگریز عورت کی جان بچائی۔ خود کے بعد دہلی انسپکٹر مدارس الزام آدھینات ہوئے۔ انگریز کی زبان نہ سیکھی۔ قانون تحریرات ہند کا ترجمہ کیا۔ اس کے سبلے میں کانپور میں تحصیل دار مقرر ہوئے۔ بعد ازاں ترقی کر کے ڈپٹی کلرک ہو گئے۔ چودہ

سال تک یوپی کے مختلف اضلاع میں اسی منصب پر فائز رہے۔ اس دوران مراۃ المعروضات نامتو بعض قوتیہ اصحاح اور انہی اوقات شائع ہوئیں۔ غلط حال سے مستغنی ہو کر حیدر آباد چلے گئے اور وہاں ترقی کرتے کرتے ریاست کے بورڈ آف ریلوے کے ممبر ہو گئے۔ ۱۸۸۳ء میں دلی واپس آ گئے اور تصنیف و تالیف میں مصروف ہو گئے۔ کثیر تصانیف اور سربلج تصنیف تھے۔ ان کی دیگر معروف کتب میں محسنات الہامی، امہات الامم، منتخب انکبایات روپائے صادق، مہادی انگلہ، فسانہ خدر، قانون شہادت، اجتہاد قرآن، مطالب القرآن اور الحقوق والفرائض شامل ہیں۔ ۱۸۹۷ء میں شمس العلماء کا خطاب ملا۔ ۱۹۰۴ء میں یونیورسٹی آف لائے ہرائے ایل ایل وی کی اعزازی ڈگری دی۔ ۱۹۰۰ء میں پنجاب یونیورسٹی نے ایل ایل وی کی ڈگری دی۔ ۱۹۱۴ء میں انتقال ہوا۔^{۱۱} اپنی صاحب کی مغربی کی کھالی زبان کا شاعر مضمون ہے۔ انہی اوقات سے ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

”مے ہے خدر کے دنوں میں کچھ ایسی گھڑی کا بھرا اس موئے فرنگی کا آیا تھا کہ بچے کی مت بھیر دی۔ ہم سے تو ایسا چھپایا ایسا چھپایا کہ دن کو گودے شہر میں گھسے اور رات کو ہم نے جانا کہ سارے خدر ہمارے گھر میں فرنگی چھپا رہا جس وقت فرنگی کو لائے تھے اگر ذرا بھی مجھ کو معلوم ہوتا تو میں اس کو کھڑا پانی نہ پینے دوں۔ خدا جانے کم بخت کہاں سے ہمارے گھر آ کر تھا۔ خدا تانا بچہ ہاتھ سے جاتا۔ آخر میرا صبر بڑا بڑا۔ کسی کی آواز کا لیا کہ چائیں ہوتا۔ خدا نے اس کے پیچھے ایسا روگ لگا کر سارے سارے دن انوائی کھوائی لیے پڑا رہتا تھا۔ آخر کو جاتے ہی بن چڑی۔ کالا مت خدا کرے پھر آنا نصیب نہ ہو۔“

”کیا جانیں بھائی سنتے ہیں کہ فرنگی بڑے جادو گیرے ہوتے ہیں۔ جادو کے ذور سے سارے ملک لینے چلے جاتے ہیں اور ان کو ایسا جادو آتا ہے کہ ایک بل میں ہزاروں کوس کی خیر منگو لیں۔ تم ان کی بادشاہ زادی کو لکھو کہ تمہارے فرنگیوں نے ایسا غم کر رکھا ہے کہ ہمارے آدی کو بھلا کر فرنگی بنا لیا ہے۔ اگر وہ جگ جگ کی بادشاہ زادی ہے تو ضرور ہماری فریاد کے لیگیں لیٹنے آ دی کہتے ہیں کہ بادشاہ زادی کو مت لکھو کہ کتنی کو لکھو۔ کتنی اس کی بیٹی ہے اور بادشاہ زادی نے یہ ملک بیٹی کے عزیز میں دے ڈالا ہے۔ اب کتنی کا غم چل رہا ہے۔ سو تم کو تو اصل حال معلوم ہو گا کسی ایسے کو لکھو کہ بس دیکھنے کے ساتھ ہی غم کرو۔ بھلا کہیں خدا کی خدائی میں ایسا بھی کہیں اندھیرا ہوا ہے کہ آپ ہی تو فرنگیوں نے ملایا اپنے میں ملایا پھر دوسرا فرنگی ایسا خالم آیا کرتا ہے کہ ساتھ لگا دشمنی کرنے۔ دیکھتا تم بادشاہ زادی کو یہ ساری باتیں لکھواتا بھولنا مت ذرا یہاں کے فرنگیوں کی بھی تو حقیقت کھلے کسی بھلے آدی کو دھوکا دینا ایسا ہوتا ہے۔ بادشاہی کیا گی سارے فرنگی بے سرے ہو گئے۔“^{۱۲}

۴۔ مولوی ضیاء الدین

دلی کی نواسی ہستی دارا پور میں داروغہ (تھانیدار) شیخ محمد بخش کے گھر پیدا ہوئے۔ تعلیم دلی کالج میں

حاصل کی۔ مولوی نذیر احمد اور ذکا اللہ کے ہم دریں مولوی مسلوک اعلیٰ اور صدر الدین آزاد کے شاگرد تھے۔ پنجاب کے ضلع گجرات کے ڈپٹی کمشنر مسٹر ٹیمپل نے اپنے ضلع میں جو وسیع تعلیم کا منصوبہ بنایا اور اسی سلسلہ میں یونی کے محکمہ تعلیم کے اچھا راج بھری مشورہ دیا جو مولویوں کا انتظام کرنے کو کہا۔ مسٹر ریڈ نے دلی کالج کے پرنسپل کو رچ ڈیمپل کی فرمائش پوری کرنے کو کہا۔ کالج کے چھ اعلیٰ طلبہ کو پنجاب بھیجے کا فیصلہ ہوا۔ ان میں نذیر احمد بھی شامل تھے لیکن خیاہ الدین اپنے والد کے اثر و رسوخ کے عمل بوتے پر منتخب ہو گئے اور نذیر احمد مزید دیکھتے رہ گئے لیکن کرنا خدا کا کیا ہوا کہ دوران سفر خیاہ الدین اپنے میں مبتلا ہو گئے اور ملازمت کا ارادہ ترک کر کے دلی واپس آ گئے۔ ان کی جگہ نذیر احمد کو پنجاب بھیجا گیا۔ نذیر احمد نے اپنے ساتھ ہونے والی لیا دلی پر غم و غصے کا اظہار کیا لیکن ضرورت مند تھے لہذا آزاد ہو گئے۔¹³

دارودہ صاحب ۱۸۵۷ء کی رستخیز کے دوران قلعے اور شہر کی خبریں انگریزوں کو پہنچاتے تھے۔ جب اہل دلی کو شکست ہوئی اور انگریز شہر میں داخل ہوئے تو دارودہ جی جو ہر خواہان سرکار میں سے تھے خفا طبعیتان کال گھر سے باہر نکل آئے اور ایک کورے کی گولی کا نشانہ بن گئے۔ بعد ازاں فرینڈلی قانز کے نتیجے میں ہونے والی اس المناک موت پر رنج و غلظ کا اظہار کیا گیا اور ایک شوئی کے لیے مرحوم کے فرزند مولوی خیاہ الدین کو راضی اور خان بہادر دی عطا کی گئی بعد ازاں ملازمت بھی دی گئی۔ پہلے نائل سکول میں پڑھاتے رہے پھر ۱۸۶۳ء دلی کالج میں استاد ہو گئے ۱۸۷۶ء میں کالج بند ہوا تو ایکسٹرا اسٹنٹ کمشنر کے عہدے پر قانز ہوئے۔ ۱۹۰۷ء میں جج کرنے گئے اور وہیں انتقال ہوا۔¹⁴

سرکار نے فہم العلماء اور ایڈیٹر ایجوکیشن نے ایل ایل ڈی کی اعزازی ڈگری عطا کی تھی۔ ۱۸۶۶ء میں حکومت ہند نے انھیں برطانیہ سے نوادارہ فوجی افسروں کو اردو پڑھانے کے لیے نصاب مرتب کرنے کو کہا۔ انہوں نے غالب سے بھی درخواست کی کہ وہ اس سلسلے میں مدد کریں اور چند خطوط اور کچھ مترجمانیت کریں۔ چنانچہ غالب نے ایک مجموعہ مرتب کر کے دیا جس میں دو بیاسے ہمارے خطوط دو تھیں ایک لطیف اور ۱۳ اشعار تھے لیکن مولوی خیاہ الدین خان نے اس میں سے صرف دس خطوط ہی "انتخاب اردو" میں شامل کیے¹⁵۔ مجموعے کے آغاز میں غالب تحریر فرماتے ہیں:

”بسم اللہ الرحمن الرحیم

یہ کتاب جو دو باب کی ہے حقیقت یہ اس کتاب کی ہے کہ پہلے باب میں دو بیاسے اور کئی لطیفے اور کئی بکثوب ہیں۔ اگر میرے لکھے ہوئے نہ ہوتے تو میں کہتا کہ بہت خوب ہیں۔ دوسرا باب اشعار کا ہے کہ وہ بھی کلام اسی خاکسار کا ہے۔ اگر کوئی خط اردو زبان میں لکھا جائے ان اشعار میں سے شعر نکل و مقام کے مناسب درج کیا جائے اور یہ مجموعہ نذیر اس پنجاب رفعت مآب کے ہے جس سے عزت و توقیر قری نفل کشمیری صاحب کی ہے۔ صاحب والا مناقب عالی شان علم و اہل علم کے قدر دان یکاثر روزگار جن کا مطلع و نغمہ ہوا اہل

ہندو کو سرمایہ عزت و افتخار والا پایہ عالی رتبہ معلی القاب، حضرت ملک رفعت، میکوڑ صاحب، فیاض کشتربہاؤر قلم رو بنجاب۔ پس یہ کتاب اگر ان کے حکم سے چھاپی جائے گی تو صاحبان تازہ وارد ولایت کے پڑھنے کے کام آئے گی۔ اس کتاب کا تذکرہ کرنے والا جو اپنی نذر کے قبول ہونے کا غالب ہے۔ نصر اللہ بیگ خان بہادر نہیں سوچ سکتا، جیسا موسوم بہ اسماء اللہ خان و محکمات بہ غالب ہے۔ میرے بچا کی سرداری اور پاست کا حال (اور گورنمنٹ بہادر سے خاص میری ملازمت اور تفریط کی کیفیت) گورنمنٹ اعلیٰ کے دفتر میں مرقوم ہے اور میرے قصیدے کا بنجاب مستطاب لارڈ الٹن براہادر کے ذریعے سے وزیر اعظم کے پاس پہنچا اور حضرت قدر قدرت شہنشاہ مجرور معظّم و محکم کے حضور پُر نور میں گزارنا الزمرے مشاہدہ خطوط آمد و ولایت جو بہ مکمل ڈاک مجھ کو ولایت سے آئے ہیں۔ گورنمنٹ بہادر ہندوستان کو معلوم ہے اہلیت میں اس کا مستحق ہوں کہ ”کوٹھس پخت“ میں جاؤں اور اس علاقے سے ایک نیا نام اور نئی عزت پاؤں۔ اگر وجہ نہ ہو حالاً جائے قدریم عزت میں تفریق نہ آنے پائے۔“^{۱۶}

عالم نے مولوی ضیاء الدین بہادر کی فرمائش پوری کی لیکن مولوی صاحب نے جو سلوک عالم سے کیا وہ کچھ ایسا ہی تھا جو جنہوں نے اپنے دوست مولوی خدیو احمد کے ساتھ اپنے کیرئیر کے آغاز میں کیا تھا۔ وہاں کہ عالم کی ”قاطعہ برہان“ کے جواب میں ایک صاحب مولوی امین الدین نے ”قاطعہ القاطع“ لکھی جس میں انتہائی شرم ناک اور غلط زبان استعمال کی اور عالم پر بے حد رقتیں چلے گئے۔ ۱۸۶۷ء میں عالم نے مولوی مذکور کے خلاف ازاد حیثیت عرفی کا مقدمہ دائر کر دیا۔ مولوی امین الدین نے اپنے صفائی کے گواہوں میں مولوی ضیاء الدین خان بہادر کو بھی شامل کیا۔ مولوی ضیاء الدین صاحب نے ان گالیوں کے ایسے ایسے دورا زکار معافی بیان کیے اور ایسی اسانی موشگافیاں کہیں کہ اگر یہ مجلس رٹ چکرا کر رہ گیا۔ مجلس رٹ سے ناپاؤہ عالم چکرا گئے اور حالات کا رخ دیکھتے ہوئے مقدمے سے دستبردار ہوا اختیار کی اور راضی نامہ داخل کر دیا۔^{۱۷}

5- مولوی ذکاء اللہ دہلوی

۱۸۳۲ء میں بہادر شاہ ظفر کے بیٹے کو چک سلطان کے ۱۵ لکھ حافظ ثناء اللہ کے پاس پیدا ہوئے۔ بارہ سال کی عمر میں دہلی کالج میں داخل ہوئے۔ مولوی خدیو احمد اور محمد حسین آزاد کے گہرے دوست تھے۔ ریاضی کے ماہر تھے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد اسی کالج میں ریاضی پڑھانے پر مقرر ہوئے۔ بعد ازاں آگرہ کالج میں فارسی اور اردو کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ ۱۸۵۵ء میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس ہندو شہر واد آباد ہوئے۔ ۱۸۶۹ء میں دہلی سکول کے مدرس اعلیٰ بنائے گئے۔ ۱۸۷۲ء میں میونسپل کالج کالج آباد میں عربی اور فارسی کے پروفیسر مقرر ہوئے اور وہیں سے ریٹائر ہوئے۔ ۱۹۱۰ء میں انتقال ہوا۔^{۱۸}

انہوں نے ریاضی طبیعیات، کیمیا، جغرافیہ، ادب، اخلاقیات، سیاسیات جیسے متنوع موضوعات پر ڈیڑھ سو کے قریب کتب تصنیف اور تالیف کیں۔ دس جلدوں پر مشتمل ضخیم تاریخ ہندوستان ان کی یادگار کتاب ہے۔ ملکہ کنور کے عہد کے حوالے سے کتاب ”آئین قیصری“ بھی عمدہ تصنیف ہے۔ وہ اپنے عہد کے تمام معروف جرائد مثلاً تہذیب الاخلاق، علی گڑھ سائنٹفک گزٹ، مخزن زمانہ، ادیب اور خاتون دہلیہ میں باقاعدہ مضامین لکھا کرتے تھے۔ اس حوالے سے مولانا حالی نے ان پر سمجھتی کسی قسم کی مولوی ذکا ماند کا دماغ ایک نئے کی دکان ہے جس میں ہر قسم کی جنس موجود رہتی ہے۔ حکومت نے ان کی علمی اور تعلیمی خدمات کے سلسلے میں خان بہادر اور شمس العلماء کے خطاب عنایت کیے۔ تعلیم نسواں کی ترقی کے سلسلے میں ان کی خدمات پر خلعت عطا ہوا۔¹⁹

حوالہ جات

- 1- غلطوبہ غالب مرحومہ غلام رسول مہر۔
- 2-3- تاریخ ادب اردو از رام بابو سکینہ۔
- 4-5- حیاتہ غالب از مالک رام۔
- 6-7- یادگار غالب از الطاف حسین حالی۔
- 8-9- محمد حسین آزاد، احوال و آثار از ڈاکٹر محمد صادق۔
- 10- آب حیات کے ماخذ بحوالہ ڈاکٹر محمد صادق۔
- 11- تاریخ ادب اردو از رام بابو سکینہ۔ ابن الوقت از لڑائی نذر احمد۔
- 12- ابن الوقت۔ لڑائی نذر احمد۔
- 13-14-15- انشائے غالب از رشید حسن خان۔
- تاریخ ادب اردو از رام بابو سکینہ۔
- 16- انشائے غالب از رشید حسن خان۔
- 17- یادگار غالب حالی، انشائے غالب از رشید حسن خان۔
- 18- تاریخ ادب اردو از رام بابو سکینہ۔

سر سید احمد خان..... آثار الصنادید اسباب بغاوت ہند

نواب مغلّی القاب سر سید عالی جناب سلامت!

مشہور رافت نشان کے موصول ہونے سے مجھے خوشی ہوئی مگر اس میں جو حجم مجھے دیا گیا ہے افسوس ہے کہ اس کی بجائے دہری اور سرانجام دہی سے معذور ہوں۔ ایک دو شعر کسی دوسرے شخص کے لکرا کر ان پر دو چار اشعار بڑھا دیے دہن دہی کا کونسا اسلوب اور معنی ہر دہی کا کونسا طریقہ ہے؟ خاص کر یہ دو اشعار جو جناب نے ارسال فرمائے ہیں ان میں سوائے عربی الفاظ کی شوکت و شکوہ کے اور کیا دھرا ہے؟ یہ اشعار معنی آفرینی اور نکتہ نجی کے حسن سے بھر معرا ہیں۔

حضور اشرف المرسلین علیہ السلام کی محبت میں اس فقیر حقیر کے قصیدے اور مثنویاں موجود ہیں۔ ان میں سے ایک مثنوی نقل کر کے خدمت والا میں ارسال کر رہا ہوں۔ اسے ملاحظہ فرمائیں اور اس کا مطالعہ کریں اور بعد سے اس کی فرمائش و فرمائشیں جو شاعروں کا شیوہ اور سخن مستردوں کا طریقہ نہیں۔ ویسے مجھے اپنا نام سمجھیں اور اپنے بڑے بھائی صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ کو میرا سلام پہنچا دیں۔ والسلام

از اسد اللہ^۱

سر سید احمد خاں نے آگرہ سے مرزا غالب کو ایک خط میں مولوی غلام امام شہید کے دو نعتیہ اشعار بھیجے تھے اور ان پر قصیدین لکھنے کی خواہش ظاہر کی تھی جس سے غالب نے معذرت کی تھی^۲۔

غالب سر سید کا بے حد احترام کرتے تھے۔ ”آ جا رہا صنایع“ پہ غالب نے جو تقریر لکھی اس میں کتاب و صاحب کتاب پر داد و تحسین کی بارش کی گئی تھی لیکن تصحیح آئین اکبری کا جو دیباچہ غالب نے تحریر کیا وہ^۳ سر سید کو اس قدر ناگوار خاطر گزارا کہ انہوں نے اسے کتاب میں نہ چھپوایا اور یہ غالب غالب کا تحریر کردہ واحد دیباچہ ہے جس میں انہوں نے مصنف اور مؤلف سے نہ صرف اختلاف کا اظہار کیا بلکہ سر سید کی کوشش کو تصحیح اوقات قرار دیا۔ حالانکہ غالب نے تو ”مکرم مراد“ اور ”حدائق الافکار“ جیسی داستانوں کے دیباچوں میں مؤلفوں اور مترجموں پر داد و تحسین کے ڈنگے برسائے تھے۔ اختلاف صرف سر سید کے ضمن میں ہوا۔۔۔

مرسید برصغیر کی ایک ممتاز شخصیت ہیں لیکن اس میں شک نہیں کہ بڑے آدمی تھے۔ تاریخ ساز اور رحمان ساز۔ انہوں نے برصغیر کی تاریخ 'سیاست' ثقافت' ادب' صحافت' یہاں تک کہ مذہب پر بھی اپنے نقوش چھوڑے۔

دلی کے سربراہ بہرام خان کے قریب ایک بہت بڑی حویلی تھی جس میں دیوان خانہ، لیل خانہ، اصطبل اور متعدد مکانات تھے۔ یہ خواجہ فرید کی حویلی کے نام سے مشہور تھی۔ اس کے ایک حصے میں جو خواص پورہ کہلاتا تھا ۱۷ اکتوبر ۱۸۷۷ء کو سید احمد خان پیدا ہوئے۔ خواجہ فرید الدین احمد ان کے نانا تھے۔ فرید الدین احمد دیر الدولۃ امین الملک 'مصلح جنگ' کے خطابات رکھتے تھے۔ ریاضی کے ماہر تھے۔ انہوں نے کھٹو میں علامہ تخلص حسین خاں سے ریاضی کی تفصیل کی تھی۔ خود بھی دلی میں ریاضی کی تعلیم دیتے رہے۔ تاریخ، جغرافیہ، علم فلکیات اور آلات رصد کے استعمال میں بھی ماہر تھے۔ ۱۸۰۳ء میں گورنر جنرل نے سفیر بنا کر ایران فتح علی شاہ قاجار کے دربار میں بھیجا۔ برما میں پولیٹیکل ایجنٹ کے طور پر کام کیا۔ پھر بنیال کھٹ میں تحصیل دار ہوئے۔ ۱۸۱۵ء میں اکبر شاہ جانی نے منصب وزارت پر سرفراز کیا۔ خواجہ فرید نے قلعہ معلیٰ میں اصلاحات نافذ کیں۔ بادشاہ خاصے مقرر ہو گئے تھے۔ خواجہ صاحب نے آمد و خرچ میں پائے جانے والے وفاق عدم توازن کا خاتمہ کیا۔ یہ خارجہ کوششوں سے اور غیر ضروری اخراجات پر پابندی سے ممکن ہوا۔ شیر لادوں، بیگمات اور عمال شاہی کی تحویلوں میں دس لاکھ روپیہ کی وجہ سے قلعے میں نقصان کے خلاف ہوئی تو انہوں نے استعمالی دے دیا اور کلکتہ چلے گئے ^۴۔

۱۸۲۸ء میں ان کا انتقال ہوا۔ ان کے ایک فرزند زمین الہ آباد میں بھی ریاضی اور فلکیات کے ماہر تھے۔ اصغر لاپ خود بنایا کرتے تھے۔ انہوں نے چنگ بنانے اور ڈانے کے اصولوں پر بھی ایک رسالہ تالیف کیا تھا۔ سید احمد خان کے دادا سید ہادی منصب دار تھے۔ جزا ری فوات پانصد سوار اور اسد و ساپہ شاہ عالم نے جواد اللہ والہ کا خطاب دیا تھا۔ سید ہادی کے فرزند اور سید احمد کے والد میر تقی کوشاہ عالم اور اکبر شاہ کے عہد میں دربار عام اور دربار خاص میں بلند منصب حاصل رہا۔ تصوف کی طرف میلان تھا۔ شاہ نظام علی کے مرید تھے۔ حیرا کی اور حیرا اندازی میں جو شرفائے دلی کے فنون کبھے جاتے تھے میر تقی کو ان میں کمال حاصل تھا ^۵۔

سید احمد نے بچپن میں حیرا کی اور حیرا اندازی سیکھی۔ نانا کی حویلی کی بچوں پر چٹکس اڑائیں۔ گیند بلا اور کبڈی بھی کھیلی۔ مولوی حمید الدین سے کریم الخاں پاری آدناہ گلستان اور بوستان چڑھیں۔ ساموں سے تقلیدیں ریاضی اور فلکیات کی تعلیم حاصل کی۔ خطابت بھی سیکھی ^۶۔

عقوان شباب میں سراگ رنگ کی محفلوں اور رقصین صحبتوں میں شرکت کے شوقین رہے۔ مولانا حالی دلی کی ایک ایسی محفل کا ذکر کرتے ہیں جس میں دلی کی مشہور طوائف شیریں جان اپنی والدہ کے ساتھ موجود تھی۔ شیریں جان کی بد صورت والدہ کو دیکھ کر سید احمد کے ایک فنکار ہادی دوست نے کہا

مادوش بسیار تلخ است سید نے فوراً کہا "نہیں بر شیریں دارد"۔

۱۸۳۸ء میں والد کے انتقال کے بعد مالی حالات خراب ہوئے تو انگریز سرکار کی نوکری کرنے کی ضمانتی۔ خالو بکھری میں صدر امین تھے ان سے کام لینے کا شروع کیا پھر دہلی میں سررشتہ دار مقرر ہوئے۔ ۱۸۴۱ء میں مصطفیٰ کا امتحان پاس کیا اور آگرہ میں منصف مقرر ہوئے۔ ۱۸۴۳ء میں بہادر شاہ ظفر نے جواد اللہ اور عارف جنگ کے خطا ہات سے نوازا۔ ان کے بھائی سید محمد دہلی سے "سید الاخبار" کے نام سے اخبار نکالا کرتے تھے۔ اس میں مضامین لکھتے رہے۔ ۱۸۴۶ء سے ۱۸۵۳ء تک دہلی میں منصف رہے۔ اسی دوران میں شہر اور حوالی شہر میں واقع عمارات پر تحقیقات کا طویل پیدہ ہوا۔ اپنے دیرینہ دوست مولوی امام بخش صہبائی کو ساتھ لیا۔ ایک ایک عمارت کا نقشہ تیار ہو رہا ہے۔ کہتے نقل کہے جا رہے ہیں۔ یہ نقل ہو رہی ہے۔ محل قلعہ حوالیاں "مسجدین" مصدر اور بازار یہاں تک کہ ہاؤلیاں اور کونہیں بھی کھنگال ڈالے گئے۔ لڑنے والے برس میں آثارِ ہند وید چھپ کر آ گئی۔

۱۸۵۳ء میں دوسرا ایجنٹن آ جا جو پہلے ایجنٹن کی عمارت آرائی سے پاک تھا۔ ۱۸۶۱ء میں ممتاز فرحتی عالم اور مستشرق مسیح گارسیں دہائی نے اس کا فرانسیسی میں ترجمہ کیا۔ اس ترجمے کو دیکھ کر مکمل انشیا تک موسائی لندن نے سید احمد کو اعزازی فیلوشپ عطا کی۔

۱۸۵۸ء میں صدر امین ہو کر دہلی سے بجنور گئے اور وہاں قیام کے دوران انہوں نے آئین اکبری پر کام شروع کیا۔ کتابت کی غلطیوں کی تصحیح "قاری" عربی، ترکی اور سنسکرت کے شکل الفاظ کی شرح نیز حاشی تحریر کیے۔ غالب سے دیباچہ لکھنے کی فرمائش کی گئی۔ مظلوم قاری دیباچے کا جو چھپ نہ پایا تو بعد میں درج ذیل ہے:

احباب کو حزوہ ہو کر یہ کتاب قدیم
چشم چننا ہوئی بازو میں قوت آئی
جام آئین اکبری کی تصحیح کے بارے میں انکی فکر
اس مشغلے میں وہ اپنا حق بھلاتے رہے
جو اس کی اصل قدر و قیمت سے آگاہ نہ ہو
میں جو شیوہ دیا کے مخالف ہوں
میں اگر اس کام پہ انہیں دلا نہ دوں
میں فن سخن میں بدکیش نہیں
آج دنیا میں اس مال کا کوئی خریدار نہ ہوگا
انہوں نے سوچا ہوگا کہ یہ ایک دقیقہ دستاویز ہے
اگر کلام و آئین پر ہی بات ہوتی ہے
سید کی کوشش سے مظر عام پہ آئی
قدامت نے جامہ جدت زیب تن کیا
ان کی امت خالی کے لیے ہامٹ عار ہے
اور ایک کار عہد میں مصروف رہے
وہی اس کام کو لائق ستائش سمجھ سکتا ہے
اور دقت کشی میں اپنا رتبہ بچھاتا ہوں
تو خود اس قائل ہوں کہ مجھے داد دی جائے
اور گمان رکھتا ہوں کہ دوسروں سے زیادہ جانتا ہوں
اور صاحب مال کو اس سے فلاح کی امید نہ کھنی چاہیے
جانے انہیں کون سی قائل ملاحظہ چیز دکھائی دی
تو آنکھیں کھول کر اس دیر کھن میں

ان کے شیوہ و انداز پر نظر ڈالیں اور جو کجی کسی نے دیکھا تھا انہوں نے نہ دکھایا ان کی مسامی نے اسلاف پر سبقت حاصل کی ان سے بہتر سلطنت چلانا کسی کے بس میں نہیں ہندوستان کو سو طرح سے آراستہ کیا یہ اہل ہنر کس طرح نکلے سے پیدا کر لیتے ہیں کہ دھواں پانی میں کشتی کھینچا ہے اور دوسرے زمین پر پیسہ چلاتی ہے اور قتل یا گھوڑے کی مانند کام کرتی ہے ہوا اور موج آب دونوں بے کار ہو گئے ہیں اور حرف کو طائر کی مانند قوت پر واز بخشنے ہیں دو گھڑی میں سو کوں سے پیغام لے آتے ہیں ہوا انکارے کی طرح دیکھتے گشتی ہے راتوں کو یہ شہر بغیر چراغوں کے جنگلاتا ہے ان کے ہر آئین میں نئی طرز کے صد ہا کام پاؤ گے دیگر آئین پرانی ہجرتی کی حیثیت اختیار کر گئے کیا اس کتاب میں بھی اس طرح کے آئین موجود ہیں تو وہ اس قدیم ٹرسن کی خوش چینی کیوں کر رہے گا قصہ میں تو اس سے بہتر طرز کا جوڑا ہونا چاہیے سر ہے تو تاج بھی ہے اس نکل سے تازہ رطب اب بھی برستے ہیں تم ہی کہو وہاں گلزار کے سوا کیا رکھا ہے اگرچہ تو نے اچھی بات کہی لیکن نہ کہنا اچھا ہے تعریف نہیں دعا کوئی حیرا شیوہ ہے جو سر تا پا علم و شکوہ کی تصویر ہیں اور خوش بختی ہمیشہ ان کی خدمت میں حاضر رہے

اس نظم میں غالب نے تاریہتی و دعائی جہاز اور سیلے کا ذکر کیا ہے۔ ریل کے سفر کے بارے میں

اہل انگلستان کو دیکھیں انہوں نے کیسے کیسے آئین مقلیق کیے ان ہنرمندوں سے ہنر نے ترقی پائی آئین داری کا حق اسی قوم کو حاصل ہے انہوں نے علم و عمل کا ایک احتواج پیدا کیا آگ جسے لوگ چتر سے نکالتے ہیں ان لوگوں نے پانی پہ کیا انہوں نے دیا ہے اور بھاپ سمندر میں کشتی بھاپ پہنے کے دھڑے کو گھماتی ہے کشتی دھواں سے حرکت میں آتی ہے یہ لوگ سحراب کے بطیر سارے نقشے پیدا کرتے ہیں تم دیکھتے نہیں کہ یہ صاحبان علم یہ حضرات ہوا میں آگ لگا دیتے ہیں لندن جا کر اس گھڑاں تاباں کو دیکھو ان صاحب ہوش لوگوں کے کام پر نظر ڈالو ان کے آئین نو کے آگے اسے بیدار مغز و فاضل مندا جب کسی کو موتیوں کے خزانے دکھائی دے رہے ہوں اگر تم کہو کہ اس کی طرز تحریر عمدہ ہے ہر ایک سے بڑھ کر اچھا موجود ہے مہمہ فیاض کو بخیل مت سمجھو مردہ ہردی قابل حسین کام نہیں غالب آئین غوثی سب سے دیکھتے ہیں دنیا میں حیرا مسلک سید پرستی ہے سید احمد خان عارف جنگ کو خدا ان کی سب دلی مرادیں پوری فرمائے

اس نظم میں غالب نے تاریہتی و دعائی جہاز اور سیلے کا ذکر کیا ہے۔ ریل کے سفر کے بارے میں

چند حوالے غلطیاً غالب میں ملتے ہیں۔ ماسوزوں نہ ہوگا اگر وہ اقتباسات یہاں درج کر دیے جائیں۔

علاء الدین علانی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

”کل شام کو خیر و مکرّم جناب آغا محمد حسین صاحب شیرازی سواری ریل ماخذ دولت دکن کو آنا کا

آئے فقیر کے بکس میں تحریف لائے۔ نواب میر قلام بالا خان کے نام ایک مکتوب میں رقم طراز ہیں

”ترغہ تھکوں نے سیر کی بہار دکھلائی آپ سواری ریل روانہ ہونے کی لہر دل میں آئی پانچ

کانوں سے بہرا ضعف ہمارے ضعف دماغ ضعف دل ضعف معدہ ان سب نقصانوں پر ضعف طالع کیونکہ

قصہ کر دیں۔ چار شبانہ ہر روز قفس میں کسی طرح بسر کروں۔“

نواب صاحب نے انہیں سورت آنے کی دعوت دی تھی جبکہ غالب طویل سفر کی صحتوں سے گھبرا

رہے تھے۔^{9۸}

۱۲ مئی ۱۸۵۷ء کو دہلی کی شورش کی خبر بجنور پہنچی تو سید احمد نے وہاں موجود یورپین مردوزن کو مشتعل

لہو کے گھبرے سے نکال کر دہلی پہنچایا۔ یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ جب انگریزوں نے دہلی فتح کی تو

سرکاری فوجیوں نے ان کا گھر لوٹ لیا۔ ان کے ایک ماسوں اور ایک ماسوں دلو بھائی سرکاری سپاہیوں کے

ہاتھوں مارے گئے۔ باقی خاندان جان بچا کر سلطان نظام الدین چلا گیا۔ دو دن بعد خدشات کے سلسلے میں

سرکار نے ایک ہزار روپے مالیت کی قطع دی اور دو سو روپے ماہوار پالنے کےلئے کلشن مقرر کیا۔ ہوا تو اہل سرکار کو

باقیوں کی ضبط شدہ جائیدادیں دی جاتی تھیں۔ سید کو ایسی ہی ایک جائیداد کی پیشکش ہوئی لیکن انہوں نے قبول

کرنے سے انکار کر دیا۔¹⁰

۱۸۵۹ء میں انہوں نے رسالہ اسباب بغاوت ہند لکھا جس میں مسلمانوں کی صفائی پیش کرنے کی

کوشش کی گئی اور ثابت کیا گیا کہ یہ کوئی منظم بغاوت یا انتخاب نہ تھا۔ محض سپاہیوں کی عدم عدولتی تھی اور وہ بھی بہ

سبب جہالت اور مذہبی توہمات کے۔ کتاب ترجمہ ہو کر گورنر جنرل کی کونسل کے سامنے پیش ہوئی تو فارمن

نکھر لڑی نے اسے باغیانہ قرار دیا جبکہ گورنر جنرل اور دیگر سربراہان نے اسے سرکاری خیر خواہی پر مبنی قرار دیا۔¹¹

۱۸۶۰ء میں سید احمد خان نے لائل پور آف انڈیا کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا جس میں

انگریز کے خیر خواہ اور خدمت گزار مسلمانوں کے حالات ان کی خدمات اور سرکاری طرف سے عطا کردہ انعام و

اکرام کی تفصیل چمکی تھی۔ اس کے محض تین نمبر ہی شائع ہو پائے اور مسلمان معززین کی عدم دلچسپی کی وجہ سے

یہ سلسلہ جلد ہی بند ہو گیا جس کا انہیں بہت دکھ ہوا۔ انہوں نے ضیاء الدین برنی کی تاریخ فیروز شاہی کو بھی تصحیح کر کے

شائع کیا۔

خود کے بعد انہوں نے مسلمانوں اور انگریزوں یعنی عیسائیوں کو ایک دوسرے کے

قریب لانے کے سلسلے میں تعمیر چینمیں الکلام لکھتے ہوئے چھاپے کا آغاز کیا۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ اصول

اسلام اور اصول اہل کتاب میں مکڑ حد تک مطابقت ثابت کی جائے اور جہاں اختلاف ہو وہاں اختلاف کی وجہ بیان کی جائے۔ اہل اسلام کی طرف سے اہل کتاب کو جو بدگمانیاں ہیں انہیں دور کیا جائے۔ نیز اہل اسلام جو موجودہ داخلی کوتاہی شہدہ سمجھتے ہیں۔ ان کی اس غلط فہمی کا بھی ازالہ کیا جائے تاہم علماء کی شدید مخالفت اور مالی مشکلات کی بنا پر یہ کام تکمیل چھوڑنا پڑا¹³۔

مئی ۱۸۶۰ء میں ان کا جاولہ غازی آباد ہوا وہاں انہوں نے سائنٹفک سوسائٹی قائم کی اور علمی و تاریخی کتابوں کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کا کام شروع کیا۔ انہوں نے غازی آباد میں ایک سکول بھی قائم کیا۔

۱۸۶۳ء میں وہ تھریل ہو کر علی گڑھ آئے اور وہاں سائنٹفک سوسائٹی قائم کی۔

۱۸۶۶ء میں علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ اخبار جاری کیا اور برٹش انڈین ایسوسی ایشن کی بنیاد رکھی۔

۱۸۷۳ء میں علی گڑھ مدرسہ قائم کیا جو بعد ازاں کالج اور آخر کار یونیورسٹی بنا۔ رسالہ تہذیب

الاطلاق جاری کیا۔۔۔۔۔ ۱۸۷۶ء کو انتقال ہوا¹⁴۔

سر سید نے غالب کی جس تقریر کو کھڑکا تیر کچھ کر شائع نہیں کیا تھا سائنٹفک سوسائٹیاں بنانے میں شاید اس کا بھی کوئی اثر رہا ہو۔ سر سید اس حوالے سے غالب سے رنجیدہ خاطر رہے لیکن ۱۸۶۰ء میں جب غالب دہلی رام پور نوآبادی کلب علی جان کی مصدقہ نشانی کی تقریرات سے دہلی پر مراد آباد سے گزرے تو سر سید احمد خان نے جو وہاں صدر الصدور تھے دروازہ شہر پر غالب کا استقبال کیا اور انہیں مہمان بنا کر اپنے گھر لے گئے اور یوں دونوں کی باہمی رنجش کا خاتمہ ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ غالب کی نشن اور دربار کی بحالی میں بھی سر سید احمد خان کی کوششوں کا دخل تھا¹⁵۔

حوالہ جات

1- خطوط، نام سر سید مرتبہ محمد اسماعیل پانی پتی۔ انجمن ترقی ادب لاہور۔

2-3- یادگار غالب از الطاف حسین حالی۔

4-8۲۴ حیات جاوید از الطاف حسین حالی۔

9- از کلیات فارسی۔ غالب ترجمہ: پروفیسر غلام رشید رضوی۔

۸۹-9 خطوط غالب غلام رسول میر۔

10-13 حیات جاوید از الطاف حسین حالی۔

14- یادگار غالب از حالی امرزاد غالب از علیا پری گارہ۔

مشاہیر دلی مشرف بہ تلمذ غالب

نواب ضیاء الدین احمد خان بہادر نیر بخشاں

”ضیاء الدین احمد خان“ نام ہے ہندی میں دہلی میں تخلص ”فاری“ میں نیر تخلص ہانا نیر بخشاں ضیاء الدین احمد خان“

غالب کا نام ہر گوپال تخلص: ۹ ستمبر ۱۸۶۱ء

والی فیروز پور جمر کہ لوہا پور فتح الدولہ نواب احمد بخش خان بہادر کے فرزند تھے۔ فیروز پور جمر کہ میں اکتوبر ۱۸۶۱ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۶۸ء میں نقل مکانی کر کے مستقل دہلی میں مقیم ہو گئے۔ خزانہ ریاست سے انھار و جزا روپے سالانہ تحفہ ملتا تھا۔

مفتی صدر الدین آزاد مولانا فضل حق خیر آبادی اور غالب سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ فقہ فقیر حدیث، منطق، فلسفہ اور زبان فارسی کے علاوہ تاریخ، جغرافیہ، ہیئت اور نجوم میں بھی دستگاہ رکھتے تھے۔ دہلی میں بہت شاعر اور ادبی ذخیرہ کتب تھا جو خود کے دوران قاریت ہوا۔ ایلیٹ نے انہی سے نایاب علمی نسخے لے کر اپنی مشہور تاریخ مرتب کی۔ غالب نے انہیں اپنا خلیفہ اول قرار دیا تھا۔

کلیات فارسی میں ایک قصیدہ ان کی مدح میں ہے۔ فرماتے ہیں:

منم خزینہ راز و در خزینہ راز
ضیائے دین محمد کہیں برابر من
بہ دین و دانش و دولت یکاے آفاق
بہ عمر کہتر و از مدے رتبہ بہتر من

۱۸۸۵ء میں انتقال ہوا اور حضرت خواجہ بخشیار کا کی کی درگاہ کے اساطے میں دفن ہوئے۔ زیادہ تر

کلام فارسی میں ہے۔^۳ چند اشعار زبان اردو بلور موسوم کلام ہیں:

فلک مگر نہ تھا بار اٹھانے کے قابل
تو کیا تھے ہمیں آڑانے کے قابل
شاید بہار آئی کہ جو مجھ جنوں
بھر کر رہا ہے جامہ و دستار مار مار
اسے دل شاو الگ ہو مرے سینے میں نہ رہ
تجھ کو مظلوم عزا خانے کے آداب نہیں

نواب علاؤ الدین احمد خان بہادر عطاء کی والی کو ہارو

مجھ سے غالب یہ عطاء نے غزل کھسائی
ایک بیدار مگر رنج فرا اور سکی^۴

عطاء بیگم غالب کے چچا اور بھائی نواب امین الدین احمد خان کے فرزند اور ضیاء الدین احمد خان نیر خشاں کے بھتیجے تھے۔ ۲۵ اپریل ۱۸۳۳ء کو دلی میں پیدا ہوئے غالب کی زیر نگرانی تعلیم حاصل کی مرزا قادی اور ترکی میں عالمانہ استعداد رکھتے تھے ترکی میں ایک لٹ بھی مرتب کی۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے غالب نے انہیں اپنا خلیفہ کا فی قرار دیا تھا۔ عطاء کی کہنے ہیں:

عطاء چہ ہر جائے غالب نشست
ہرق ہر دریدہ و قلم در کشت

۳۶ برس کی عمر میں والد کی زندگی میں ریاست لوہاروی گدی پر بٹھائے گئے۔^۵ لوہارو میں نذر الخالص کے نام سے چھاپ خانہ قائم کیا، طبعی اور ادبی کتابیں شائع کیں۔ امیر الاخبار کے نام سے ایک چند روزہ اخبار بھی شائع کیا کرتے تھے۔ شطرنج کے لا جواب کھلاڑی تھے۔ یکم نومبر ۱۸۶۶ء کو دلی میں شطرنج سوسائٹی قائم کی گئی جس کے ارکان میں کئی انگریز حکام بھی شامل تھے۔ اس سوسائٹی کے چلنے عطاء کے مکان واقع ملی ماراں میں ہوا کرتے تھے۔^۶ عطاء کی چند اشعار مومنہ کلام کے طور پر پیش خدمت ہیں:

اللہ دی ہے ثباتی مرغا پسند
بھٹتا ہے یہ چراغِ چمک کی ہوا کے ساتھ
مشت خاکستر ہے وہ بلبل کہ گلشن میں نہیں
دارغ ہے وہ دل کہ خوں کے ساتھ دامن میں نہیں
جس جا کہ تھا تراہ بلبل ننگہ خیر
اس جا پہ آج دل حصن آوازِ دارغ ہے

دنیا کی خیر و خوبی میں لیل و نهار کو
کب جانتی ہے غلطی کہ کیوں کر گزر گئے
مولانا غلام رسول مہر نے اپنے مرتبہ خطوط غالب میں غلامی کے نام غالب کے چھپن خطوط دیے
ہیں۔ ۱۹۸۳ء میں اشکال ہوا^۷۔

میرزا شہاب الدین احمد خان ثاقب دہلوی

اے روشنی دیدہ شہاب الدین خان
کتنا ہے تیرا کس طرح سے رمضان
ہوتی ہے تراویح سے فرصت کب تک
سننے ہو تراویح میں کتنا قرآن

(غالب)^۸

ضیاء الدین احمد خان کے بڑے صاحبزادے تھے۔ ۱۸۶۰ء میں پیدا ہوئے۔ تعلیم و تربیت والد کی
ذمہ داری ہوئی۔ ثاقب شخص غالب نے رکھا۔ دلی کے آخری جمہوریت مقرر ہوئے۔ ۱۹ اپریل ۱۸۶۹ء کو
صرف ۲۹ سال کی عمر میں وفات پائی۔ چار صاحبزادے تھے۔ چاروں شاعر ہوئے۔
شجاع الدین احمد خان، تاباں بہاء الدین احمد خان، طلبہ سراج الدین احمد خان، ساکن اور ممتاز
الدین احمد خان، ایک^۹۔ صوفیہ کلام:

گھر بیاباں میں بنایا نہیں ہم نے لیکن
جس کو گھر کہے ہوئے تھے وہ بیاباں نکلا
ہم سید پر کے کھڑے ہیں
وہ شوق سے منہ آرائیں
رہیں گے گرفتار صورت پرستی
اگر حسن معنی سے غافل ہوئے ہم
ہمیں ذوق صرا نوردی ہے ثاقب
نہ سمجھو کے جو بڑے منزل ہوئے ہیں
دعش سے کہ کہا ہو تو ایماں نہ ہو نصیب
کافر جوں کو کہتے ہیں عشاق بیاد سے

میرزا فتح الملک بہادر غلام فخر الدین روضہ

بہادر شاہ ظفر کے فرزند میرزا افتخار ۱۸۱۲ء میں پیدا ہوئے۔ ولی عہد میرزا ادا راجت کے انتقال کے بعد ولی عہد مقرر ہوئے۔ بادشاہ کی باہنسی ملکہ زینت محل بیگم اپنے کسمن بیٹے شہزادہ جواں بہت کو ولی عہد بنانا چاہتی تھیں۔ بادشاہ انہی کے ہم نوا تھے۔ درخواست بائیاں ہوئیں۔ سازشیں ہوئیں لیکن تلخ برطانوی کابینہ میرزا افتخار کے حق میں تھا۔ ۱۸۵۲ء میں ان کی ولی عہدی کا باقاعدہ اعلان ہوا۔ ۱۰ جولائی ۱۸۵۶ء کو ان کا ایک ہیضہ میں مبتلا ہو کر انتقال کیا۔ اس شب کا اکتھار کیا جا تا رہا ہے کہ بیگم زینت محل نے انہیں زہر دلوایا تھا۔

روضہ نگار کرتے تھے استاد ذوق سے اصلاح لیتے تھے۔ ان کے انتقال کے بعد غالب کے شاگرد ہوئے۔ استاد اکرم کے لیے چار سو روپے سالانہ وظیفہ مقرر کیا۔ میرزا ذوق العابدین عارف کے صاحبزادگان حسین علی خان اور باقر علی خان کے لیے ہر ماہ دس روپے پھلوں کے لیے دیتے تھے۔ غالب نے ان کی مداح میں تین قصائد لکھے^{۱۰}۔ حبیب اللہ کا کہ نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

”کسم بخود نہ پذیرفت و دیہ بازم بود
چہ نامہ کہ بود نا نوشتہ عنوانش

یہ شعر میرا ہے ولی عہد خسرو علی میرزا فتح الملک بہادر مغفور کے قصیدے کا“ ۱۸۶۶ء۔

میرزا افتخار کی ایک اہلیہ تھیں وزیر بیگم عرف چھوٹی بیگم۔ ان کے بطن سے ایک صاحبزادہ خورشید عالم استولد ہوئے جو شاعر ہوئے۔ خورشید نگار کرتے تھے۔ اس سے قبل وزیر بیگم کے کم از کم تین نکاح ہو چکے تھے۔ سب سے پہلے ایک انگریز مسٹر مارش سے جس سے ایک لڑکا امیر مرزا اور لڑکی سکا جان عرف بادشاہ بیگم ہوئیں۔ بادشاہ بیگم شاعرہ ہوئیں۔ اچھی نگار کرتی تھیں۔ اس کے بعد وزیر بیگم نواب شمس الدین خان کے عقد میں آئیں۔ جس سے ایک صاحبزادے میرزا خان پیدا ہوئے۔ جو نواب میرزا خان داغ کے نام سے شہرت دوام کے حامل ہوئے۔ نواب شمس الدین خان کی چھائی کے بعد وہ محترمہ مولوی آغا محمد تراب علی کے حوالہ عقد میں آئیں۔ جن سے ایک شاعر فرزند شاہ محمد شاکر پیدا ہوئے۔ ام اشعراء کا تذکرہ ضحیٰ آگیا جو خانی از دلچسپی نہ ہوگا۔ میرزا خان قلم ”معلیٰ“ میں میرزا افتخار الدین کے گھر میں پلے پڑے^{۱۲}

میرزا افتخار کے چھ اشعار ملاحظہ فرمائیں جن میں ان کے استاد کا رنگ جھلکتا نظر آتا ہے:

سب کچھ آساں ہے تجھے گردشِ دوداں کرنا
ایک مشکل مری مشکل کا ہے آساں کرنا
یاں یہ حالت کہ دم لیوں ہے
واں یہ غفلت کہ کچھ خیال نہیں

تم آؤ یا غمِ فرقت میں یہ کم بخت دم نکلے
 تمنا کوئی تو دل کی تارے اے ستم نکلے
 مانا کہ نہ دل لے کے تو مجھ سے وفا کرتا
 پر دل کی تسلی کو وعدہ تو کیا ہوتا
 وہ تو مٹا پر اے دل کم ظرف تجھ کو ملنے کا حوصلہ نہ ہوا
 تم رہو اور مجمعِ اغیار میرا کیا ہے ہوا ہوا نہ ہوا
 پھر تمہارے ستم اٹھانے کو رحرا اچھا ہوا میرا نہ ہوا¹³

شہزادہ حفصہ سلطان

حفصہ سلطان کو رکھے خالق اکبر سرسبز
 شاہ کے باغ میں یہ تازہ نہال اچھا ہے

غالب¹⁴

یہ شعر بہادر شاہ ظفر کے فرزند شہزادہ حفصہ سلطان کی ولادت (۱۸۲۱ء) پر غالب نے لکھا تھا۔ ۲۳ ستمبر ۱۸۵۷ء کو ۲۶ سال کی عمر میں دہلی کے مقبرے سے گرفتار ہوئے اور اپنے بڑے بھائی مرزا غلام اور بیٹے مرزا ابوبکر کے ہمراہ بنگلہ دیش کی گولی کا نشانہ بنے¹⁵۔

اردو میں شعر کہتے تھے غالب سے اصلاح لی۔ دو اشعار پیش خدمت ہیں:
 مانا کہ ستم تم نہیں کرتے ہو کسی پر
 فیروں پہ کرم ہو یہ ستم بھی نہیں قبول
 نہ کہہ سکتے ہیں کچھ اپنی نہ سن سکتے ہیں کچھ تیری
 ہمیں اس وقت میں اے بے وفا دیکھا تو کیا دیکھا

نواب سید محمد ذکریا خان دہلوی

”سید محمد ذکریا خان نسب میں سید امیر زادہ عالی دروہاں ان کے بزرگ وزارت کا منصب پا چکے
 ہیں جاگیر اب تک تھی پھر بہ عرض جاگیر پیش منقر ہوئی مسجد ایہ شخص بہ قوت خود نیک اور صاحب علم اور متواضع
 اور دانشمند اور نیک طبیعت اور نگین طبع۔ شعر کہتے ہیں اور خوب کہتے ہیں اس فن میں میرے شاگرد شہید ہیں۔“
 (غالب)¹⁶

۱۸۳۹ء میں دلی میں پیدا ہوئے فارسی غالب سے عربی اور منطق صہبائی سے اور ریاضی کی تعلیم

چندت نام کشتی بمل سے حاصل کی۔ ۱۸۵۷ء کے بعد محکمہ تعلیم میں ملازم ہوئے "ترقی کر کے لڑائی اسکول مدارس بنے" مولوی شمس اللہ شمسٹ اسپر بدایونی اور سید احمد دہلوی مولف "طرہ جگ آصفیہ" ان کے شاگردوں میں سے تھے^{۱۷}۔ ذکی کھنکس کرتے تھے۔ خود کلام ملاحظہ کریں:

دلی سبز دلی دشت دلی دہرائی ہے
اور کیا دشت میں ہو گا جو مرے گھر میں نہیں
ہے تکلف عشق ہے فارت گر ایساں اگر
حضرت تاج کو کیا یہ بھی اگر کرتے ہیں ہم
ذکی مقام سعادت سمجھ کے بیٹھ رہو
حرم کعبہ نہیں ہے وہ مغاں نہ کسی
وہ سادگی سے تعافل کو باز کہتے ہیں
مگر سکھاتی ہے شوخی کہ احساں کہتے

غشی جواہر سنگھ جوہر دہلوی

"برخودار کامگار سعادت و اقبال نشان غشی جواہر سنگھ جوہر کلب گڑھ کی تحصیلداری مبارک ہو ٹھہری
سے نوح آئے نوح سے پلب گڑھ کتاب پلب گڑھ سے دلی آئے گن شام اللہ۔" ۲ فروری ۱۸۶۳ء^{۱۸}
غالب کے عزیز دوست رائے بھگل کے فرزند تھے فارسی میں شعر کہتے تھے انگریزی عملداری میں
تخصیلا رہتے۔ قاضی برہان اور اردو کے معلیٰ کی تاریخیں انہوں نے لکھیں:

چ	اردو کے	معلیٰ	گشت	تالیف
۱۸۶۱ء	یک	جہاں	گردید	طالب
۶۷	سال	مسجانی		طبعش
کچھ	جوہر	تھے	اردو کے	غالب

^{۱۹} ۱۸۶۹ء

غالب اپنے دو شاگردوں احمد حسین میکش اور جواہر سنگھ جوہر پر فخر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

تا میکش و جوہر دو سخور داریم
شان دیگر و شوکت دیگر داریم
و میکدہ عظیم کہ میکش از ماست
و معرکہ حلیم کہ جوہر داریم^{۲۰}

جب تک ہمارے پاس دو خوشنور میکش اور جوہر ہیں ہماری شان و شوکت ہی کچھ اور ہے۔ ہم بھر مغاں ہیں کہ میکش ہم سے ہے اور میدان کارزار میں تموار ہیں کہ جوہر رکھتے ہیں۔

غالب ایک خط میں جوہر کوستانی رہنمی لکھی بھجوانے کی فرمائش کرتے ہیں:

”تمہیں یاد ہو گا میرے پاس ایک قرائقی ٹوپی تھی اسے کپڑا کٹا کر کپا لب مجھے ٹوپی نہیں رہتی لکھی چاہئے جو چٹا اور دستار میں لٹتی ہے جسے وہاں کے معززین سر پر پہنتے ہیں۔ لکھی کا رنگ شرمیل اور حاشیہ سرمہ نہ ہو اور اس پر سونے چاندی کے تاروں سے بنے ہوئے نقش و نگار بھی نہ ہوں۔ ایسی لکھی اور کار ہے جو سیاح و سیر طے اور پیلے ریشم سے بنی ہوئی ہو۔۔۔۔۔ اسے خرید کر ڈاک کے ذریعے مجھے بھیج دو اور قیمت بھی لکھو بھیجو۔ یہ میری فرمائش ہے اس لیے اس کی قیمت تمہیں مجھ سے لینا ہوگی بیچ آہنگ۔“²¹

میر مہدی حسین مجروح

”کومیلاں اسید ڈاؤن آؤ اور دلی کے عاشق و معادہ ڈاؤ ہے ہوئے اور دو بازار کے رہنے والے نہ دلی میں مرد آؤ زم نہ آؤ لکھ میں حیا و شرم نظام الدین مضمون کہاں ذوق کہاں مومن کہاں ایک آؤ درد سو غاسوساں دوسرا غالب وہ ہے خود و مدوش نہ دشواری رہی نہ سخن دانی کس برستے پر حق پانی ہائے دلی دائے دلی بھاڑ میں جا کے دلی۔“²²

عاقبت ۱۸۳۳ء میں دلی میں پیدا ہوئے والد کا نام میر حسین دگڑ تھا۔ غالب کے عزیز ترین شاگردوں میں سے تھے۔ ۱۸۵۷ء کی دہادگیر میں پانی پت چلے گئے اور مولانا حالی کے آبائی محلے انصار یوں کے محلے میں قیام پذیر رہے۔ بعد ازاں دلی لوٹ آئے لیکن تلاش معاش میں الور جانا پڑا مہاراجہ شیوہیو حسیان سنگھ نے قدر دانی کی نائب تحصیلدار بنے پھر تحصیلدار ہوئے۔ ۱۸۷۳ء میں مہاراجہ کی معزوری کے بعد جے پور چلے گئے وہاں نائب کٹوال رہے۔ ۱۸۸۰ء میں راجا رام سنگھ کی وفات کے بعد رام پور چلے گئے۔ خواب حامد علی خان بہادر نے عزت افزائی اور پذیرائی کی۔ ۱۵ جنوری ۱۹۰۳ء کو انتقال ہوا وفات سے پہلے چند بار مغربی انجی کہا دی ان کی تاریخ وفات ہے۔ غالب کی وفات پر سب سے پہلے مضمون میر مہدی ہی نے لکھا جو ۷ افروری ۱۸۶۹ء کے اکمل الاخبار میں دلکھ عرفی و فخر غالب مرد کے زیر عنوان چھپا۔ غالب کی لوح حرار پر کندہ قطع تاریخ وفات میر مہدی ہی کا کہا ہوا ہے:

کل میں غم و اندوہ میں با خاطر محروں
تھا تربت او ستاؤ پہ بیٹھا ہوا غم ناک
دیکھا جو مجھے لھر میں تاریخ کی مجروح
باق نے کہا سچ معانی ہے تہہ خاک²³

لن کا ایمان مظہر معانی کے نام سے شائع ہوا۔ دو مٹری رسالے ”انوار الابدان“ آخضریت کے مجلات پر اور جدیدۃ الآخر سیرت نبویؐ اور سیرت آخر پر چھپے۔²⁴

میر احمد حسین میکش دہلوی

”میکش جمن میں ہے باتیں بتاتا پھرتا ہے سلطان جی میں قہاب شہر میں آ گیا ہے دو تین بار میرے پاس بھی آیا کچھ سات دن سے نہیں آیا کتنا قہابی بی اور لا کے کو بہرام پور صردار علی کے پاس بھیج دیا ہے خود یہاں لوٹ کی کتابیں خریدتا پھرتا ہے۔“

۷ فروری ۱۸۵۸ء نظام میر مہدی²⁵

دلی کے سادات میں سے تھے والد کا نام میر کرار حسین قہا صہبائی کے شاگرد تھے پھر غالب سے اصلاح لینے لگے فارسی میں شعر کہتے تھے ایک شعر ہے:

گلشن دی کہ با با فچی خرمایاں سوئے باغ

گفت میکش بودہ ہاشم کاس گر کار من است

غور کے بعد گرفتار ہوئے اور پھانسی پائی²⁶۔

”احمد حسین کا حال یہ کہ تم کو معلوم ہے مٹھی ہوا کو پاس نام کا آ دی شہر میں قہابی نہیں۔“²⁷

خواجہ میرزا قمر الدین خان راقم دہلوی

غالب کی ایک اہم جاتی ناپسندیدہ شخصیت خواجہ حاجی جنہیں نواب احمد علی خان نے غالب کے بچا نصر اللہ بیگ خان کے وارثوں میں شامل کر دیا تھا اور غالب اس زیادتی کے خلاف ٹکٹے ٹکٹے جا کر مقدمے لڑتے رہے اور لندن تک۔ در خواہش ارسال کیوں وہی خواجہ حاجی راقم دہلوی کے دادا تھے غالب انہیں اپنے دادا مرزا قوکان بیگ کا سائیکس بتاتے تھے خواجہ حاجی کے ایک صاحبزادے تھے خواجہ بدر الدین عرف خواجہ امان انہوں نے ”بوستان خیال“ کا اردو میں ترجمہ کیا اس کی ایک جلد پر جو ”حدائق الانظار“ کے نام سے چھپی غالب نے دیا چھپر کر کیا اور خواجہ امان کو اپنا جتہا بتایا۔

”میرا درازہ سعادت تو امان خواجہ بدر الدین خان عرف خواجہ امان کو وہ ایک جوان شیریں زبان تیز ہوش ہے اور ہر فن کے کمال کی تفصیل میں بخوبی کوش و سخت کوش ہے ستار کا جو طویل ہوا ایسا بھایا کہ میاں تان سمن کو انگلیوں پر چھاپا مصوری کی طرف جو طبیعت آئی وہ تصویر کھینچی کہ اس کو دیکھ کر مانی دہنرا کو حیرت آئی اس اقبال آثار کا یہ ارادہ ہوا کہ معزز نام کی فارسی شعر کے اردو کرنے پر آمادہ ہوا۔“ (دیا چھپر حدائق الانظار)²⁸

راقم خواجہ امان کے فرزند تھے۔ ۱۸۳۶ء میں دہلی میں پیدا ہوئے سولہ برس کی عمر میں قلمدستی میں

ملازم ہو گئے بہادر شاہ ظفر سے حیرانمیزی تھی۔ دلی مہد مرزا غزوہ کے دامن دولت سے وابستہ رہے۔ ۱۸۵۶ء میں ان کے انتقال کے بعد اور چلے گئے جہاں ان کے والد مہاراجہ شیوہ میاں سنگھ کے اثاثے رہے تھے۔ ۱۸۵۸ء میں جب راجپوتوں نے مسلمانوں کو ریاست سے نکالا تو واپس دلی آ گئے اور یوستان خیال کے ترہے اور اشاعت میں والد کا ہاتھ بٹاتے رہے۔ ان کی شاہی غالب کے بھانجے میرزا عاشور بیگ کی صاحبزادی سے ہوئی۔ بعد ازاں دلی چھوڑ کر بے پور چلے گئے وہیں مارچ ۱۹۱۰ء میں وفات پائی۔ ۱۹۰۱ء میں غزوہ کے نام سے کلیات شائع ہوئی۔ تفکرات پر سہ سیاہ کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ دیوان غالب کی ایک شرح بھی لکھی تھی جو شائع نہ ہو سکی۔²⁹

جہاں نذر میں نہ کر سکا میرا قصور تھا
تجھ کے چہ روکنا کس کا قصور تھا
دیکھ کر حضرت داعی کو خدا کی سوگند
کفر اچھا ہے ہم نے تو ایماں چھوڑا
صن زیا لاکھ نظروں سے چمپاتے جاگے
اور کھٹکا جائے گا بتنا چمپاتے جاگے
اس کے وعدے کی انتہا ہے نہ حد
مر اپنی کرے وفا کب تک
آ جاؤ بھرتے چلتے کبھی خم کدہ میں تم
آنکھوں سے ہم بھی دیکھ لیں آنا بہار کا
بائے راقم نہ رہے حضرت غالب سر پر
قدر فرزند کی ہوئی ہے پد کے ہوتے

نواب محمد علی خان بہادر رشتہ

نواب مصطفیٰ خان شیفتہ کے بڑے صاحبزادے ۱۸۴۳ء میں پیدا ہوئے تعلیم اپنے والد مطلق صدرا الدین آزادہ اور مولانا حالی سے حاصل کی۔ انگریزی میں عمدہ استعداد رکھتے تھے اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے غالب سے اصلاح لی۔

سرکار انگریزی کی طرف سے ضلع بلند شہر میں مجلس بنی اختیارات رکھتے تھے۔ ۱۸۹۰ء میں صوبہ جات حصہ کی طرف سے داسرائے کونسل کے ممبر نامزد ہوئے۔ ۱۸۹۵ء میں خان بہادر اور نواب کے خطابات ملے۔ ۲۰ مئی ۱۸۹۸ء کو وفات پائی³⁰ اور والد کے پہلو میں سلطان جی میں دفن ہوئے۔ ان کا یہ

یہ رنجِ بلند کا جس کو مل گیا
ہر دلی کے واسطے داوروں کہاں
فلکوں ہمارے سارے فلک ہی سہی مگر
لو تم ہی اب بتاؤ کہ کس کا تصور تھا
رجش کا گرچہ کوئی سبب درمیاں نہ تھا
لیکن وہ آپ صلح کریں یہ گماں نہ تھا
ہے دگرگوں ابتداء عشق میں رشتی کا حال
دم آتا ہے مجھے اس کی جہانی دیکھ کر

نواب محمد مصطفیٰ خان دہلوی شیفتہ و حسرتی

دشت و شیفتہ اب مرثہ کہیں شاید
مر گیا غالب آشتہ نوا کہتے ہیں

(غالب)

عظیم الدولہ سرفراز الملک نواب مرتضیٰ خان بہادر مظفر جنگ بخش کے فرزند تھے۔ مرتضیٰ خان
طوائفِ الملوکی کے دور میں مہاراجہ جسونت راؤ بک کے لشکر میں شامل ہوئے۔ لارڈ لیک اور بک کے
درمیان ان کی کوششوں سے صلح ہوئی۔ ۱۸۱۲ء میں لارڈ لیک نے ضلع کوڑا گڑھ میں تین لاکھ سالار کی جاگیر
تاجین حیات عطا کی۔ اگلے سال انہوں نے جاگیر آدھ ضلع میرٹھ اپنے فرزند محمد مصطفیٰ خان کے نام پر خرید
لیا۔ ان کی وفات کے بعد لارڈ لیک کی عطا کی ہوئی جاگیر بجن سرکار واپس ہو گئی لیکن خرید کردہ جاگیر
برقرار رہی۔ سرکار انگریزوں سے بیس ہزار روپے سالانہ تحفہ مصطفیٰ خان کو ملتا رہا۔ محمد مصطفیٰ خان ۱۸۰۵ء میں
دہلی میں پیدا ہوئے وہیں تعلیم حاصل کی فزل اور قادری میں کامل و شگوار تھی اور دو اور قادری کے ہاکمال شاعر
تھے۔ اردو میں شیفتہ اور قادری میں حسرتی تخلص کرتے تھے۔ جوانی میں دادو و ساغر سے شغف رہا غالب کی
طرح عرقِ گلاب میں ملا کر پیا کرتے تھے:

ما حسرتی ز شیفتہ غالب گرفتہ ایم

آ مینختن یہ دادو سانی گلاب را

ایک مطر بہ مسافرِ بخار سے شام سانی ہوئی وہ شاعر تھی نواکت تخلص کرتی تھی، یکہ مرثہ شیفتہ کے مگر

میں بھی رہی۔

جوانی میں ہی نائب ہو کر تصوف کی طرف مائل ہو گئے شاہ محمد اسحاق سے بیعت کی ان کے انتقال کے بعد شاہ نظام علی نقشبندی اور پھر شاہ عبدالغنی مجددی سے فطوش باطنی حاصل کیے ان سے سند خلافت حاصل کر کے خود صاحب اجازت ہوئے۔ ۱۸۳۹ء میں حج پر تشریف لے گئے حالات ستر ایک قاری ستر نامہ ”ترغیب السالک علی احسن السالک“ میں تحریر کیے۔

۱۸۵۷ء کی شورش کے دوران جہانگیر آباد کو غیر محفوظ جان کر خان پور میں جا مقیم ہوئے فضا کردوں نے جہانگیر آباد کوٹ لیا ان کا گھر اور کتب خانہ نذر آتش کر دیا گیا۔ راجپور کی فوج کی مدد سے جہانگیر آباد پر دوبارہ قبضہ حاصل کیا گیا۔ غدر کے بعد ان پر اس جرم میں مقدمہ قائم کیا گیا کہ وہ اپنی جاگیر غیر محفوظ جموں کر اعانت بھرانہ کے مرتکب ہوئے ہیں سات سال کی سزا ہوئی اکیل میں بری ہوئے اور جاگیر بھی واپس لے لی۔ ۲ فروری ۱۸۵۹ء کو غالب ایک خط میں پھر مجددی مہرورج کو لکھتے ہیں:

”نواب مصطفیٰ خاں بہ میرا دوست بریں کے قید ہو گئے تھے سوان کی تعمیر مصحف ہوئی اور ان کو رہائی ملی صرف رہائی کا حکم ملا ہے جہانگیر آباد کی زمینداری اور دی کی املاک اور بخش کے باب میں بنود چوکہ حکم نہیں ملا۔ چاروں رہا ہو کر میرے خاں ایک دوست کے مکان میں ٹھہرے ہیں میں بہ بھر داس خبر کے استماع کے لڑاک میں بیٹھ کر میرے خاں ان کو دیکھا چاروں وہاں رہا پھر ڈاک میں اپنے گھر آیا۔“^{۳۲}

شیخو اردو ریختہ میں مومن خان مومن کے شاگرد تھے۔ مومن کی وفات کے بعد ریختہ اور قاری دونوں غالب کو دکھاتے رہے۔ قید و بند کے دوران غالب کی داسے دے دے قید سے نکلنے اعانت کی جس کے اعتراف میں غالب کہتے ہیں:

مصطفیٰ خاں کہ دریں واقعہ غم خواہ من است

گر بھیرم چہ غم از مرگ عزاء دہ من است^{۳۳}

الطاف حسین حالی شیخو کے مصاحب تھے اور ان کے صاحبزادے نقشبند خان مجبور کے استاد ہیں خود شیخو کو اپنے استاد مانتے تھے۔

شیخو ایک بلند پایہ تذکرہ نگار اور نقاد بھی تھے۔ انہوں نے اردو شعراء کا تذکرہ زبان فارسی میں تحریر کیا جو نگارن بے خار کے نام سے ۱۸۳۷ء میں شائع ہوا۔^{۳۴} اسی کتاب کے حوالے سے غالب ایک خط میں شیخو کو لکھتے ہیں:

”تم نے تو ایک۔ گردہ کو اپنے دشمنات قلم سے حیات جاوداں عطا کی ہے اور ہر ایک کو نیکی سے جا دیا ہے مگر یہ کیا ہوا کہ دیوبند الف میں حضرت مفتی صد الدین آزاد کے اشعار پر دین دار کے ترجمہ سے تم نے اپنے قلم کو گھر لٹاں نہیں کیا۔“^{۳۵}

۱۸۵۷ء سے پہلے کا اکثر کلام ضائع ہو گیا نکلیات ۱۹۲۶ء میں شائع ہوا۔ غالب کے سال وفات ۱۸۶۹ء میں ۶۳ برس کی عمر میں دلی میں انتقال کیا۔^{۳۵}

مفتی صدر الدین آزاد نے لغات دلی میں شیفتہ کی قید و بند کے حوالے سے لکھا:

روز و حشت مجھے صحرا کی طرف لاتی ہے سر پہ اور جوشِ نہوں سنگ ہے اور چھاتی ہے
نکلے ہوتا ہے جگر چان پہ بن آتی ہے مصطفیٰ خاں کی ملاقات جو یاد آتی ہے

کیوں کہ آزدوہ نکل جائے نہ سودائی ہو

نقل اس طرح سے بے جرم جو سبھائی ہو^{۳۶}

مصطفیٰ خاں شیفتہ کے بے شمار شعائر و بان زو عام ہیں۔ چند نمونے کے اشعار ملاحظہ کریں:

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ

ہے آگ سی اک جو سینے کے اندر لگی ہوئی

اتنی نہ بڑھا پاکی دامن کی حکایت

دامن کو ذرا دیکھ ذرا بیوہ تھا دیکھ

اکلہار عشق اس سے نہ کرنا تھا شیفتہ

یہ کیا کیا کہ دوست کو دشمن بنا دیا

ہم غالب شہرت ہیں ہمیں شک سے کیا کام

بدنام مگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہو گا

وہ شیفتہ کہ دھوم ہے حضرت کے زہر کی

میں کیا کہوں کہ رات مجھے کس کے گھر لے

فسانے اپنی محبت کے چک ہیں پر کچھ کچھ

بڑھا بھی دیتے ہیں ہم زہب داسٹاں کے لیے

یاس سے آنکھ بھی جھپکی تو توقع سے کھلی

صبح تک دھند دھندار نے سونے نہ دیا

جو بات سے کہے میں ہے اک اک زبان پر

انہوں مدد سے میں ہے بالکل نہاں ہنوز

دل لگایا تو ہاتھوں کو کیا

بات جو اپنے ہی میں آئی کی

شیختہ وہ کہ جس نے ساری عمر
دیواری د پاسائی کی
آفرکار سے چست ہوا
شبن ہے اس کی کھریائی کی
اور

طوقان نوح لانے سے اے چٹم قاتمہ
وہ الٹ بھی بہت ہیں اگر کچھ اثر کریں²⁸

حوالہ جات

- 1-2 خلافتِ قالب از مالک رام
- 3- دیوانِ قالب از مرزا اسد اللہ خان قالب
- 4- خطوطِ قالب از نظام رسول مہر
- 5-6 خلافتِ قالب از مالک رام
- 7- خطوطِ قالب مرچہ نظام رسول مہر
- 8-9 خلافتِ قالب از مالک رام
- 10- خطوطِ قالب مرچہ نظام رسول مہر
- 11- خلافتِ قالب از مالک رام
- 12- دیوانِ قالب از مرزا اسد اللہ خان قالب
- 13- خلافتِ قالب مالک رام
- 14- خطوطِ قالب نظام رسول
- 15- خلافتِ قالب از مالک رام
- 16- خطوطِ قالب مرچہ نظام رسول مہر
- 17-18 خلافتِ قالب از مالک رام

ہوا القدر

سواد عبارتہ فی کہ را اجنباب بتطابق ابی سہدات خان علی
 و ملہوی در سال ہزار و دہ صد و ہشتاد و یک ہجرت بمحرم
 نظر و نظر کہ انہر صلا ح خدمت لادشان فرستادہ شدہ بود بقام
 خوشتر رقم فرستادہ اند و پایان آن مہر خورہ

یہ نگارہ کسی بادشاہ کا سینہ کسی ایسے کا نہیں کسی شیخ کا سینہ
 یہ نگارہ ہر سے ایک دوست روحانی کا ہوا و رفیق ہے دوست کا کہ
 مریض صلاح بن نظر دشمن کبھی ہر سبب غلی نہیں ارا نہیں فوج
 بھکا و نظر آیا ہر بے حیف و میل کون کا نظر میں نعمت خان عالمی
 طرز کا احیا کیا ہو کہ ہر ایک کچھ اوس سے بہتر دیا ہو قصاید میں انوری
 چہ بہاد شہا یا ہر گر طبیعت اچھا زور و کھایا ہو غزل میں شاہین گار
 شاعرانہ سوز و گداز منشی حبیب اللہ کا سنہ ہر دال یکہ لفظ طراز

آفرین آفرین صد آفرین صد آفرین

الحمد للہ

حبیب اللہ کا کہ مجموعہ نظم و نثر فارسی خاش و خاش پر غالب کا تحریر کردہ خوش لفظ

- 19- شیخ آجنگ از مرزا اسد اللہ خان قالب
- 20- خطوط قالب مرتبہ قلام رسول مہر
- 21-22 خلائے قالب از مالک رام
- 23- خطوط قالب مرتبہ قلام رسول مہر
- 24- خلائے قالب از مالک رام
- 25- خطوط قالب مرتبہ قلام رسول مہر
- 26- مجموعہ نثر قالب مرتبہ ظہیر الرحمن داؤدی
- 27- خلائے قالب از مالک رام
- 28-29 ایضاً
- 30- خطوط قالب قلام رسول مہر
- 31- سہد مجنن از مرزا اسد اللہ خان قالب
- 32- خلائے قالب از مالک رام
- 33- شیخ آجنگ از مرزا اسد اللہ خان قالب
- 34-35-36 خلائے قالب از مالک رام

دلی کے دو صوفی.... ایک تو نگر ایک قلندر

یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم دلی سمجھتے جو نہ بادہ طوار ہوتا

”اگر حیر! جنوں کامل ہو تو کاشی سے کاشان تک آدھے قدم کا فاصلہ ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ تو غریب کی طرح اپنے لباس اختیار کرے باہر آ اور قید جسم سے باہر نکل معرفت اور پہچان کا راستہ نہ چھوڑے۔۔۔ ہوں کوٹا کر دلی کی آگ سے اپنے فلس کو پگھلا دلی کو مصائب اور امتحانوں سے غول کر خود سے گھٹیاں نہیں نکلتیں جنوں اختیار کر جب تک میری سانس نہ اکھڑ جائے جاوہ پناہی ترک نہ کر شرارے کی طرح فنا کا سامنا کرتے ہوئے اللہ دامن جہاں اور آزاد ہو جا۔ الا کا دم بھرا اور لا کے آگے سپردِ زال دے۔ اللہ اللہ کہہ اور ماسوا کو پھونک ڈال۔“

(ادبِ معنوی چراغِ دہر) ^۱

دلی بائیس خواجہ کی چوکھٹ کہلاتی ہے، حضرت قطب الاقطاب، حضرت سلطان الاولیاء اور حضرت بوعلی قلندر کا شہر ہے۔۔۔ پانی پت دلی کا مضائقہ ہی تو ہے۔ میں یہاں محض دو صوفی حضرات کا ذکر کروں گا جو غالب کے زمانے میں دلی میں موجود تھے اور غالب سے ان کا ایک گہرا تعلق بھی تھا، ان میں سے ایک حضرت غلام نصیر الدین عرف کالے صاحب اور دوسرے حضرت شاہ غوث علی قلندر پانی پتی ہیں۔ غالب ”مہرِ نیمروز“ میں لکھتے ہیں:

”بیدار دلی صاحب بصیرت، پاک مرشد، بلند خاں، اذراہ سیر و سلوک کا جاوہر شناس اور جاوہ فقر و فنا کا راہ نما، شاہِ یقیں کے مشاہدہ جمال میں کھوسلا تا محمد نصیر الدین پر فقر کرتا ہوں کہ جو کوئی اس دہائیوں آخار و پھار کے سائے میں قدم رکھے تو قہقہہ کی بات نہیں اگر اس کا سایہ فردوس کے دروازے پر چڑ جائے۔ خلقت کی زبان پر اس کی تعریف اور پناہ کی آغوشیں اس سے روشن، منصور کے ترانے (انا الحق) کی اس کے حق بخشش تک رسائی نہیں اور باوجود کدھر سے (سبحانی یا عظیم شانی) کا اس لب حق گو کے ساتھ کیا کام۔ اگر دوسرے

سے نوش تھے تو (ہمارا) آقا کا نکاح نوش ہے، جو دوسروں کے لیے لم ہے اس کے لیے جام۔ سب میں موجود ہو کے سب سے الگ اور تمام خلق کے ساتھ خلق کی طرح موجود! جب سے میں ان کا مصائب ہوا ہوں آسمان والے میرے سائے میں ہیں اور جب سے اس کے دروازے کا خاک نقشیں ہوں فرشتے میرے مرتبے پر رشک کرتے ہیں روشن دل لوگوں کے دل و دین میں میرا مقام ہے اور باوجود انجم پہ میرے قدم ہیں۔“

(مہر شہروز)^۲

غلام نصیر الدین عرف کالے میاں، معروف صوفی بزرگ حضرت غلام الدین فخر عالم کے پوتے اور چاشمین تھے آپ حضرت خواجہ سلیمان تونسوی کے خلیفہ اور بہادر شاہ ظفر کے پیر تھے۔ ان کا مکان بھی قاسم جان میں تھا غالب کافی عرصہ ان کے مکان میں رہے۔ انہی کی تحریک پر بہادر شاہ ظفر نے غالب کی دہلی میں پذیرائی کی اور انہیں غلام الدین ویر اللہ الملک، خان بہادر اور غلام جنگ کے القاب و خطابات سے سرفراز کیا۔

بادشاہ سلامت نے لاکھوں روپے کے خرچ سے ایک شاندار حلی تعمیر کرا کر کالے صاحب کو نذر کی تھی، جس میں بارغ تھا، منبر، بیتی تھی اور متعدد شاندار مکانات تھے۔ بادشاہ اکثر و بیشتر ان کی زیارت کو تشریف لایا کرتے تھے۔^۳ غدر کے دوران یہ حلی لٹ گئی۔ جنگ غالب نے یہ صاحب کی حلی کو محفوظ جان کر اپنے زیورات یہاں رکھوائے تھے جو غارت ہوئے۔ بعد ازاں تمام چاندی و اداگریز حاکموں نے ضبط کر لی۔ کالے صاحب کے فرزند میاں غلام نظام الدین کی شادی پر بھی شاہ ظفر نے ہزاروں روپے خرچ کیے۔^۴

سیدنا صریح فراق دہلوی لکھتے ہیں:

”حضرت میاں کالے صاحب بھی لال قلعہ جایا کرتے تھے اور بادشاہ سلامت بھی حضرت کے دولت خانے پر حاضر ہوا کرتے تھے۔ ایک بار بادشاہ سلامت کچھ حضرت سے رنجیدہ ہو گئے، حضرت کو تو کیا غرض پڑی تھی جو لال قلعہ میں جاتے، مگر بادشاہ سلامت بھی اپنی بادشاہت کے گمنام میں حضرت کے سلام کے لیے حضرت کی حلی میں کئی دن تک حاضر نہ ہوئے۔ آخر بادشاہ سلامت کو اللہ نے بھجودی اور وہ یہ کہجے کہ مجھ سے غلطی ہوئی جو میں یہ ویرانہ کی خدمت میں حاضر نہ ہوا، مگر اب چلنا چاہئے خود بدولت ہاتھی پر سوار ہوئے، حکیم احسن اللہ صاحب وزیر کو ساتھ لیا۔ جب حضرت کے دروازے پر پہنچے تو ہاتھی پر سے اترے۔ حکیم صاحب سے کہا کہ دو مال سے میرے ہاتھ باندھ دیجئے۔ اسنے میں حضرت کے صاحبزادے میاں غلام نظام الدین صاحب آگئے، ان کی عمر اس وقت پانچ چھ برس سے زیادہ نہ تھی۔ بادشاہ سلامت کو کچھ کہہ کر کمر لے کر فرمانے لگے ہمارے اہاجان کے پاس اٹنے والوں والے (یعنی سکھ) آئے تھے، نازی اشرافاں دے گئے ہیں، کوٹھڑی میں ڈھیر لگ رہا ہے۔ بادشاہ سلامت اس بات کو سن کر سن ہو گئے۔ اطلاع کرائی کہ بہادر حاضر ہے، حکم ہوا تو روبرو حاضر ہو، جواب ملا شوق سے تشریف لائیں، جب بادشاہ میاں صاحب کے سامنے دو مال سے ہاتھ بندھے پہنچے تو کہا:

بر در آمد بندہ بگر بخت آمدے خود بھیاں رخت
اور دھارے بار بار کردہ نے لگے۔ میاں کالے صاحب نے اٹھ کر بادشاہ سلامت کے ہاتھ کھول
دیے اور لگے سے لگایا۔

بادشاہ سلامت: حضور اپنے بڑوں کا صدق اس کلام کی خطا معاف کیجئے!

میاں کالے صاحب: میں نے تمہاری خطا معاف کی اور میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ میرے اور
تمہارے گناہوں کو بخش دے۔ اب ظفر تم نے جو یہ خیال پکایا تھا کہ کلام نصیر الدین کے ہاں بچے لال قلعہ سے
پلٹے ہیں یہ تمہارے دماغ کا قصور تھا تمہیں یہ بعید نہیں معلوم جب میں نے تونسہ شریف حاضر ہو کر شاہ سلیمان
صاحب کے ہاتھ پر بیعت کی تو حضرت نے فرمایا: دیکھو احم بات ضرورت سے زیادہ نہ کرو۔ میں نے عرض کی:
بہت خوب۔ اس دن سے میں برائے نام بودا ہوں نہیں اشرافوں ہی سے کام لیتا ہوں! پھر ارشاد کیا کہ
آکھیں بندہ کرو۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کیں تو دیکھا کہ میں ایسی زمین پر ہوں جو سونے کی بنی ہوئی ہے اور
شاہ سلیمان صاحب کے ہاتھ میں چاندی کا کھربا ہے وہ کھربا آپ نے میرے ہاتھ میں دے کر فرمایا: سونے
کی جس قدر ضرورت اس زمین میں سے نکود لیتا اور بیچ کر یا کھڑکی کے آگے ہاتھ پھیلاتا۔ وہ دن ہے
اور آج کا دن ہے اس زمین میں سے سونا نکودتا ہوں اور پتھر سے اڑاتا ہوں۔ اس انوار میں جو تم نہیں آئے
کسی نے مجھے چاندی کا روپیہ نہیں دیا جس نے دی اشرافی سونے کی دی۔ ایک فوج کی فوج سسکوں کی آئی اور
ڈھیر ساری اشرافیاں دے گئی۔ یہ فرما کر میاں نے نوکر کو اشارہ کیا: اس نے کوٹھڑی کا دروازہ چو پٹ کھول دیا
اور بادشاہ سلامت نے دیکھا کہ کوٹھڑی اشرافیوں سے بڑی جنگل گاری ہے۔ بادشاہ سلامت نے یہ تماشا دیکھ کر
اپنے ہی میں کہا: چھوٹے میاں نے ڈیوڑھی پر کچ فرمایا۔ فراق صاحب ہی گھیسے ہیں کہ غدر میں جب میاں
کالے صاحب کی حویلی لٹی ہے تو لوشنے والوں نے چودہ چھوڑے سونے چاندی کے پائے لٹوں والے چنگ
سے بھرے تھے۔^۱

”ایک دن ہم نے مرزا غالب سے پوچھا کہ تم نے کسی سے صحبت بھی کی ہے؟ کہا کہ ہاں حضرت
علی المرتضیٰ سے۔ پھر ہم سے پوچھا کہ آپ کو؟ ہم نے کہا: واہ صاحب آپ تو مثل بچہ ہو کر علی المرتضیٰ کی صحبت
کا دم بھریں! ہم ان کی اولاد کو بلائیں اور صحبت خند نکھیں کیا یہ بات آپ کے قیاس میں آ سکتی ہے؟“
(تذکرہ خواجہ)

سید غوث علی شاہ گلندر قادری نے دسمبر ۱۸۰۳ء بروز جمعہ کو پانی پت میں پیدا ہوئے آپ حنفی سادات
میں سے تھے اور اہل حقانیت خورشید علی (۱۸۸۰ء میں انتقال فرمایا) عرف سید غوث علی شاہ گلندر دکن سید احمد حسن عرف
احمد علی بن سید ظہور الحسن سترہ سلسلوں سے آپ کاتب حضرت غوث اعظم سید عبدالقادر جیلانی سے جا ملتا ہے

اور تیس واسطوں سے حضرت امام حسن بکری سے۔

مولانا شاہ گل حسن قادری لکھتے ہیں: ۷

”چونکہ والدہ ماجدہ شریفہ حضرت رحمت اللہ علیہا کو ایک قسم کا جنون تھا اس لیے جدا بھائی یعنی جناب سید ظہور الحسن صاحب نے ان کا دودھ پلانا مناسب نہ سمجھا۔ فکر و مضامنت میں سرگرم ہوئے۔ اتفاقاً قریب و جوار میں ایک چنڈ تک شعاع رام بتلی نام رہتے تھے معلوم ہوا کہ ان کی بیوی جو نیک شخص اور عیدہ و خصال ہیں دودھ پلاتی ہیں۔ آپ نے ان کو طلب فرمایا اور ان کے دامن پر کتنا کوشش فرمادے ہوئے کیا۔

انھوں نے اسے دلوں کے سونے والو

تھمارے در پہ یہ دولت کھڑی ہے

زبے قسمت اس چنڈ تانی مائی کی جس کو یہ دولت سرمدی نصیب ہوئی۔ کچا ہے ”میں مانگے موتی ملیں مانگے ملے نہ ہو سکیں“ بخوشی و غری دودھ پلانا شروع کیا۔ نام آپ کا حضرت جدا بھائی نے غور شدہ علی شاہ رکھا تھا اور والدہ بزرگوار نے ابو الحسن بڑی والدہ صاحبہ نے غوث علی اور چنڈ تانی مائی نے گنگا بنیں۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ جب ہم چار برس چار مہینے کے ہوئے تو بڑی والدہ صاحبہ نے ہم اللہ چڑھا کر قرآن شریف شروع کر لیا اور چنڈ تانی مائی صاحبہ نے جو پدر و رضاعی تھے ان کا نام لے کر شاعر کا آرنجہ کیا۔ اس برس کی عمر میں قرآن شریف نصف حفظ کر لیا اور نصف باطنہ پڑھا۔ کتب فارسیہ بھی تاسکندہ نامہ بڑی والدہ صاحبہ سے پڑھیں اور مسکرت سار جھ سجدہ چند رکات تک چنڈ تانی مائی سے حاصل کی اور عربی کی صرف نحو پانا محمد حیات صاحب سے جو بڑی والدہ صاحبہ کے والد تھے پڑھی۔ بعد چند مدت کے ہمارے والد ماجد نے اپنے پاس دہلی میں بلا لیا۔ یہاں مولوی محمد اسماعیل صاحب سے ایک سبق کافیہ کا اور مولوی شاہ اسماعیل صاحب سے اور مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب سے حدیث شریف پڑھی۔ باقی کتابیں مولوی فضل امام صاحب خیر آبادی سے پڑھیں۔ ۸۔

اور تائی بیعت والدہ ماجدہ سے کی پھر والدہ بزرگوار اولیاء اللہ کی خدمت میں لے جانے لگے اور بیعت بھی کرائی۔ اعظم علی شاہ صاحب سے بیعت ہوئے انہوں نے خلافت عطا کی اور اپنی اولاد کو ان سے بیعت کرایا پھر انہوں نے ہی میر خضر مولوی حبیب اللہ شاہ صاحب کے پاس بھیجا۔ ایک برس وہاں رہے جب سلوک ملے ہو گیا تو مولوی صاحب نے خلافت عطا فرمائی اور اپنی اولاد کو سریدہ کرایا۔ سیر و فی الارض کے مصداق معراج کا ایک بڑا حصہ اللہ کی زمین کی سیر و سیاحت میں گزارا۔ ایک بار چھ ماہ تک دہلی کی زینت المساجد میں قیام پزیر رہے۔ تذکرہ میں ہے:

”ایک روز ارشاد ہوا کہ ہم مرزا نوشہ کے مکان پر گئے نہایت حسن اخلاق سے ملے۔ اب فرش تک آکر ملے گئے تمام حال دریافت کیا ہم نے کہا کہ مرزا صاحب ہم کو آپ کی ایک فزول بہت ہی پسند ہے علی

تو نہ قائل ہو کوئی اور ہی ہو

حیرے کوچہ کی شہادت ہی سہی

کہا صاحب اپنے شعر میرا تو نہیں کسی استاد کا ہے نفی الحقیقت نہایت اچھا ہے۔

اس دن سے مرزا صاحب نے یہ دستور کر لیا کہ حیرے دن ذیعت المساجد میں ہم سے ملنے آتے اور ایک خوان کھانے کا ساتھ لاتے۔ ہر چند ہم نے خذ کیا کہ یہ تکلیف نہ کیجئے، مگر وہ کب مانتے تھے۔ ہم نے ساتھ کھانے کے لیے کہا تو کہنے لگے کہ میں اس قائل نہیں ہوں۔ بخوار و سیاہ کار گز کار مجھ کو آپ کے ساتھ کھاتے ہوئے شرم آتی ہے۔ البتہ ادب کا مٹا لکھ نہیں۔ ہم نے بہت اصرار کیا تو الگ مختصری میں لے کر کھایا۔ ان کے مزاج میں کمال کسر نفسی اور فروغی تھی^۹۔

ایک روز ارشاد ہوا کہ مرزا رجب علی سردار مصطفیٰ "فسانہ عجائب" لکھنؤ سے آئے۔ مرزا نوشہ سے ملے انٹائے گفتگو میں پوچھا کہ مرزا صاحب اردو زبان کس کتاب کی عمدہ ہے؟ کہا چارہ اردو ملیں گی! میاں رجب علی بولے اور "فسانہ عجائب" کہیں ہے؟ مرزا نے ساختہ کہا اٹھے! ابی لاجل دلاوقہ اس میں لطف زبان کہاں۔ ایک تک بندی اور بھڑا خانہ جمع ہے۔ اس وقت تک مرزا نوشہ کو یہ خبر نہ تھی کہ یہی میاں سردار ہیں۔ جب چلے گئے تو حال معلوم ہوا بہت افسوس کیا اور کہا کہ کالمو! پہلے سے کیوں نہ کہا۔ دوسرے دن مرزا نوشہ ہمارے پاس آئے یہ قصہ سنایا اور کہا کہ حضرت یہ امر مجھ سے نامانگی میں ہو گیا۔ آجے آج ان کے مکان پر چلیں۔ کل کی مکالمات گرتے تھیں۔ ہم ان کے ہمراہ ہو لیے اور میاں سردار کی فرد گاہ پر پہنچے۔ مزاج پر ہی کے بعد مرزا صاحب نے عبارت آرائی کا ذکر بھیجنا اور ہماری طرف مخاطب ہو کر بولے کہ جناب مولوی صاحب رات میں نے "فسانہ عجائب" کو جو بخود لکھا تو اس کی خوبی عبارت اور تعلیق کا کیا بیان کر دوں! نہایت ہی فصیح و بلیغ عبارت ہے۔ میرے قیاس میں تو ایسی عمدہ نثر نہ پہلے ہوئی اور نہ آگے ہوگی اور کیوں کر اس کا مصنف اپنا جواب نہیں دے سکتا۔ غرض اس قسم کی بہت سی باتیں ہائیں۔ اپنی خاکساری اور ان کی تعریف کر کے میاں سردار کو نہایت مسرور کیا۔ دوسرے دن ان کی دعوت بھی کی اور ہم کو بھی بلا دیے۔ اس وقت بھی میاں سردار کی بہت تعریف کی۔ مرزا صاحب کا مذہب یہ تھا کہ دل آزادی بڑا گناہ ہے اور وہ حقیقت یہ خیال درست تھا۔ المؤمن من مسلم المسلمان من لسانہ و یدہ۔

مہاش در پے آزار و ہرچہ خواہی کن

کہ در طریقت ماغیر ازیں گنا ہے نیست

(کسی کو تکلیف پہنچانے کے درپے نہ ہو اور خود ہی میں آئے کر کیونکہ ہمارے مسلک میں اس کے سوا

کوئی اور گناہ نہیں)^{۱۰}۔

حوالہ جات

- 1- مثنوی چراغ دیر (تکلیات قاری غالب)
- 2- مہر نمرود مصنفہ مرزا اسد اللہ خان غالب مترجمہ پروفیسر عبدالرشید قاضی
- 3- لال تلک کی ایک جھلک از سید ناصر تذکرہ فراق دہلوی
- 4- بہادر شاہ ظفر کے شب و روز از ضیاء الدین لاہوری
- 5- لال تلک کی ایک جھلک از سید ناصر تذکرہ فراق دہلوی
- 6- تذکرہ نوشیہ از حضرت غوث علی تلک و قاری سنگ میل پہلی کشتی کا ہور
- 7- 8- ایضاً
- 9- 10- ایضاً

دی گریٹ گیگم..... روس، ایران، افغانستان

”دہلی کے عوام خصوصاً ہندوؤں میں ایک چٹکائی، جس پر عوام یقین کیا جاتا ہے گردش کرتی رہی ہے وہ یہ کہ برطانوی راج ایک سوچکس سال میں ختم ہو جائے گا۔ لوگ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ وہی افغانوں کی پشت پر ہیں برطانوی بہت عرصے سے روسی حملے کی باتیں کرتے رہے ہیں اب ہندوستانوں نے اس پر یقین کرنا شروع کر دیا ہے۔ میں نے متعدد بار سنا کہ اگر روسوں نے حملہ کیا تو غیر مطمئن ہندوستانی ان کا ساتھ دیں گے۔ اگرچہ اب برطانویوں نے اپنی اصلاح کرنی ہے اور لوگوں کو روس کے دروہائیں میں مبتلا دیکھ کر انہوں نے یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ روس بہت کمزور اور غریب ملک ہے اور خود اعتمادی مسائل خصوصاً Nihilism کے فتنے میں مبتلا ہے۔“^(۱)

یہ بیان ایک امریکی سفارتی کانے جو ۱۸۸۰ء میں دہلی آیا تھا، لیکن اس مسئلے پر قالب کوئی چالیس برس قبل اپنی رائے کا اظہار کر چکے تھے۔

نواب مصطفیٰ خان بہادر شیفتہ کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

”روسوں کی شاہ ایران کے ساتھ آویزش ہے۔ یہ دونوں گروہ مل کر ہندوستان کی طرف رخ کرنے والے ہیں یہ افواہیں دیوہی کے افسانے سے زیادہ اور کچھ نہیں۔ غرومعدوں کے لیے زیادہ مناسب یہی ہے کہ ان باتوں پر کان نہ دھریں اور ایسی کوئی بات اپنی زبان پر نہ لائیں۔“^(۲)

یہ خط ۱۸۴۱ء اور ۱۸۴۳ء کے درمیان کسی وقت لکھا گیا۔

۱۴۳ پر مل ۱۸۶۶ء کو اور جہ اخبار میں شائع ہونے والے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:^(۳)

”یارب اودیہ میں جتنے ترے بندے ہیں سب اپنا بھلا چاہتے ہیں۔ آریہ کی فہم و افہام طلب لوگ کیا چاہتے ہیں؟ فتنہ و فساد سے خوش اور امن و امان کے دشمن ہیں۔ گویا زن و فرزند و مال و جان کے دشمن ہیں، اگرچہ اس ہنگامے میں آپ بھی براہ ہوتے ہیں، لیکن جہاں ہنگامے کی خبر سنتے ہیں شاد ہوتے ہیں۔ ابھی سرزمین ہند کو سوچ دن دریا میں سرنگوں دیکھ چکے ہیں یہ یہ مخالفت دشمن صبر نہ نہیں بکڑتے ہیں اور جو کوئی ان کو بھانے تو اس سے جھگڑتے ہیں، کاشل کے اظہار پر کس دھڑت سے کان دھرتے ہیں اور پھر اس اظہار پر کیا کیا اخبار مرتب

کرتے ہیں۔ سرکار انگریزی کی کارہائیکہ قہر طرف رفاہ عام کے ہے یا قصہ جو کچھ ہے واسطے انتظام کے ہے۔
 ہر شخص حال اگر اس گروہ میں سے بڑھ کر کسی نے حوصلہ کیا اور صاحبان عالی شان و جلالت نشان کا مقابلہ کیا بات
 صاف صاف ہے چائے انصاف ہے۔ جن مسکرمین اللہ حاکموں نے اپنی فوج باغی کو صرف اپنے حسن تدبیر و
 ضرب شمشیر سے زیر کیا ہے اب جو یہ فوج جرار و لشکر ہے شمار ساتھ ہے مخالفت کا رفع کرنا مشکل کیا ہے؟ ہندو و
 مسلمان اہل ہند جو اگلے تختہ و فساد سے بچ رہے ہیں اور بعد اس کے وہاں نقطہ کے دکھ ہے ہیں وہ اپنی عاقبت و
 صحت پر خدا کا شکر بجا لائیں اپنا پاکیزہ دستہ اناج فراغت سے کھائیں انہی بوت اور ریل گاڑی کی صنعت کو
 دیکھیں چربلی میں پیام بھیجے کی سرعت کو دیکھیں۔ مدرسوں کی رونق اور رواج علم کی کثرت ملاحظہ فرمائیں۔
 حکام کی مہربانیاں اپنی نسبت ملاحظہ فرمائیں ملک سراسر بے خس و خوار ہو گیا ہے علم رو ہندو سونگزار ہو گیا ہے
 بہشت اور بکٹھ جو مرنے کے بعد تصور تھا اب زندگی میں موجود ہے وہ احق ہے وہ قادر دان ہے جو
 انگریزی کی عملداری سے تا غرور خود ہے حکام کو ملک کی آبادی اور مال کی آسویگی منظور بہر صورت ہے۔ اگر اسی نا
 کوئی اپنے حق کو نہ پوچھے تو اس شخص کی خوبی قسمت ہے آدمی رحمت خاص کو نہ دیکھے رحمت عام پر نظر رکھے۔
 اگر اس کا کوئی نہ حاصل نہ ہو تو اپنے بخت قسمت کا نگاہ کرے۔

اسن دایان کا طالب بخت قسمت کاشا کی "غالب" فقط۔

اس مضمون کے ساتھ ہی "ہندوستانی کی بھٹ" کے عنوان سے ادارتی نوٹ چھپا "افغانستان کا
 روزنامہ صحت و راز سے جانا جاتا ہے دس برس سے زیادہ ہونے کے مختلف اخبار میں دیکھا جاتا ہے" غرض سالہا
 گزر گئے شتے شتے کان بھر گئے کسی امر کا تصور نہ پایا افسانے کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ ان دنوں بھی ویسی ہی
 باتوں نے شہر میں پائیں چاروں طرف لوگوں نے بے پرکی اڑائیں۔۔۔۔

۔۔۔۔۔ اے بے فکر خدا سے ڈرو باقی عالم کو پریشان نہ کرو معلوم نہیں یہ بے اصل باتیں کون کھڑا کرتا
 ہے۔ آج کل داتا نے روزگار سراسر ادولی الایسا اور سرفروغ و عظمت کا طوفان غلبت جناب و لا عثمان عالی مناقب مرزا
 اسد اللہ خان غالب نے جن کے سلامت ذہن مستقیم پر قسم کھائیے استقامت رائے سلیم کے صدقے جابجے
 ناچوں کی فہمائش میں ایک منتظر رہ رہی۔ ہم اس کو درجہ اخبار کرتے ہیں اہل جہاں پر آشکار کرتے ہیں۔"
 اس مضمون کی حمایت میں ایک خط جناب مردان اہل خانہ کا شائع ہوا جس میں تھا:

"مکرم خاکسار صاحب اور صاحب اخبار سلامت! آپ کے اخبار حق نگار مطبوعہ ۱۳۲۲ پر ایل سن رواں کے
 صفحہ میں مہارت منتظر بختہ قلم جواہر رقم حضرت اوسٹادی جناب والا مناقب مرزا اسد اللہ خان غالب دہلوی دام
 افشاء ہم کی در باب قہد و دھبیہ عوام کج فہمائش ہند میری نظر سے گزری؟ جس سے یہ مقصود ہے کہ افواہ جنگ
 ایمانیان بالافغانان میں خام خیال لوگ کیا کیا خیال خام کرتے ہیں۔۔۔۔"

زاد شاہی اردو اور گنورین برطانیہ کے دو میان وسط ایشیا پر بالادستی کے لیے ہونے والا کھیل کرے۔ ہم

کہلاتا ہے۔ انیسویں صدی کے آغاز میں یہ دونوں حریف ملک ایک دوسرے سے دو ہزار میل کی دوری پر تھے جبکہ صدی کے آخر میں ان کا دور میلانی فاصلہ صرف چھ میل رہ گیا۔ اس عقیم کھیل میں دونوں اپنی سرحدوں میں توسیع کی کوشش کر رہے تھے جبکہ برطانیہ اپنی خلائی کلید ہندوستان پر اپنے قبضے کو مستحکم کرنے میں مصروف تھا۔ اسی کشمکش کے ایک جزو کے طور پر بلوچستان پر قبضہ ہوا۔ افغانستان پر قبضہ ہوا پھر افغانستان سے نکلنے کے بعد ایک بار پھر قبضہ کیا گیا۔

قارورڈ پالیسی تشکیل دی گئی۔ سندھ پر قبضہ ہوا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں بھی برطانویوں کو روکی اور ایران کا حاکم نظر آیا۔ جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد معزول بادشاہ بہادر شاہ ظفر پر چلائے جانے والے مقدمے میں یہ ایک اہم نکتہ تھا۔

۳۷ جنوری ۱۸۵۸ء کو کوپٹھان کے لیٹیننٹ کرنل ڈارنس کی صدارت میں ایک فوجی عدالت قائم ہوئی جس کا اجلاس ہنگوہ کے دیار خاص میں ہوا۔

ریڈیٹ ڈپٹی سر قاسم قصبہ ٹیلیس مظاف پر جراح کی ایک جھلک ۵

سوال:- کیا ایرانیوں کی ہرات پر چڑھائی کرنے کا چرچا ہندوستان میں اکثر ہوتا تھا؟

جواب:- ہاں! اکثر ایسا ہوتا تھا مگر ہندوستان کے ہندوستان پر حملہ کرنے کا ذکر بیشتر ہوتا تھا اس وقت ہر ہندوستانی اخبار نے اپنا اپنا کارپانڈٹ کاٹل میں مقرر کیا تھا جس کے ذریعے براہِ وہاں کی خبر لگا کرتی تھی۔ حکیم احسن اللہ خان پر ہونے والی جراح میں ۶

سوال:- کیا بادشاہ نے مرزا نجف کو شاہ ایران سے مدد لینے کے لیے بھیجا تھا؟

جواب:- مرزا نجف کے ایران جانے کی خبر ڈپٹی مرزا نجف مرزا حیدر کے بھائی اور بادشاہ کے بھتیجے تھے۔ یہ خبر مولوی باقر کے اخبار میں لگی تھی۔ اس میں یہ بھی لکھا تھا کہ شاہ ایران نے ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا۔ میں نے مرزا نجف کے بڑے دوست مرزا علی بخت سے دریافت کیا تھا کہ وہ بادشاہ کی طرف سے کوئی خط شاہ ایران کے نام لے گئے ہیں؟ انہوں نے خط کا اقرار کیا اور کہا اس میں بادشاہ نے لکھا ہے کہ میں شیعہ ہو گیا ہوں۔ میری مدد کو میری حالت اس وقت بہت زریں ہے مگر اس کا کوئی جواب نہیں آیا۔

سوال:- کیا قلعہ میں انگریزوں اور ایرانیوں کی لڑائی کے تذکرے اکثر ہوتے تھے اور بادشاہ اس گفتگو میں دلچسپی ظاہر کیا کرتے تھے؟

جواب:- اس مضمون پر دلچسپی اور گفتگو خاص کر نہ ہوتی تھی۔ ہندوستانی اخبار جو قلعہ میں آتا تھا اس سے لڑائی کی ترقی کا حال معلوم ہوتا تھا اور بادشاہ بھی کسی طرح ان میں قابلِ لحاظ دلچسپی ظاہر نہیں کرتے تھے۔

سوال:- کیا جنہیں معلوم ہے اس شخص حسن عسکری کی معرفت شاہ ایران سے قیدی (شاہ ظفر) کی خط و کتابت ہوئی تھی؟

جواب:- ہاں مجھے معلوم ہے خط پایا کرتے تھے!!

سوال :- کیا تم نے کسی خواب کا حال سنا جس کی تعبیر حسن معسکری نے بادشاہ کو دی ہو؟

جواب :- ہاں! جس وقت ایرانی فوجیں ہرات میں آئیں اس وقت ایک خواب کا حال سنا تھا۔ اس وقت حسن معسکری نے اپنا خواب بادشاہ کے سامنے بیان کر کے اس کی تعبیر یہ دی کہ شاہ ایران ایشیا میں انگریزی فوجوں کو براہِ پاکر کے بادشاہ کو اس کے تخت پر بٹھائے گا اور اس کی سلطنت پھر اس کے قبضے میں آ جائے گی اور کافر یعنی انگریز قتل ہو جائیں گے۔

خیر جی لال پر ہونے والی جرح سے انتہاس؟

سوال :- کیا بادشاہ کا کوئی اچھی اس وقت شاہِ فارس کے پاس ہے یا حشر کیا تھا؟

جواب :- نہیں! موجودہ زمانے کی بابت تو میں کہہ نہیں کر سکتا کوئی دو یا تین سال گزرے ہوں گے مجھے یاد پڑتا ہے کہ میں نے محمد باقر والے اخبار میں پڑھا تھا کہ مرزا نجف قیدی کا، حبیبہ ایرانی اور بار میں گیا تھا اور شاہِ فارس بڑی خواہش سے بخش آئے تھے۔

سوال :- کیا کوئی شہزادہ ایرانیوں کے حلقِ مضامین لکھیں سے پڑھا تھا یا ان مضامین کو ضروری سمجھتا تھا اور ایرانیوں کے انگریزوں کو پسپا کرنے کی بابت رائے رتی کرتا تھا؟

جواب :- میں نے خود وہ اخبار نہیں پڑھا مگر سمجھتا ہوں کہ اس میں ایرانیوں کے انگریزوں کو مغلوب کرنے کے مضامین اکثر ہوا کرتے تھے اور شہزادے ان خبروں کو ضروری سمجھ کر وقت کی نگاہ سے دیکھ کر کرتے تھے۔ گوکہ کشن سنگھ چراسی مدبر اخبار دہلی پر ہونے والی جرح کا ایک حصہ؟

سوال :- جس زمانے میں ایرانیوں کے آنے کی افواہیں کیا روایوں کی بابت بھی تذکرہ ہوتا تھا؟

جواب :- ہاں! دونوں کا تذکرہ ہوتا تھا مگر بیشتر ذکر ایرانیوں کا ہوتا تھا۔

سوال :- تم نے بیان کیا ہے کہ صادق الاخبار کی تحریر انگریزی گورنمنٹ کے خلاف ہوتی تھی انہیں کوئی ایسا مضمون یاد ہے جس سے اس بات کا یقین ہو؟

جواب :- مجھے کوئی خاص مضمون یاد نہیں جس میں مقابلہ دیگر مضامین کے زیادہ مخالفت ہو مگر جو مضامین ایرانیوں اور روسیوں کے حلقِ شائع ہونے ان کی تحریر ہمیشہ مخالفانہ ہی ہے۔

حوالہ جات

1- Historic Delhi (By H. K. Kaul.)

2- شیخ آہنگ غالب ترجمہ تحریکِ احمدی

3-4- خیابانِ غالب از نامہ سیتا پوری

5-8- چراغِ دہلی از مرزا حمزہ دہلوی۔ کراچی پریس دہلی

غالب اور غدر... ۱۸۵۷ء تا ۱۸۵۹ء کی دہلی

بسکہ فعال بامیہ ہے آج
گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے
چمک جس کو کہیں وہ ہٹل ہے
شہر دہلی کا ذرہ ذرہ خاک
کوئی دہاں سے نہ آئے دہاں تک
میں نے مانا کہ مل گئے پھر کیا
گاہ جل کر کیا کہے شکوہ
گاہ رو کر کیا کہے ہام
اس طرح کے وصال سے باوب

ہر سلجھور انگلستان کا
زہرہ ہوتا ہے آبِ انساں کا
گھر بنا ہے صوتِ زماناں کا
تکڑے ٹکڑوں ہے ہر مسلمان کا
آدھی دہاں نہ چا سکے دہاں کا
وہی روئے تن و دل و چاں کا
سوزش داغ ہائے پنہاں کا
ماجرہ دیدہ ہائے گرہاں کا
کیا نئے دہاں سے داغِ ہجراں کا

(مکتوب بنام ملاؤ الدین احمد خان ملّا کی ۱۸۵۸ء)

۱۸۵۷ء کی شورش نے اسے غدر کہنے یا جنگ آزادی پر مصیّر، گھر سے اثرات چھوڑے۔ اس کھٹکس کے تمام فریقوں انگریز ہندو مسلمان سب نے اپنی اپنی حکمت عملی تبدیل کی سب نے اپنی بھاؤ کے لیے نئے نئے راستے ڈھونڈے اور اختیار کیے۔ کھٹکی کی حکومت کا خاتمہ ہوا، عسکری جدوجہد کی جگہ سیاسی تحریک نے لی۔ غالب اس قضیے کو ”ترکیز ہے جا“ کہتے ہیں۔

ابن ابیام کا ایک روزنامہ سچا نہیں نے نکلا اور نومبر ۱۸۵۸ء میں اسے ”دختیو“ کے نام سے شائع کرایا۔ یہ کتاب خالص فارسی میں ہے۔ عربی سے سبزو اور تاریخ سے زیادہ انشا پر دلائی کا نمونہ... اسے چڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ غالب کوئی بہت اچھے روزنامہ نگار نہ تھے، لیکن ”دختیو“ کے حوالے سے غالب کے خطوط پر عیسوی تو واضح ہوتا ہے کہ یہ کتاب انہوں نے روزنامہ سچا یا تاریخ کے طور پر نہیں اپنی جان بچانے کے لیے لکھی تھی۔ وہ استادشاہ تھے، شاعر و ہار تھے، شاہی تاریخ نویس تھے۔ ایک سرکاری خبر چیون لال کے روزنامے کے مطابق

جب ہانپوں نے بہادر شاہ ظفر کو تخت پر بٹایا اور ان کے مطلق العنان شہنشاہ ہونے کا اعلان کیا تو اس موقع پر مرزا غالب نے ایک قصیدہ سرور بارش کیا۔ چنانچہ غالب نے ان الزامات سے بری القصد ہونے کی ایک کوشش کے طور پر دھندھویری کی۔ یہ ان کی بھلا اور روزی روٹی کا مسئلہ تھا۔ بادشاہت کے خاتمے کے بعد ان کا انحصار محض انگریزوں کی بخشش پر رہ گیا تھا۔

اپنی اس کاوش میں قاضی فہم طور پر انہوں نے انگریزوں کے علم و دانش اور عدل و انصاف کی تعریف میں جاوے جا چکے شامل کر دیئے ہیں۔ تاہم انہوں نے تاریخ کو مسخ نہیں کیا۔ گوروں کی طرف سے معذرت خواہی کرتے ہوئے ہی ان کے تمام مظالم بے کم و کاست بیان کر دیئے گئے بلکہ کالوں سے زیادہ گوروں کے مظالم بیان کیے۔ نعل شہر کے دیو تر جیو صاحب انہوں نے بیان کیے نہ انگریزوں کی فتح دہلی کے بعد کے ہیں۔ تاہم محقق جناب رشید حسن خان نے دھندھوکا اردو ترجمہ کیا اس میں سے اقتباسات یہاں پیش کیے جا رہے ہیں:

۱۶ رمضان المبارک ۱۲۷۳ھ کو گور کے دن دوپہر کے وقت مطابق ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء پانک دہلی کے قلعے اور فیصل کی دیواریں لرز اٹھیں میں زلزلے کی بات نہیں کر رہا ہوں اس محسوس دن کو ہر گھڑی فوج کے کچھ بد نصیب اور شوریدہ سرپای شہر میں آئے نہایت ظالم و فساد اور تلک حرای کے سب انگریزوں کے خون کے پیاسے۔ شہر کے قلعہ و دروازوں کے محافظ جوان فسادوں کے ہم پیش اور بھائی بند تھے بلکہ کچھ کچھ نہیں کر پہلے ہی سے ان محافظوں اور فسادوں میں سادش ہو گئی ہو۔ شہر کی حفاظت اور مدداری اور حق تلک ہر چہ کو بھول گئے۔ ان بن بلائے سہانوں کو خوش آمدید کہا۔ ان مدوش سواروں اور اکڑیاؤں نے جب دیکھا کہ شہر کے دروازے کھلے ہوئے ہیں اور محافظ سہان لوازیں دیا انوں کی طرح ادھر ادھر دوڑ پڑے جدھر کسی افسر کو پایا اور جہاں ان قاضی احترام (انگریزوں) کے مکانات دیکھئے جب تک ان افسروں کو مار نہیں ڈالا اور ان مکانات کو بالکل جاہ نہیں کر دیا ادھر سے ذبح نہیں بھیرا۔

میں اپنے گھر میں بیٹھا ہوا تھا کہ شور و غوغا سنا۔ چاہتا تھا کہ کچھ معلوم کروں کہ اسے میں شور مچ گیا کہ اندرون قلعہ صاحب اجنٹ بہادر اور قلعہ دار قتل کر دیئے گئے ہیں ہر طرف سے پیادوں اور سواروں کے دوڑنے کی آوازیں بلند ہونے لگیں زمین ہر طرف گل انداموں کے خون سے رنگیں ہو گئی۔ افسروں وہ بیکر علم و حکمت انصاف سکھانے والے خوش اخلاق اور تلک حاکم۔ مدد افسروں وہ پری چہرہ نازک بدن خواتین جن کے چہرے چاند کی طرح چمکتے تھے اور بدن سبکی چاندنی کی طرح دیکھتے تھے۔ حیف وہ بچے جنہوں نے ابھی دنیا کو (ابھی طرح) دیکھا ابھی نہیں تھا جن کے فس کہ چہرے نگاہ دلالہ کے پھولوں کو شرماتے تھے اور جن کی خوش

رفتاری کے سامنے ہرن اور کبک کی رفتار بدلنا معلوم ہوتی تھی یہ سب ایک دم قتل و خون کے تصور میں پھنس گئے کچر کا قتل ڈوب گئے۔

خدا خدا کر کے وہ منحوس دن ختم ہوا ہر طرف گہرا اندھیرا پھیل گیا ان سیاہ ہاتھوں اور بے رحم ہاتھوں نے شہر میں جابجا پھاڑ ڈالا۔ اندرون قلعہ شاہی باغ کو گھوڑوں کا اصطبل بنایا اور نقشین سلطانی کو خواب کا وہ رفت و زور کے شہروں سے ختم کر آئیں کہ مختلف فوجوں کے ہاتھوں نے ہر چھاؤنی میں افسروں کو قتل کر دیا ہے اور تنگ حراموں نے کھلم کھلا بغاوت کا شور مچا رکھا ہے۔ گردہ کے گردہ خواہ سپاہی ہوں یا زمیندار سب بیکدل ہو گئے ہیں اور کسی طے شدہ پروگرام کے بغیر اور فز و یک ہر یک ایک ہی کام کے لیے کمر بستہ ہو گئے اور ہر کسی مضبوطی سے کمری کسی قہیں کہ صرف اس دریا نے غلوں کی موجیں ہی انہیں کھول سکتی تھیں۔ بہت سے لشکر سرداروں کے بغیر تیار ہو گئے بہت سی فوجیں افسروں کے بغیر لڑائی کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں تو یہیں گولہ بارود چھڑے غرض سارا سامان انگریزوں سے حاصل کیا گیا لڑائی کے سارے طریقے انگریزوں سے سیکھے اور انہی سکھانے والوں اور ہاتھوں سے لڑنے کے لیے تیار ہو گئے۔

ظہیرے ہر قسم کی پابندیاں سے اور سوداگر محمول ادا کرنے کی ذمہ داریوں سے آزاد و گھروہ رانے معلوم ہوتے ہیں اور مکانات (لوٹ مار کرنے والوں کے لیے) خوان مفت کا حکم رکھتے ہیں۔ جو لوگ گناہی کے گوشوں میں پیچھے ہوئے تھے وہ گردہ گردہ اور بغیر کف اپنی آرائش اور بے شرمی کا مظاہرہ کرتے پھرتے ہیں۔ امن پیدا اور تنگ نہاد لوگ گھر سے بازار تک آتے ہوئے راستے میں شیعوں جگہ عاجزی اور مظلومیت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہیں۔ ظہیرے دن میں ولییری کے ساتھ لوٹ مار میں مصروف ہیں اور رات میں رہنمی استر دہ پر غور و خراب۔ بڑے بڑے عالی حاکمان لوگوں کے گھروں میں چراغ جلانے کے لیے تیل نہیں... وہ کم و جبہ لوگ جو سارا دن مٹی بیچنے کے لیے زمین کھودتے تھے ان کو مٹی میں سونے کے ٹکڑے مل گئے اور جن لوگوں کی محفل میں دن رات آرائش گل سے چراغ روشن رہتے تھے اندھیرے گھروں میں ناکامی و حاسر اوی کے غم میں جھٹلا ہیں... کو قتل شہر کی زن و دختر کے علاوہ ساری چار و پنجانہ شہر کا زہر بزدل اور سیاہ کار و ہنر فوں کے قبضے میں ہے... بڑے بڑے حاکموں اور نام و دلوں کی آبرو مٹی میں ملا دی گئی اور جن لوگوں کے پاس نہ دولت تھی نہ عزت وہ بے اندازہ زور و جہاں اور عزت و آبرو کے مالک ہیں۔

ڈاک کا نظام درہم برہم ہو گیا جس کے سبب سے بہت سے کام نڈک گئے ہر کاروں نے آنا جانا اور ڈاک لے جانا بند کر دیا۔ ڈاک میں پیام تکسم پہنچانے کی گنجائش نہیں ہوتی۔ ہاں خطوط کی آمد و رفت کا قاعدہ

ہے مگر اس لمحے کی ایک شاخ ہے (لیکچر) کہ نہ سڑب کی جنبش بلکہ جنبش کی سڑب سے جو اس سے پیدا ہوتی ہے ہزاروں عظام (خمریں) اعد سے باہر نکلتے (نکلتے) ہیں (جو لوگ) مذہب اور قانون کے بے حد پابند ہیں انصاف کو نظر انداز نہ کریں اور بتائیں کہ اس سارے نظام کا درہم برہم ہو جانا خدا کی بخشی ہوئی دولت کا نٹ جانا 'لوگ' کا نظام درہم برہم ہو جانا اور دوستوں کے حالات معلوم نہ ہونا کیا یہ ساری باتیں اس لاکھ نہیں کہ ان کا ماتم کیا جائے اور آئسوہائے جائیں۔

جب پہلی بار وہ کمرہ چھوڑ آئے تو جو خزانہ وہ اپنے ساتھ لائے تھے خزانے میں جمع کر دیا اور اپنے سر شاہی آستانے پر جہاں دیکھے۔ جلد ہی زمانے میں کچھ ایسا انتظام کیا کہ ہر طرف سے تو جیسے جمع ہونا شروع ہو گئیں اور اس سر زمین (دہلی) کی طرف روانہ ہو گئیں۔ بادشاہ جب فوج کا انتظام نہ کر سکے فوج نے انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا اور بادشاہ مجبور ہو کر دیکھے۔ یہ شہرت طلب جنگجو جس مقام سے چلے وہاں کے قید خانے کا دروازہ کھول دیا اور قیدیوں کو آزاد کر دیا۔ وہ پرانے پرانے قیدی جنہوں نے نئی نئی آزاد دی پائی تھی شاہی دربار میں آئے سجدہ کیا اور کسی علاقے کی صوبیداری چاہی۔

اب دہلی کے اعد اور باہر تقریباً پچاس ہزار سواروں اور پیادوں کی فوج پڑی ہوئی ہے۔ ساخان علم و دانش انگریزی حکام کے قبضے میں اس وسیع شہر کا کوئی علاقہ نہیں صرف شہر کے جانب مغرب ایک پہاڑی پر ان کا قبضہ ہے۔ یہ پہاڑی شہر سے کچھ زیادہ دور نہیں۔ (انگریزوں نے) نہایت ہنرمندی سے اس جگہ پر سورج قائم کر کے ایک مضبوط قلعہ سا بنالیا ہے اور اس کے چاروں طرف کئی اونچا صفت اور دھڑاں تو ہیں لگا دی ہیں۔ شہر کی فوج نے جو بیگزین اسی شہر سے حاصل کیا تھا اس میں سے چند تو ہیں شہر کی فضا میں پر بھاوی ہیں اور اس طرح اپنے آپ کو جنگجو سواروں کا حریف فرض کر لیا ہے۔ توہیں اور بندھوں کے دھوکے سے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کالی گٹھ چھائی ہوئی ہے اور اس سے اگلے برس رہے ہیں۔ رات دن دونوں طرف سے گولہ باری ہوتی ہے جیسے اوپر (آسمان) سے پتھر برس رہے ہیں۔ مٹی جون کی گرمیاں ہیں۔ دھوپ کی چیزی روز بروز بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ مختلف مقامات سے آئے ہوئے سپاہی دن چڑھے شیر دل انگریزوں سے لڑنے کے لیے جاتے ہیں اور سورج ڈوبنے سے پہلے ہی واپس آ جاتے ہیں۔

ایک دن کچھ لوگ حکیم صاحب (احسن اللہ خان) کو قتل کرنے کے لیے ان کے محل پر چڑھ دوڑے۔ حکیم صاحب اس وقت قلعے میں بادشاہ کے پاس تھے۔ چند اٹھتے سر قلعے میں گئے اور حکیم صاحب کو گھیر لیا۔ بادشاہ نے انہی اچھی محبت و بندہ پروری سے اپنے آپ کو ان کے (حکیم صاحب) کو پرگرا دیا۔ اس طرح

حکیم صاحب بنے۔ جان تو بچ گئی لیکن یہ تھا اس وقت تک منع نہیں ہوا جب تک ان کا سارا گھر جا نہیں ہو گیا۔ یہ گھر جو گارخانہ جین کی طرح قماروں کا گھمٹا ہوا تھا۔ اب ان کی جھٹ کو آگ لگا دی گئی۔

نوٹیس ہر طرف سے آ کر جمع ہو رہی تھیں بادشاہ کا نام لگا ہوا تھا اس وجہ سے خود خود کے سردار ان فوج اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ فرخ آباد کے نام و درگزر حسین خان نے جن کو بادشاہ سے کبھی علاقہ پایا نہ تھی جنہیں تھا خود ہی سے آستان شاہی کو بھیجا کیا اور خط میں اپنے آپ کو نیاز مند قدیم کہا۔ خان بہادر خان نے جو گروہ شہرت طلب تھا اور جو بریلی میں کچھ لشکر جمع کر کے سردار بن بیٹھا تھا ایک سو ایک اشرافانہ فوجی سامان سے آراستہ ہاتھی اور گھوڑا پارگاوشاہی میں بھیجا۔ چشم بدور خود شہنشاہ نواب یوسف علی خان بہادر فرماں دہائے رام پور نے جو اس علاقے میں باپ دادا کی جانشینی کا حق ادا کر رہے ہیں اور انگریزی حکومت کے ساتھ ان کا رشتہ دوستی اتنا مضبوط ہے کہ زمانہ ہزار برس میں کسی طریقے سے اسے نہیں توڑ سکتا مجبوراً صرف نہ پانی پیام بھیج کر لوگوں کی زبان کو بند کیا۔

لکھنؤ میں جب فوج نے انگریزوں سے رشتہ قطع توڑ لیا ویشتر انگریز دشمنی کی اس آگ سے بچ کر دوسرے مقامات پر اپنے حلقہوں کے پاس چلے گئے لیکن (افواج کے) چند سرداران نے کچھ لوگوں کو ساتھ لے کر بجلی کارو میں قیام کیا جو لکھنؤ کا ایک مشہور مقام ہے اور بہادری کے ساتھ دروازے بند کر لیے۔ شرف العادل نے جو بڑے واقف کار اور معاملات کو سمجھنے والے اور جوانان اودھ کے زمانے میں وزارت پر سر فراز تھے وہاں علی شاہ کے دس سال لڑکے کو تخت حکومت پر بٹھا دیا اور اس کو شہنشاہ و ہندوستان کا دربار اپنے آپ کو چلاکار اور نائب وزیر فرض کر لیا۔ اور ایک منتخب شخص کو نائب چیکش کے ساتھ (دہلی) روانہ کر دیا۔ قاصداً پایا دروازہ رام پور گیا پھر پارگاوشاہی میں حاضر ہوا وہ مبارقہ گھوڑے دو کوہ یوسف ہاتھی ایک سو اکیس اشرافانہ اور ایک سو تیس گھوڑے کے قایم سواروں سے حریفی پیش کی اور ایک جھڑا بازو بند جس میں ہیرے جڑے ہوئے تھے ملکہ کی خدمت میں مل میں بھیجا۔ جس دن وہ ہنر قدم قاصداً آیا اور بادشاہ نے بندہ پر دہری فرمائی اس کے کل کوہر کے دن قمری سینے کی چڑیاں اور تھیری چودہ تاریخ کو پہاڑی کے دامن میں جیسے ہوئے (انگریزوں نے) شہن و لشکر کے ساتھ کشمیری دروازے پر ایسا حملہ کیا کہ کالوں کی فوج کو بھاگتے ہی تھے۔ مختصر یہ کہ فاتحین نے راستے میں جس شخص کو پایا قتل کر دیا۔ شہر کے عالی خاندان اور صاحب عزت افراد عزت اور آدمی کو بچانے کے لیے گھروں کے دروازے بند کر کے بیٹھ رہے۔ دو تین دن تک کشمیری دروازے سے لے کر چمک تک تمام راستے میدان جنگ بنے رہے۔ دہلی دروازہ ترکمان دروازہ و انگریزی دروازہ یہ تینوں دروازے اس فوج کے قبضے میں رہ گئے۔ مجھ مرد دہلی کاظم کدہ (مکان) وسط شہر میں کشمیری دروازے اور دہلی

دروازے کے درمیان ہے اور میرے مکان سے ان دونوں کا فاصلہ برابر ہے۔ اگرچہ گلی کا دروازہ بند کر لیا گیا تھا لیکن ابھی اتنا حوصلہ تھا کہ دروازہ کھول کر باہر چلے جاتے تھے اور کھانے پینے کا سامان لے آتے تھے۔ میں نے ابھی کہا کہ غضب ناک شیریں (انگریزوں) نے شہر میں داخل ہوتے ہی یکے بے سرو سامان لوگوں کو قتل کرنا اور چند مکانوں کو جلانا تھا تو سمجھا۔ ہاں جس مقام کو لڑکھچھ کرتے ہیں ان لوگوں پر ایسی ہی سختیاں کرتے ہیں۔ اس شخص اور غشی کو دیکھ کر لوگوں کے مذاق ہو گئے۔ بیٹا مردوں اور عورتوں کے گروہ جن میں معمولی لوگ بھی تھے اور صاحب حیثیت بھی ان تینوں دروازوں سے باہر نکل گئے شہر کے باہر جو پھولی پھولی بستیاں اور مقبرے تھے ان میں پناہ گزین ہو گئے۔ اس خیال سے کہ کسی مناسب وقت پر شہر میں آ جائیں گے یا کسی دوسرے شہر میں چلے جائیں گے۔ میرے دل پر نہ خوف و نہشت کا اثر ہوا اور نہ پائے احتفال کو بخشش ہوئی۔

بعد کے دن عرم کی چھبیس تاریخ قحی اور جبری انٹائیکس دن چڑھے دیا کو خوشی بٹھنے والا آفتاب عالم تاب برج سنبلہ کے ایک درجے میں پہنچ کر کسوف میں آ گیا اور اہل عالم کی چشم جہاں میں بھر پڑ گئی۔ علم و احیاء۔ گرو باغی اندرون اور بیرون شہر سے خزیروں کی طرح بھاگنے لگے اور قلعین نے شہر اور قلعے پر قبضہ کر لیا۔ سخت دھن اور پکڑ و پکڑ (کی آفت) اس گلی تک آ گئی 'خوف سے لوگوں کے دل دھل گئے۔ اس گلی میں صرف دس بارہ گھر ہیں اور راستہ ایک ہی طرف سے ہے۔ گلی میں کوئی کنواں نہیں ہے۔ زیادہ تر رہنے والے چلے گئے ہیں (اسی طرح کہ) عورتیں بچوں کو چھاتی سے لگائے ہوئے تھیں اور مردوں کے کاندھوں پر سامان کی ٹھڑیاں تھیں۔ کچھ ہی لوگ باقی رہ گئے تھے۔ ہم سب نے مل کر گلی کا دروازہ اندر سے بند کر لیا اور پھر جن دس گلی سر بستہ قحی ہی در بستہ بھی ہو گئی۔ (انٹائیکس) اس مصیبت میں کام لینے کی ایک صورت پیدا ہو گئی۔

فلک مرتجہ سرخ چشم مہاراجہ زمرہ سنگھ بہادر فرماں روا نے پٹیاں اس جنگ میں قلعین کے ساتھ ہیں اور ان کی فوج شروع سے انگریزوں کی فٹکری مددگار ہے۔ راجہ کے چند ملازمین خاص جو ان کی سرکار میں اونچے عہدوں پر ہیں اور شہر کے نامور لوگوں میں سے ہیں (میری مراد ہے) حکیم محمود خان، حکیم مرتضیٰ خان، حکیم غلام اللہ خان نے جو حکیم شریف خان جنت مکانی کی اولاد میں سے ہیں اس کو پے میں رہتے ہیں اور نہ تک ان کی دودھ عمارتیں چلی گئی ہیں۔ میں دس سال سے ان میں سے ایک صاحب جاوہر دست کا پڑوسی ہوں۔ چونکہ دلی کی فتح متوقع تھی راجہ نے ازراہ بندہ پروری طاقتور اور جنگجو (انگریزوں) سے طے کر لیا تھا کہ جب شہر فتح ہوگا اس گلی کے دروازے پر محافظ مقرر کر دیے جائیں گے تاکہ انگریز فوجی جن کو گورا کہتے ہیں گھروں کو نقصان نہ پہنچائیں۔

سارے شہر میں چند رہے جس سے ہر گھر کا دروازہ بند ہے۔ دکاندار اور خریہ اردو لوں غائب ہیں نہ گندم فروش کہ گیسوں خریہ یا نہ دھونی ہے کہ کپڑے نہ چھلنے کو ہیں، کام کو کہاں وصول ہیں کہ سر کے بال تراشے اور مہر

کو کہاں سے وصول کر لائیں کہ مٹائی کرے۔ بہر حال جیسا کہ میں نے بیان کیا ہے ان پانچ مہینوں میں (کلی کے لوگ) باہر نکل کر پانی تو برابر لے آتے تھے۔ کبھی کبھی آٹا و نمیرہ بھی مل جاتا تھا لیکن اس کے بعد یہ صورتحال ختم ہو گئی۔ گھروں میں کھانے کا جس قدر سامان تھا رفتہ رفتہ ختم ہو گیا۔ پانی اگرچہ بے حد احتیاط سے بچا گیا لیکن آخر کار کوڑے یا گھڑے میں ایک قطرہ نہیں رہا۔ ہر چہ ادا باد کہتے ہوئے پھرے داروں سے باہر جانے کی اجازت چاہی یہ پھرہ ازراہ دوستی تھا تا کہ ازراہ دشمنی اس لیے یہ کہا گیا کہ چوک کے بازار تک جاسکتے ہیں چوک سے آگے نقل و وطن کا بازار گرم ہے اور رستہ بچہ خطر ہے۔ مجبور وہ بے نشان لوگوں نے دروازہ کھول دیا۔ بھٹی اور منگھ کا ملنا نا ممکن تھا اس لیے ہر گھر سے ایک مرد اور بھرے ملازمین میں سے دو شخص گئے۔ ٹھٹھا پانی زور تھا اور اتنی زور چاہئیں سکتے تھے مجبورانہم شور پانی ٹنگوں اور گھڑوں میں بھرنے لائے اس طرح تنگین پانی سے وہ آگ بھیجی جس کا دوسرا نام پیاس ہے۔ آج کل ہم لوگ اپنے آپ کو قید کی سمجھ رہے ہیں اور حقیقت بھی یہ ہے کہ بالکل قیدیوں کی طرح زندگی گزار رہے ہیں۔ ایک دن اسیا تک بادل آیا پانی برسنا۔ ہم نے چادر باندھ لی اور ایک منگھ اس کے نیچے کھڑا اور پانی حاصل کیا۔

جسہری تصویریں تاریخ کو بدھ کے روز شہر کی فتح اور گلی کا دروازہ بند کرنے کے بعد وہیں دن لوگ خبر لائے کہ لوٹ مار کرنے والے بھائی (مرزا یوسف) کے گھر پر چڑھ دوڑنے لگی اور گھر میں لوٹ مار کی۔ دیوانے مرزا یوسف اور دونوں بڑے صاحبزادی (ملازمین) کو زندہ چھوڑ دیا۔ اس بھاگڑ میں وہ بندہ کہیں سے آ کر گھر میں چلا گزرا تو ہونے لگا توڑ سے دربان اور بدو بیامانے ان ہندوؤں کی مدد سے کھانے پینے کا انتظام کرنے کی کوشش میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ واضح ہو کہ اس بکڑ بکڑ اور قیامت کے عالم میں جس طرح ہر کوپے اور بازار میں اس مصیبت کی صورت یکساں نہیں ہے اسی طرح نقل کرنے اور لوٹ مار میں بھی کبھی سپاہیوں کا انداز ایک نہیں اگر کوئی رحم کرتا ہے یا دوسرا سختی کرتا ہے تو یہ ذاتی رحم دلی اور شگہ لی کا نتیجہ ہے۔

میں جانتا ہوں کہ اس بیخارا میں حکم یہ ہے کہ جو شخص اعتباراً طاعت کرنے سے نقل نہ کیا جائے مال جھین لیا جائے اور جو شخص مقابلہ کرے مال کے ساتھ ساتھ اس کی زندگی بھی جھین لی جائے۔ مقتولین کے متعلق یہ خیال ہے کہ انہوں نے یقیناً طاعت نہیں کی اس وجہ سے ان کو قتل کر دیا گیا۔ مشہور بھی یہی ہے کہ عموماً سامان لوٹ لیتے ہیں نقل نہیں کرتے۔ بہت کم ایسا ہوا ہے اور وہ بھی صرف وہ تین کوچوں میں کہ پہلے نقل کر دیا پھر سامان لوٹ لیا اہلست بوزمیں محروم اور بچوں کا قتل روا نہیں رکھا ہے۔

شہر کے بیشتر لوگوں کو باہر نکال دیا ہے۔ کچھ لوگ بدستور امید و حکم میں گرفتار (شہر کے اندر) موجود ہیں ان کے بارے میں ابھی کوئی حکم صادر نہیں ہوا۔ جو لوگ باہر نکل گئے ہیں یا جو لوگ شہر کے اندر جھپٹائے

پریشانی میں ان کے درد کا کوئی مداوا نہیں ہے۔ کاش اندر رہ جانے والے اور باہر جا بسنے والے ایک دوسرے کی زندگی دھوٹ سے واقف ہوتے کہ بے تابی وہ پریشانی نہ ہوتی۔ بس یہ جانا کافی ہے کہ جو جس جگہ ہے پریشان ہے۔ شجر کے اندر رہتے والے مجبور لوگ ہوں یا باہر کے پریشان حال سب کے دل درد سے بھرے ہوئے ہیں اور سب قتل عام کے خوف سے ہراساں ہیں۔

۱۵ اکتوبر کو پیر کا مصیبت آفرین دن تھا دوپہر کے وقت اچانک چٹک گورے اس دہلی پر چڑھ گئے جو بند کردہ دروازے سے ٹلی ہوئی ہے اور وہاں سے ایک جھٹ پر اور (جھٹ سے) کود کر گلی میں آ گئے۔ راجہ چند رینگھ کے سپاہیوں کا روکنا کچھ کارگر نہ ہوا۔ دوسرے جھوٹے جھوٹے مکانات کو نظر انداز کر کے راقم المعروف کے گھر میں گھس آئے۔ بھلی بانسی سے مسلمان کو ہاتھ نہیں لگا یا کچھ کو ان دونوں بچوں دو تین ملازمین اور چند نیک کردار پڑوسیوں کے ساتھ گلی سے دھڑلائی گئے۔ یہ کچھ زیادہ فاصلے پر حقیقت پسند دانشور کرل بددن کے پاس لے گئے جو چوک سے اس طرف قطب الدین سوادا گری خلی میں مقیم ہے۔ (کرل) نے مجھ سے بہت نرمی و انسانیت سے بات چیت کی۔ مجھ سے تمام درودوں سے پیشہ پچھا خوش اسلوبی کے ساتھ اسی وقت درخواست کر دی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور اس خوش اخلاق (کرل) کی تعریف کی اور گھر چلا آیا۔

واضح رہے کہ ابھی باغیوں کے بہت سے گروہ بریلی مغرب آ یا دارو لکھنؤ میں جگہ جگہ شورش پھیلانے اور بے فائدہ مقابلہ کرنے میں مصروف ہیں۔... اور سو نہ اور نواح کے علاقے میں میواتیوں نے بے طرح شورش پھیلا رکھی ہے جیسے دیوانے زنجیروں سے آزاد ہو گئے ہوں۔ ملارام نائی شورش پسند کچھ دن تک ریواڑی میں ہنگامہ دار باغی شیطانی کی رہنمائی سے میواتیوں کے ساتھ مل گیا۔ یہ گروہ میواتیوں اور پہاڑیوں میں حاکموں کے ساتھ برسر جنگ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کی سرزمین پر ہر طرف تیز آنے والے اور ہزرتی ہوئی آگ کے ہنگامے برپا ہیں۔

ان غم انگیز حالات میں جن کا آغاز یا نہیں ہے اور انجام معلوم نہیں رونے کے علاوہ کچھ دیکھا ہوتا آنکھوں کے روزن خاک سے بھر جائیں۔ روز سیاہ کے علاوہ اور کچھ ہے ہی نہیں جس کے متعلق کہوں کہ آنکھوں نے اسے دیکھا۔ اس سے قطع نظر کرتے ہوئے کہتا ہوں کہ روز سیاہ تو وہ چیز ہے جس کی تاریکی میں کچھ دیکھا ہی نہیں جاسکتا۔ جس دن گورے مجھ کو پکڑ کر لے گئے تھے اس دن کے علاوہ چوکٹ پر قدم رکھنا گھر سے باہر لکنا گلی یا بازار میں چلتا یا دور سے چوک کو دیکھ لینا نصیب نہیں ہوا ہے۔

اور یہ جو بادشاہ اور بادشاہ زادوں کے انجام کے متعلق میں نے کچھ نہیں لکھا (مالا لک) فتح

شہر کی داستان کے دیباچے کے طور پر لکھنا چاہئے تھا اس کی بھی یہی وجہ ہے کہ اس تحریر کے سلسلے میں میرا سارا سرمایہ سخن ہائے شہیدہ ہیں اور ابھی بغیر سنی ہوئی باتیں بہت ہیں، یقیناً جب اس جائے تنگ سے باہر نکلوں گا جو باتیں اب تک نہیں سنی ہیں اور دوسرے سے جمع کروں گا اور تب واقعہ کاروں کی طرح پیدائشی باتیں لکھوں گا۔

انہیں اکتوبر کو پھر کے دن نے جس کا نام پٹنے کے رجسٹر سے کاٹ دیا جانا چاہئے آتش فشاں بخود سے کی طرح دنیا کو اٹھل گیا۔ اس کے دن صبح کے وقت وہ کینٹ وربان بھائی کے مرنے کی خبر لے گیا تھا مگر قریباً دو گنا پانچ دن تیز بخار میں مبتلا رہا اور آدھی رات کے قریب اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ پانی، رو مال، غسال، مگر کنہ لٹھ، پوئے اور گارے وغیرہ کا ذکر چھوڑ دینا چاہئے کہ میں کیسے جاؤں اور میت کہاں لے جاؤں۔ کس قبرستان میں سپرد خاک کروں بازار میں اچھا برا کسی قسم کا کپڑا نہیں ملتا ہے۔ زمین کھودنے والے مزدور گویا کبھی شہر میں تھے ہی نہیں۔ ہندو اپنے مردوں کو دیا کے کنارے لے جا کر جلا سکتے ہیں مسلمانوں کی کیا مجال ہے کہ دو تین اٹھاس ساٹھ ساٹھ راستے سے گزریں چہ جائیکہ میت کو شہر سے باہر کہیں لے جائیں۔ پڑوسیوں نے میری تنہائی پر دم کیا اور اس کام کو انجام دینے کے لیے تیار ہوئے۔ پٹیا لے کے ایک سپاہی کو آگے کیا میرے دو نوکر ان کو ساتھ لیا اور چل دیئے۔ میت کو غسل دیا دو تین سفید چادریں یہاں سے لے گئے تھے ان میں لیٹا اور مسجد میں جو مکان کے برابر تھی زمین کھودی میت کو اس میں رکھ دیا اور اس گڑھے کو پاٹ کر لوٹ آئے۔ یہ ٹیک سرشت لیکن بد قسمت شخص جس نے زندگی کے ساتھ سال خوش و ناخوش گزارے تھے تیس سال ہوش مندی کے ساتھ اور تیس سال بے ہوشی کے عالم میں زمانہ ہوش مندی میں حصر ضبط کرنا اور عالم دیا لگی میں کسی کو تکلیف نہ پہنچانا جس کا شعار تھا نو مفر ۱۲۷۷ھ کی شب مر گیا ہے۔

(مرزا یوسف کی بیماری سے وفات کا ذکر غالب کی مصلحت پر ہندی کا ایک نمونہ ہے۔ وہ حقیقت ایسا نہیں تھا۔ مجرمین الدین حسن خان کے روزنامے میں ہے "مرزا اسد اللہ خان کے بھائی مرزا یوسف خان جو مدت دراز سے حالت جنون میں تھے گولیوں کا شورش کر لیا ایک باہر لٹکے اور مارے گئے)

جس پٹنے انگریزی فوج نے شہر کو فتح کیا اسی پٹنے کا مورخا دانشمند امین الدین احمد خان بہادر اور ضیاء الدین احمد خان بہادر نے حفظ وضع کی خاطر اور امید بہتری پر شہر چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا۔ ہوی پنجوں کے علاوہ تین تہائی اور چالیس کھوڑے ساتھ تھے۔ پرگنہ کو پار کا رخ کیا بھان کی آبائی جا کبیر ہے پہلے ہرولی گئے اور اس گورستان پر انوار میں قیام کیا۔ دو تین روز قیام کیا اسی دوران میں شیرے سپاہیوں نے قیام گاہ کو گھیر لیا جو کپڑے پہنے ہوئے تھے ان کے علاوہ سارا سامان چھین لیا اور چلے گئے... لوٹ مار کی مصیبت اٹھا کر بے سرو سامانی کے ساتھ دو جاؤں کی طرف روانہ ہو گئے۔

نیک کردار حسن علی خان بہادر نے ازراہ انسانیت و فیاضی ان کا استقبال کیا۔ صاحب کشتربہادر نے (حالات سے) واقف ہو کر اپنے پاس بلا لیا۔ (یہ لوگ) شہر میں آئے اور حاکم سے ملاقات کی تو اس نے یکدم وطن و تہذیب کی حسبِ نرم جواب دہا تو پھر یکے نہیں کہا، قلعہ کے اندر ایوانِ خانِ سامانی کے پہلو میں غمخیزنے کا حکم دیا۔ مسلسل کام کی رعایت کی وجہ سے اس خانہ خان کی چابی کی داستان نہیں لکھ سکا میں سمجھ کر میر دلی میں ان لوگوں کو لوٹا گیا اور دلی میں ان کے مکانات جہاں انکوں سے خالی تھے نذرِ رعنا نگر ہی ہوئے جو سامان یہ لوگ اپنے ساتھ لے گئے تھے گوٹ مار کرنے والوں کے حصے میں آیا اور جو سامان یہاں محلات میں تھا سب لٹ گیا اس بات میں پھر راقی رہ گئے۔

پچیس اکتوبر کی ۱۶ تاریخ قحطی اور سنجہ کا دن کہ یہ دونوں دانشندان کا دن (امین الدین احمد خان اور ضیاء الدین احمد خان) شہر میں آئے اور جہاں کہیں گئے کہا قلعہ میں قیام کیا۔ اس واقعہ کے دو تین دن بعد فوج کو حکم دیا گیا فوج لگی اور ہجیر کے حاکم عبدالرحمن کو بھروسہ کی طرح لائی قلعہ کے اندر ایک گوشے میں جس کو دیوان عام کہتے ہیں جگہ دی گئی اور ان کی ساری جاگیر انگریزی حکومت نے ضبط کر لی۔

۳۱ اکتوبر کو جھ کے دن فرخ نگر کے حاکم احمد علی خان کو اس طرح (گرفتار کر کے) لائے جیسے عبدالرحمن خان کو لائے تھے اور قلعہ دلی میں ایک جگہ ان کو ٹھہرایا گیا۔ فرخ نگر بھی تیز دست جاہ کاروں (انگریزوں) کا نکتہ بنا اور شہر والوں کا مال و اسباب لٹ گیا۔

۲ نومبر کو پھر کے دن دادری اور بہادر گڑھ کے حاکم بہادر جنگ خان گرفتار ہو کر آگئے اور قلعہ میں جہاں ٹھہرایا گیا ٹھہرے۔

۳ نومبر کو سنجہ کے روز راجا ناہر سنگھ حاکم بلب گڑھ کے آ جانے سے قلعہ میں دوسرا درجہ جو مختلف مقامات پر ایک دوسرے سے دُور مقیم تھے ان میں ایک کا اور اضافہ ہوا۔

یہ بات پوشیدہ نہیں رہے گی کہ مظفر الدولہ سیف الدین حیدر خان اور ذوالفقار الدین حیدر خان جن کا لقب حسین میرزا ہے اس ہنگامے میں دوسرے با عزت لوگوں کی طرح جی پی بچوں کے ساتھ شہر سے باہر چلے گئے جنہیں سامان سے بھرے ہوئے گھر چھوڑ دیے اور صحرا تو دی اختیار کی۔ ان لوگوں کے کئی مکانات نکل اور ایوان ہیں باہم متصل۔ اتنے وسیع اگر زمین کی پیمائش کی جائے تو شہر تک کسی ایک گاؤں کے برابر تو ہوگا۔ اسے بڑے محل اس عالم میں کہ ان میں کوئی آدمی تھا ہی نہیں لوٹ مار کرنے والوں کے ہاتھوں صاف اور دیرمان ہو گئے۔ کچھ کم قیمت اور بھاری سامان جیسے ایوان کے پردے، شامیانے، سائیکل، خط و کتابت اور دوسرا فرش ان قیام گاہوں میں باقی رہ گیا تھا۔ اچانک ایک رات جس صبح کو راجا ناہر سنگھ گرفتار ہوئے اس سامان میں آگ لگ گئی، لپٹیں اٹھنے لگیں، کھڑی پتھر باریں سب جل گئیں۔

شاہزادوں کے متعلق اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ بعض کو کوئی مادی کمی۔ سوت کے اڑو سے ان کو نگل لیا۔ کچھ کی گردن میں پھانسی کا پتلا اڑا دیا گیا۔

دین دار کی کشاکش سے ان کی روح غمگین تھی چند افسردہ دل قید خانے میں ہیں اور بعض (عالم فریت میں) آوارہ و پریشان پھر رہے ہیں۔ کزور و ضعیف بادشاہ پر مقدمہ چل رہا ہے۔ ہجرت طلب گزراور فرخ گھر کے جاگیرداروں کو علاحدہ علاحدہ مختلف دلوں میں پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ (انہیں) اس طرح ہلاک کیا گیا کہ کوئی کہہ نہیں سکتا کہ غول بہایا گیا۔

جنوری ۱۸۵۸ء کے آغاز میں ہندوؤں کو فرمان آزدی مل گیا اور (شہر میں) آباد ہونے کی اجازت دے دی گئی۔ یہ لوگ جہاں جہاں تھے شہر کی طرف چل پڑے خانقاہوں پر بادسلانوں کے گھروں میں (خالی پڑے رہنے کے سبب) سبزہ اس قدر آگ گیا ہے کہ درود پڑا سر ہنر ہیں۔

شاید بد خصلت مجرموں کے کہنے سے حاکم شہر کو یہ خیال ہوا ہوگا کہ راجہ نریندر سنگھ بہادر کے طبیعوں کا مکان مسلمانوں کی جائے پناہ اور مقبوض ہونے کی جگہ ہے۔ اس خیال سے دودھرو دی کو حاکم شہر کچھ سپاہیوں کے ساتھ اس جگہ آیا اور مکان کے مالکوں کو ساتھ دوسرے نیک دل پناہ گزینوں کے اپنے ہمراہ لے گیا۔ اگرچہ کئی رات دن تک حالات میں رکھا لیکن لوگوں کی عزت کا خیال رکھا۔

پانچ فردی کو جس کے دن حکیم محمود خان، حکیم مرتضیٰ خان اور ان کے بھائی عبدالکیم عرف حکیم کالے کو واپس کی اجازت مل گئی۔ بارہ فردی کو جس کے دن چند دوسرے اشخاص اور حیرہ فردی کو نیچر کے روز تین اور اشخاص واپس آئے پانچ نصف سے زیادہ حالات میں رہ گئے۔ یہ مصیبت جو پڑوس میں نازل ہوئی اور یہ ہنگامہ جو لگی میں برپا ہوا (اس کی وجہ سے) مجھ و بیش غم زدہ کا دل بھی ٹکا ہوا نہیں۔ اس کے باوجود اس دارمگیر میں مجھ سے کوئی تعرض نہیں کیا گیا اب تک یہ عالم ہے کہ دن بھر منتظر رہتا ہوں امداد میں آرام کی خبر نہیں سوناتا ہوں۔ کچھ فردی کو جب نیچر کا دن ختم ہوا امداد آئی امداد کے تین پھر گزر گئے (اس وقت) مظلوموں کے دل کا دھواں چاند نہ اس طرح چھا گیا کہ دیکھنے والے نے اختیار چلا دھمکے چاند گھن میں آ گیا۔ اسی نیچر کو حکم دیا ہوا ختم ہوئی افسانہ چاہئے والے اور پریشان حال لوگوں کو حاضر ہونے کی اجازت اور خواہشمندوں کو پناہ دے دی گئی۔

اس شہر میں قید خانہ شہر سے باہر ہے اور حالات اندرون شہر۔ ان دونوں میں بیشتر لوگوں کو بھر دیا گیا ہے۔ ایسا مظلوم ہوتا ہے کہ آ دی میں آ دی سویا جا رہا ہے۔ ان دونوں قید خانوں کے جن قیدیوں کو مختلف دلوں میں پھانسی دے دی گئی ہے ان کی تعداد فریضہ سوت ہی جانتا ہے۔ شہر میں ایک ہزار سے زیادہ مسلمان نہیں پاؤ گئے ہیں ان میں سے ایک ہوں۔ جو لوگ شہر سے نکل کر چلے گئے ہیں ان میں سے بہرہ لوگ اس قدر دزدانہ گئے ہیں کہ

وہ اس سرزمین کے باشندے تھے ہی نہیں۔ بہت سے عالی مرتبہ لوگ شہر کے ارد گرد وودھ چارکوں پر ٹیلوں، گڑھوں، چھبروں اور کچے مکانوں میں اپنے نصیب کی طرح آنکھیں بند کیے پڑے ہیں۔ اس ویرانہ ٹھکان گروہ میں یا تو وہ لوگ ہیں جو شہر میں رہنے کے خواہشمند ہیں یا گرفتار شدہ لوگوں کے درشت دار ہیں یا خیرات خوار یعنی فاقین دار ہیں لوگوں کی دو خواہستوں میں رہائی آبادی اور اجرائے فتنے کے علاوہ اور کوئی مضمون نہیں پاؤ گے۔ دادخواہوں کی دو تین ہزار درخواستیں عدالت میں پہنچ چکی ہیں انصاف طلب، چشم برہادر گوشہ دار، وار ہیں کہ کیا سنتے اور دیکھتے میں آتا ہے۔

اتحادہ مارچ کو جمع کے دن شام کے وقت روح کو قوائی بخشے والی صدائے توپ آسمان کے نیچے گنبد میں گونج اٹھی (جس سے) گنبد کا رخ ہوا اور اس شہر میں کینہ خواہانگریز کی فوج کا حسب دل خواہ پھیل جانا معلوم ہوا۔ اس شہر میں قلعہ فصیل دروازہ کچھ نہیں ہے یقیناً وہاں کے ہانپوں کی فوج کی دیوار اس طرف کے بہادروں کا راستہ روکے ہوئے ہوگی۔ جب وہ کمزور دیوار بہادروں کی کوششوں کی آندھی سے گر گئی ہوگی تو ہانپتین سوار اور پیادوں کے چلنے سے ہر راستے سے گرد و غبار بلند ہوا ہوگا۔

اپریل کے مہینے میں حکیم محمود خان کے ساتھ جو لوگ قید خانے میں باقی تھے رہا ہو گئے۔ ہر ایک نے اپنا راستہ لیا۔ وہ ڈار پرورد، صاف طینت (حکیم محمود خان) سارے رشتہ داروں، بیوی بچوں اور حشمتیوں کے ساتھ چپالے کی طرف چلا گیا۔

مئی کے شروع میں یہ خبر سننے کا فخر حاصل ہوا کہ سپاہ کینہ خواہ کے بہادروں نے مراد آباد فتح کر لیا جو بداندیش (ہانپوں) کی گزرگاہ تھا اور اس شہر کو انصاف سے آراستہ کرنے کے لیے عالی نسب سرچشمہ علم و دانش نواب یوسف علی خان بہادر کے حوالے کر دیا۔

ماہ جون کے گزرے ہوئے دنوں کی تعداد کے برابر بعد کی طرح گرجے والی توپیں (۲۱) کی آواز بلند ہوئی، جس نے دوستوں کے دلوں کو مسرت و شادمانی سے معمور کر دیا۔ گوالیار کا شہر فتح ہو جانے اور اس سنگین قلعے کے ہاتھ آنے کی خوشخبری۔

... یہ داستان یوں ہے کہ ہانپوں نے گوالیار پر قبضہ کر لیا۔ فرماں روئے گوالیار مہاراجہ جیلانی راجہ حکومت اور شہر دہنوں چھوڑ کر آگے چلے گئے اور انگریزوں سے مدد چاہی، امدادی فوج لے کر اپنے وطن کی طرف گئے اور فتح حاصل کی۔ ہانپوں نے بیگم بھاگ، ہر طرف سے گوالیار کا رخ کیا تھا یہاں ایسی جگہ تھام لی ہوئی۔

واقف الحروف کی زندگی کے قریب نصف سال گزر چکے ہیں۔ ان طرح طرح کے روح فرساتوں کے سبب سے ظاہر ہے کہ اب زمانے سے اور زیادہ فرصت کی توقع بے جا ہے۔۔۔ فی الحقیقت یہی بات کو چھپانا اچھے لوگوں کا طریقہ نہیں ہے۔۔۔ میں نیم مسلمان مذہبی پابندیوں سے آزاد ہوں اور بدنامی و رسوائی کے رنج سے بے نیاز ہمیشہ سے رات میں صرف دلائی شراب پینے کی عادت تھی۔ دلائی شراب نہیں ملتی تھی تو تیندے نہیں آتی تھی۔ آج کل جبکہ انگریزی شراب شہر میں بہت منگنی ہے اور میں بالکل مفلس ہوں، اگر خدا دوست خدا شناس فاضل اور دیالوگ بخش داس دلی شراب قدر رنگ میں دلائی شراب کے برابر اور دے میں اس سے بڑا کر ہے، بھیج کر آتش دل کو سرد نہ کرتے تو میں زندہ نہیں رہتا، اسی عالم فکر عقلی میں مر جاتا۔۔۔

جب یہ داستان دوستوں کے ہاتھوں میں آئے تو وہ سمجھ لیں کہ شہر مسلمانوں سے غالی ہے۔ راتوں کو ان لوگوں کے گھر جانوں سے محروم رہتے ہیں اور دن میں دیواروں کے دروازوں دھویں سے۔ غالب جس کے شہر میں ہزاروں دوست تھے، اب گھر میں ششما اور واقف کا موجود تھے اس تنہائی میں قلم کے سوا کوئی اس کا ہم زبان اور اپنے سامنے کے علاوہ کوئی ساتھی نہیں ہے۔

اس لوٹ مار میں جبکہ شہر میں کسی گھر میں ملتی بھی نہیں پتی، اگرچہ میرا گھر لوٹ مار کرنے والوں کی ورادہ تھی سے مخلوط رہا، لیکن میں قسم کھا سکتا ہوں کہ بستر اور پینے کے کپڑوں کے علاوہ گھر میں کچھ نہیں رہا، اس عقدہ دشوار کا حل اور اس دروغ نفاق کی حقیقت یہ ہے کہ جس وقت کالوں نے شہر پر قبضہ کیا، بیگم نے مجھ سے کہے بغیر قیمتی چیزیں زبرد و غیرہ جو کچھ تھا، خفیہ طور پر کالے صاحب چور زلہ کے یہاں بھیج دیا، وہاں تہ خانے میں محفوظ کر دیا گیا اور دروازہ مٹی سے پات دیا گیا۔ جب قاتل لشکر نے شہر فتح کیا اور سپاہ کو لوٹ مار کا حکم مل گیا، جب بیگم نے پیدا کر مجھ سے کہا۔ وقت نکل چکا تھا، وہاں تک جانے اور سامان لانے کی کوئی گنجائش شدیدی تھی، میں خاموش ہو گیا اور دل کو سمجھا لیا کہ یہ چیزیں جانے والی ہی تھیں، اچھا ہوا کہ میرے گھر سے نہیں نکلیں۔

اب یہ جولائی کا چہرہ ہوا، مہینہ ہے، قہریم بخش جو سرکار انگریزی سے ملتی تھی، اس کے ملنے کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ بستر اور کپڑے بچ بچ کر زندگی گزار رہا ہوں۔ گویا دوسرے لوگ روٹی کھاتے ہیں، میں کپڑے کھاتا ہوں۔ ڈرتا ہوں کہ جب کپڑے کھالوں گا، عالم برہنگی میں بھوک سے مر جاؤں گا۔

مئی سال گزشتہ سے لے کر جولائی ۱۸۵۸ء تک کی روداد میں نے لکھی ہے، یکم اگست سے قہم ہاتھ سے رکھ دیا ہے۔ کاش! میری ان تین خواہشوں، یعنی خطاب خلعت اور بخش کے اجراء کا حکم شہنشاہ، فیروز و بخت کے حضور سے آجائے، جن کے حقائق میں نے اس تحریر میں بھی لکھا ہے۔

خدا اور مایہ نادر کی دلی کا تکرہ مخلوط غالب میں

”فہم مرگ میں قلم نامہ پارک سے قطع نظر کہ اہل شیر کو لگتا ہوں مظفر اللہ کا میر ناصر اللہ بن مرزا کا شور یک میرا بھائی تھا اس کا بیٹا احمد میرزا انھیں برس کا چھ مصلطفی خان ابن اعظم اللہ بن اس کے دو بیٹے اور قسطنطنیہ خان کا خلیفہ فیض اللہ کیا میں ان کو اپنے عزیزوں کے برابر نہیں جانتا تھا اے کو بہول کیا حکیم رضی اللہ عنہ میرزا خان احمد حسین بیکش اللہ اللہ ان کو کہاں سے لاؤں فہم فراق حسین میرزا میر مہدی سید سرفراز حسین میرزا صاحب خدائیں کو بھرتا رکھے کاش ایسے ہوتا کہ جہاں ہوتے وہاں خوش ہوتے گھر ان کے بے چارے وہ خود دادہ۔ سہارا اور اکبر کے حال کا جب تصور کرتا ہوں کلیجہ ٹکڑے ٹکڑے ہوتا ہے کہنے کو ہر کوئی ایسا کہہ سکتا ہے؟ مگر میں علی کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ ان اسموات کے فہم میں اور تعدادوں کے فراق میں عالم میری نظر میں حیرت انگیز ہے۔

(۲۶ نومبر ۱۸۵۹ء، نظام ایسٹ میرزا)

کل تہارے خط میں دو بار یہ لکھ مرقوم دیکھا کہ دلی بڑا شہر ہے ہر قسم کے آدمی وہاں بہت ہیں گے۔ اے میری جان ایسے وہ دلی نہیں جس میں تم پیدا ہوئے وہ دلی نہیں جس میں تم شعبان یک کی کوہلی میں مجھ سے چنے آ کر رہتے تھے۔ وہ دلی نہیں جہاں میں اکبر ان برس سے مقیم ہیں۔

ایکے ایک ہے مسلمان اہل حرفہ یا حکام کے شاگرد پیشہ ہاتی سراسر خود معزول بادشاہ کے ذکور جو جزیہ السیف ہیں وہ پانچ پانچ روپے مہینہ پاتے ہیں۔ اثاثہ میں سے جو چیزیں ہیں کتیاں اور جو جملان ہیں کسبیاں۔ امرائے اسلام میں سے اسموات گزشتہ حسن علی خان بہت بڑے باپ کا بیٹا سو روپے روز کا فاشن دوسو روپے مہینہ کار وازینہ خوار بن کر ناصر اللہ مرگیا۔ میر نصیر اللہ بن باپ کی طرف سے میرزا دادہ دادہ اور غانی کی طرف سے امیر زادہ مظہر مارا گیا۔ آغا سلطان بخشی محمد علی خان کا بیٹا خود بھی بخشی ہو چکا ہے پیارے اندوہات خدا انہما کار مرگیا۔ تمہارے بچے کی سرکار کی طرف سے تجھ کو بخشین ہوئی۔... قصہ کو توہ خلع اور بھرا اور بھرا گڑھا اور بلب گڑھا اور فرخ گڑگرم دیشی تیس لاکھ روپے کی رہائشیں مل گئیں۔ ہر مصلحت دلی یہاں کیوں پایا جائے۔

(نظام علامہ اللہ بن احمد خان علانی فروری ۱۸۶۳ء)

ہے ہے کیوں کر نکھوں؟ حکیم رضی اللہ عنہ خان کو قتل عام میں ایک خاکی نے گولی مار دی اور احمد حسین خان ان کے چھوٹے بھائی اسی دن مارے گئے۔ طالع پارخان کے دو بیٹے رخصت لے کر آئے تھے خدہ کے سبب نہ جاسکے۔ یہیں رہے بعد فتح دہلی دونوں بے گناہوں کو چھائی ملی۔ طالع پارخان نوک میں زخمہ جیسا پتھن ہے کہ مروے سے دتر ہوں گے۔ میر چوٹم نے بھی چھائی پائی۔

(۱۸۶۰ء، نظام انوار اللہ شاہ شفق)

حضرت انہما سامکن و مساجد میں کیا حال گزارش کروں؟ ہائی شیر کوہ اندام مکانات کے بنانے

میں نہ ہوگا جواب والہان ملک کو ڈھانے میں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو اور شہر میں بعض بعض دو شاہجہانی عمارتیں ڈھانے لگی ہیں کہ کدال ٹوٹ ٹوٹ گئے ہیں بلکہ تھلے میں تو ان آلات سے کام نہ لکھا سرنگیں کھودی گئیں بارود بچھائی گئی اور مکانات تکسین اڑا دیئے گئے۔

(۱۸۶۰ء مہنامہ انوار الدولہ صفحہ ۱۰)

روز اس شہر میں ایک حکم نیا ہوتا ہے
کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ کیا ہوتا ہے

میرٹھ سے آ کر دیکھا یہاں بڑی شدت ہے اور یہ حالت ہے کہ گوروں کی پاسپاتی پر قامت نہیں ہے۔ لاہوری دروازے کا قانیہ رموٹ حاسا بچھا کر سوک پر چڑھتا ہے جو باہر سے گورے کی آنکھ بچا کر آتا ہے اس کو کچھ کحوالات میں بھیج دیتا ہے۔ حاکم کے ہاں سے پانچ پانچ ہینڈ گنتے ہیں یا دورو ہے جرمانڈ لیا جاتا ہے۔ آٹھون قید رہتا ہے۔ اس کے علاوہ سب قانوں پر حکم ہے کہ دریافت کرو کہ کون بے گنت مقیم ہے اور کون گنت رکھتا ہے۔ کل سے یہ حکم ملا کہ یہ لوگ شہر سے باہر مکان دوکان کیوں بناتے ہیں؟ جو مکان بنا چکے ہیں انہیں ڈھادادوراً تھکرو کی مسامتت کا حکم بنا دو۔

(۲ فروری ۱۸۵۹ء سید مرزا حسین)

خداوند نعمت کیا قسم دلی کو آ بار اور تھکرو کو معذور اور سلطنت کو بدستور رکھے ہوئے ہو جو حضرت شیخ کا کلام اور صاحبزادہ قطب الدین ابن سلا کا فقر الدین رحمت اللہ علیہ کا حال پوچھتے ہو؟ اس دفتر کا دو خوردگاہ کا قصاب مرد قصاب در راہ مرد۔ بادشاہ کے دم تک یہ باتیں تھیں۔ خود میاں کالے صاحب کا گھر اس طرح جاہ ہوا کہ جیسے بھاڑوی کا تھکا پر فراسوئے کا تار تھینے کا بال باقی نہ رہا۔ شیخ کلیم اللہ جہاں آبادی علیہ الرحمہ کا مقبرہ جڑ گیا۔ ایک اچھے گاؤں کی آبادی حتیٰ کن کی لولا کے تمام لوگ اس موضع میں سکونت پزیر تھے۔ اب ایک جنگل ہے اور میدان میں قبر اس کے ساتھ کھڑی ہیں۔ وہاں کے رہنے والے اگر گولی سے پہنچے ہوں تو خدا ہی جانتا ہوگا کہ کہاں ہیں۔

(کلیم نمبر ۱۸۶۳ء سید احمد حسن سورودی)

جناب مولوی صدر الدین صاحب بہت دن حوالات میں رہے کورٹ میں مقدمہ پیش ہوا روکاریاں ہوئیں آخر صاحبان کورٹ نے جان بخشی کا حکم دیا تو کوری موقوف جائیداد ضبط ناجا رختہ و جاہلا ہو کر گئے۔ قاضی کشر اور لیفٹیننٹ گورنر نے الزام و ترم نصف جائیداد و انکراشت کی اب نصف جائیداد پر قابض ہیں اپنی حوصلی میں رہتے ہیں گرانے پر معاش کا دار و مدار ہے۔

(۱۹ فروری ۱۸۶۰ء سید احمد حسن سورودی)

مولانا (فضل حق خیر آبادی) کا حال کچھ تم سے کچھ کو معلوم ہوا کچھ تم مجھ سے معلوم کرنا مراغہ میں حکم وہ ام جس پر قرار دیا تاکید ہوئی کہ جلد دریا کے شہر کی طرف روانہ کرنا چنانچہ تم کو معلوم ہو جائے گا ان کا بیٹا ولایت میں پہنچ گیا چاہتا ہے کیا ہوتا ہے جو ہوتا تھا سو گیا۔ انا شدہ وانا الیہ راجعون۔

(جون ۱۸۵۸ء، نام یوسف میرزا)

ہاں خان صاحب! آپ جو لکھتے پہنچے ہو اور سب صاحبوں سے ملے ہو تو مولوی فضل حق کا حال ابھی طرح دریافت کر کے مجھ کو لکھو کہ اس نے رہائی کیوں نہ پائی اور وہاں جرمے میں اس کا کیا حال ہے۔ گزرا اس طرح ہوتا ہے۔

(نام میاں داد خان سیاح، ۱۲ اکتوبر ۱۸۶۱ء)

ایک لطیفہ پرسوں کا سنا! حافظ موبے گناہ ثابت ہو چکے رہائی پا چکے حاکم کے سامنے حاضر ہوا کرتے ہیں اٹاک اپنی مانگتے ہیں قبض و تصرف ان کا ثابت ہو چکا صرف حکم کی دہ۔ پرسوں وہ حاضر ہوئے مثل بخش ہوئی حاکم نے پوچھا حافظ محمد بخش کون؟ عرض کیا میں ابھر پوچھا حافظ مومون؟ عرض کیا کہ اصل نام میر احمد بخش مومن مشہور ہوں۔ فرمایا یہ کچھ بات نہیں۔ حافظ محمد بخش بھی تم؟ حافظ مومون بھی تم؟ جو دیا میں ہے وہ بھی تم؟ ہم مکان کس کو دیں؟ مثل داخل دفتر ہوئی بھائی مواپنے کمر چلے آئے۔

(جون ۱۸۵۹ء، نواب میرزا یوسف)

ایک ٹھکر لاہور میں معاوضہ نقصان رعایا کے واسطے تجویز ہوا ہے اور یہ حکم ہے کہ جو رعیت کا مال کالوں نے لوٹا ہے البتہ اس کا معاوضہ بہ حساب وہ ایک سرکار سے ہوگا یعنی ہزار روپے مانگتے والے کو سو روپے ملیں گے اور جو کوروں کے وقت کی غارت گری ہے وہ ہزار روپے ملے گا اس کا معاوضہ ہوگا۔

(۳ دسمبر ۱۸۵۹ء، حسین میرزا)

حکم ہوا کہ دو شنبہ کے دن پہلی تاریخ نومبر کو رات کے وقت سب خیر خواہان انگریز اپنے اپنے گھر میں روشنی کریں اور بازاروں میں اور صاحب و پتی کشن بھادری کوٹھی پر بھی روشنی ہوگی۔ فقیر بھی اس جی دہتی میں کاغذ ہر سینے سے پٹن مقرر کی نہیں پاتا اپنے مکان پر روشنی کرے گا۔

(نام شیونرائن آ رام نومبر ۱۸۵۹ء)

یہاں پہلی نومبر کو بدھ کے دن حسب انکم حکام کو چہ و بازار میں روشنی ہوئی اور شب کو کچھ کاٹھیک

نوٹ جاتا اور قلمرو ہند کا بادشاہی محل میں آگایا گیا۔ نواب گورنر جنرل لارڈ کنگ بہادر کو ملکہ معظمہ انگلستان نے فرزند ارشد کا خطاب دیا اور اپنی طرف سے نائب اور ہندوستان کا حاکم کیا۔

(جمعہ ۵ نومبر ۱۸۵۹ء انوار المذہب شفق)

کبھی صاحبزادوں کی ہی بات کرتے ہو۔ دلی کو دیہاتی آباد جانتے ہو جیسے؟ تھی؟ حاکم خان کی گلی میر خیراتی کے چھاگ سے فتح اللہ خان بیگ کے چھاگ تک بے چراغ ہے۔ ہاں اگر آباؤی ہے تو یہ ہے کہ غلام حسین خان کی حویلی ہسپتال ہے اور ضیاء الدین خان کے کمرے میں ڈاکٹر صاحب رہتے ہیں اور کالے صاحب کے مکانوں میں ایک اور صاحب حالی شان انگلستان تشریف رکھتے ہیں۔ ضیاء الدین خان اور ان کے بھائی مع قبائل و عشائر لوہارو میں ہیں۔ لال کوئیں کے محلے میں خاک اڑتی ہے نگہیں کی دکان پر کتے لٹختے ہیں۔

(۱۸۵۸ء نیلام مولوی عزیز الدین خان)

دلی کا حال تو یہ ہے:

گھر میں تھا کیا کہ تراغم اسے عارت کرتا
وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرتِ قیبر سو ہے

یہاں دھماکا کیا ہے جو کوئی لوٹے گا وہ خبر محض غلط ہے اگرچہ کہ ہے تو بدی منہ ہے کہ چند روز گوروں نے اہل بازار کو ستایا تھا۔ اہل قلم اور اہل فوج نے بافتاق ہمد گردایا ہندو بست کیا کہ وہ فساد مٹ گیا اب امن و امان ہے۔

(۱۸۵۹ء)

کئی لشکروں کا حملہ ہے ورپے اسی شہر پر ہوا پہلا پانیوں کا لشکر اس میں اہل شہر کا اعتبار لٹا۔ دوسرا لشکر حاکموں کا اس میں جان و مال و ناموس مکان و مکین و آسان و زمین و آمار دستی سر اسٹ گئے۔

(۱۸۶۰ء انوار المذہب شفق)

اس باب کے تمام تراغہا سب غلطوٹ غالب مرچ غلام رسول مرچ مطبوعہ (شیخ غلام علی ایڈیٹر سنز

لاہور) اور ”دھند“ مصنفہ مرزا سعد اللہ خان غالب ترجمہ رشید حسن خان سے لیے گئے ہیں۔

آہ غالب بمرود

”(حضرت) نظام الدین اولیاء کے مزار کے مرکزی دروازے کے قریب ایک چھوٹا سا قبرستان ہے جس میں چند سادہ ہی قبریں ہیں۔ ان میں سے ایک شاعر غالب کی ہے۔ اس پر ایک فارسی کتبہ ہے جو آپ خود جا کر پڑھیں۔ تمام عظیم لوگوں کو بڑے بڑے مقابر نصیب نہیں ہوتے۔ اس چتر کی سادہ سی لوح کے نیچے دلی کے عظیم فرزندوں میں سے ایک فرزند کی باقیات مدفون ہیں۔ غالب انیسویں صدی کے سب سے بڑے اردو شاعر تھے۔ وہ بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے دوست اور شاعر و پارذوقی کے حریف تھے۔ اس چتر کے سامنے احقر نامہ سرجمکا کر کھڑے ہو جائے کیونکہ یہاں اردو کا شہسپہنژا دی نیند سورا ہے۔“

¹ T.G.P. Spears

اگرچہ غالب نے ۱۸۶۷ء میں جرم قمار بازی میں قید کائنات کے بعد لکھا تھا: ”چاہتا ہوں کتاب دنیا میں نہ ہوں اور اگر ہوں تو ہندوستان میں نہ ہوں۔“ اور پھر یہ بھی فرمایا تھا کہ:

ہے اب اس معبودے میں قلعہ غم الفت اسد

ہم نے یہ مانا کہ دلی میں رہیں کھائیں گے کیا

لیکن انہیں ہندوستان میں اور دلی ہی میں مزید بائیس سال کا نئے چنے۔ اس دوران انہوں نے دو ایک سطر رام پور کے ضرور کئے جہاں ان کی قدر دانی ہوتی تھی لیکن اپنے حریف ذوقی کے قول کے مطابق دلی کی گلیاں نہ چھوڑ سکتے یہاں تک کہ وہ بائیس آ پہنچا۔

بقول حالی آخری دنوں میں یہ شعر زباں پر دبا کرتا تھا:²

دم دانیس بر سر راہ ہے

عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے

انہی دنوں کی حالت زار حبیب اللہ ذکا کے نام ایک خط میں بیان کرتے ہیں:

”زینتین دشوار اس صبیحے یعنی رجب کی آفتوں کا رخ سے بھرتا ہوا برسی شروع ہوا۔ خدا صبح کو

ہوں بھی نہیں گھسنے دیتا۔ اس نگارش کی شہرت سے مقصود یہ ہے کہ میرے احباب میرے حال سے اطلاع پائیں۔ اگر خط کا جواب یا اصلاحی نزل دیر میں پہنچے تو تھا خدا اور اگر نہ پہنچے تو شکایت نہ فرمائیں۔ میں دوستوں کی خدمت گزاری میں کبھی قصور نہیں رہا اور خوش طبع خودی سے کام کرتا رہا۔ جب بالکل ٹھکا ہو گیا نہ جو اس باقی نہ طاقت بھر اب کیا کروں بقول خواجہ دہریہ:

میں وفا کرتا ہوں لیکن دل وفا کرتا نہیں

اگر کسی صاحب کو میری طرف سے کچھ رنج و ملال ہو تو خالصتاً لفظ مانگیں گے۔ اگر حیران ہوتا تو احباب سے دعائے صحت کا طلبگار ہوتا۔ اب جو یوڑھا ہوں تو دعائے مغفرت کا خواہاں ہوں۔۔۔۔۔
غالبؒ

مولانا حالی لکھتے ہیں:

”مرنے سے چند روز پہلے بے ہوش طاری ہو گئی تھی۔ پھر پھر دو دو پھر کے بعد چند منٹ کے لیے افاقہ ہو جاتا تھا۔ جس روز انتقال ہوا اس سے شاید ایک دن پہلے میں ان کی عیادت کو گیا تھا اس وقت کئی پھر کے بعد افاقہ ہوا تھا اور نواب علاؤ الدین احمد خان مرحوم کے خط کا جواب لکھوا رہے تھے۔ انہوں نے نو بارہ سے حال پوچھا تھا۔ اس کے جواب میں ایک فقرہ اور ایک قاری شعر جو غالباً سہی کا تھا لکھوا یا۔ فقرہ یہ تھا کہ ”میرا حال مجھ سے کیا پوچھتے ہو ایک آدھ روز میں ہمایوں سے پوچھنا“ اور شعر کا پہلا مصرع مجھے یاد نہیں رہا دوسرا مصرع یہ تھا:

مگر دہر ہمارا بمن سر تو سلام

مرنے سے پہلے اکثر یہ شعر روزِ بیاں رہتا تھا:

دم واپائیں برسرِ راہ ہے

عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے

آخر ذیقعد ۱۲۸۵ھ کی دوسری اور فروری ۱۸۶۹ء کی چند ہویں کو تتر برس اور چار سینے کی عمر میں دنیا سے رحلت کی اور دہگاہ حضرت نظام الدین قدس سرہ میں اپنے خسر کے پائیں حزار دفن کیے گئے۔ ”آء غالب برز اس تاریخ وفات میں کئی حضرات کو قرار دیا۔

میر مہدی مجروح نے لکھا:

کیوں نہ دیران ہو دیارِ سخن	مر گیا آج تاجدارِ سخن
ہلہل خوش ترانہ معنی	مکل رنگین و شاخدارِ سخن
حلق بند حدیقہ مضمون	چارگی بخش کالہ زارِ سخن
عمرِ نظم کیوں نہ ہو دیران	ہے عیاں سخن دو شہسوارِ سخن

کیوں نہ حرفوں کا ہو لباس سیاہ ہے ظم مرگب شہریارِ سخن
 ساتھ ان کے مکی سخنِ نخی ان کا مرقہ ہی ہے مزارِ سخن
 آبیاری تھی جس سے وہ نہ رہا اب غزاں ہو مکی بہارِ سخن
 نقدِ ہزارِ بیاں کہاں وہی اب یہ نالہ ہائے زارِ سخن
 دھک مرنے و نخرِ غالبِ مرد اسد اللہ خان غالبِ مرد^۹
 فنی ہر گاہاں تشوئے لکھا:

غالب وہ شخص تھا ہمہ دامن جس کے فیض سے
 ہم سے ہزار نیچدماں نامور ہوئے
 فیض و کمال و صدق و وفا اور حسن و عشق
 چہ لفظ اس کے مرنے سے بے پایاں ہوئے^۹
 خدائے سخن میر پر علی انفس نے یوں خراجِ عقیدت پیش کیا:

گلزارِ جہاں سے بارخِ جنت میں گئے
 مرحوم ہوئے جو رحمت میں گئے
 عراجِ علی کا مرجہ اعلیٰ ہے
 غالب اسد اللہ کی خدمت میں گئے^{۱۰}
 مرزا حاتم علی بیگ مرنے یوں تاریخ لکھی:

شاعر	رند	حضور	غفار
لہ	الحمد	گرمای	آہ
گفت	ہاتف	پے	تاریخ
بجائیں	غالب	بائی	آہ ^{۱۱}

میر شکوہ آبادی نے لکھا:

آں غالب دہلوی حکیم دہاں سلطانِ سخن غلامِ آلِ نصیب
 در ظم و زبانِ قاری بائی اور در نثر بہ مسندِ اقادات کہیں
 برداشتِ رحمتِ ازلی سرائے فانی با رتِ برساتش بفرودیں بریں
 دنیا مست سے بدیدۂ الِ سخن در برجِ لہ چہ رفت آں مر میں
 تاریخِ وقایع او چہیں گفتِ ضمیر آہِ امجد عصر و حیفِ جانی حزیں^{۱۲}

حوالہ جات

1- Delhi its Monument and History spear

2- یادگار غالب از الطاف حسین حالی

3- خطوط غالب مرتبہ غلام رسول مہر

4- فسانہ عجائب از مالک رام

5- خطوط غالب مرتبہ غلام رسول مہر

6- مجموعہ نثر غالب مرتبہ ضیاء الرحمن داؤدی

7- یادگار غالب از الطاف حسین حالی

8- غالبیات کے چند فراموش شدہ گوشے از ڈاکٹر اکبر حیدری

9- علامہ غالب از مالک رام

10- غالبیات کے چند فراموش شدہ گوشے از ڈاکٹر اکبر حیدری

11- ایضاً

12- کلیات منیر غالبیات از اکبر حیدری

کتابیات

- 1- دیوانی غالب - نسو طاہر - سنگ میل پبلی کیشنز لاہور۔
- 2- دیوانی غالب - نسو حمید یہ - مجلس ترقی ادب لاہور۔
- 3- گل رحمتا - مرزا غالب - تحقیق سید دوزیر الحسن عابدی - پنجاب یونیورسٹی لاہور 1969ء۔
- 4- سہد یحییٰ - مرزا اسد اللہ غالب - تحقیق سید دوزیر الحسن عابدی - پنجاب یونیورسٹی لاہور 1969ء۔
- 5- دشنبہ - مرزا غالب - اردو ترجمہ رشید حسن خان (رسالہ اردوئے معلیٰ - دہلی 1961ء)۔
- 6- قادر نامہ غالب - مرزا اسد اللہ خان غالب - پنجاب یونیورسٹی لاہور 1969ء۔
- 7- مہر فیروز - میرزا غالب - ترجمہ پروفسر سید عبد الرشید فاضل - انجمن ترقی اردو کراچی۔
- 8- مجموعہ نثر غالب - غلیل الرحمن داؤدی - مجلس ترقی ادب لاہور۔
- 9- خطوط غالب - مرتبہ قلام رسول مہر - شیخ قلام علی ایڈ سنز لاہور۔
- 10- نامہ ہائے قاری غالب - ترجمہ پرویز درویش - ادارہ یادگار غالب کراچی۔
- 11- غالب کی نادر تحریریں - مرتبہ غلیق انجم - مکتبہ شاہراہ دہلی۔
- 12- انشائے غالب - مرتبہ رشید حسن خان - ادارہ یادگار غالب کراچی۔
- 13- اردوئے معلیٰ - مرزا غالب - تحقیق سید مرتضیٰ حسین فاضل - مجلس ترقی ادب لاہور۔
- 14- عود ہندی - مرزا غالب - تحقیق سید مرتضیٰ حسین فاضل - مجلس ترقی ادب لاہور۔
- 15- یادگار غالب - مولانا الطاف حسین حالی - خزینہ عظیم راوی لاہور۔
- 16- فرسانہ غالب - بانک رام - مکتبہ شعرادب لاہور۔
- 17- ملاحۃ غالب - بانک رام - مکتبہ جاموہ لٹریچر دہلی۔
- 18- غالب و دکن خانہ - کالی داس گپتا رضا - ساکار پبلشرز بمبئی۔
- 19- پنج آہنگ - مرزا اسد اللہ خان غالب - مجلس یادگار غالب لاہور۔
- 20- حیات غالب - شیخ محمد اکرام - ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور۔

- 21- مرزا غالب - خیالیا پری گارجا - ترجمہ محمد اسامہ فاروقی - مکتبہ انبیال کراچی۔
- 22- غالبیات کے چند فراموش گوشے - ڈاکٹر اکبر حیدری - ادارہ یادگار غالب کراچی۔
- 23- غالب کون ہے؟ شریف الحسن - نگارشات لاہور۔
- 24- خیالیا غالب - تادم بیٹا پوری۔
- 25- اوراقِ معانی ترجمہ خطوطِ قاری مشعل شیخ آجک - محبوب احمد علوی - اردو اکادمی دہلی۔
- 26- شعر النجم فی الہند - شیخ اکرام الحق - لا اکرام لشتر روزِ سلطان 1941ء۔
- 27- نگارشات غالب - ترجمہ تادم ہائے غالب - لطیف انور خان - دانیال کراچی۔
- 28- نقوش - غالب نمبر 1984ء - ادارہ فروغِ اردو لاہور۔
- 29- راوی - غالب نمبر جنوری 1998ء - گورنمنٹ کالج لاہور۔
- 30- نقدِ برہان قاطع مع حاتم - پروفیسر نذیر احمد - غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی۔
- 31- تلاشِ غالب - پروفیسر نذیر احمد فاروقی - غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی۔
- 32- اردو نثر کا تنقیدی مطالعہ - ڈاکٹر کنیل نگار - دارالانوار۔
- 33- تاریخِ ادبِ اردو - رام بابو سکیت - ترجمہ مرزا احمد مسکری - مطبع نوکلنور لکھنؤ۔
- 34- حیاتِ جاوید - مولانا الطاف حسین حالی - سنگ میل پبلی کیشنز لاہور۔
- 35- خطوطِ غلام سرسید - مولانا محمد اسماعیل پانی پتی - مجلس ترقیِ ادب لاہور۔
- 36- ابن الوقت - مصنفہ فریثی نذیر احمد - مجلس ترقیِ ادب لاہور۔
- 37- تحقیقِ غالب - ڈاکٹر سید یحییٰ الرحمن - مکتبہ عالیہ لاہور۔
- 38- محمد حسین آزاد (احوال و آثار) - ڈاکٹر محمد صادق۔
- 39- مرحوم دہلی کالج - مولوی عہد الحق - انجمن ترقیِ ہند دہلی۔
- 40- سیر المنازل - مرزا گلشن بیگ - ترجمہ ڈاکٹر شریف حسین قاسمی - دہلی یونیورسٹی۔
- 41- تفریحِ دہلی - اے این ایم - نواب قزلباش - مقلدہ اشرفیت فیض آباد پوہلی۔
- 42- لال تلکد کی ایک جھلک - خواجہ سید ناصر نذیر فریق دہلی - اردو اکادمی دہلی۔
- 43- بزمِ آخر - فشی فیض الدین - اردو اکادمی دہلی۔
- 44- بہادر شاہ ظفر - اسلم پرویز - اردو اکادمی دہلی۔
- 45- بہادر شاہ ظفر کے شبِ دروز - ضیاء الدین لاہوری۔
- 46- داستانِ غدر - قائم الدولہ ظہیر دہلوی۔
- 47- اجڑا دیار - شاہد احمد دہلوی - مکتبہ دانیال کراچی۔

- 48- چراغ دہلی۔ مرزا حیرت دہلوی۔ کرزن پریس دہلی۔
- 49- دلی قیام جس کا نام۔ انگار حسین۔ سنگ میل پبلی کیشنز لاہور۔
- 50- سوانح دہلی۔ شہزادہ مرزا احمد اختر گورگانی۔ اردو اکاڈمی دہلی۔
- 51- آخری عہد مغلیہ کا ہندوستان۔ ڈاکٹر مبارک علی۔ گلشن ہاؤس لاہور۔
- 52- قلعہ معنی کی جھلکیاں۔ عرش تیموری۔ اردو اکاڈمی دہلی۔
- 53- فرہنگ آصفیہ۔ مولوی سید احمد دہلوی۔ سنگ میل پبلی کیشنز لاہور۔
- 54- رسوم دہلی۔ مولوی سید احمد دہلوی۔ اردو اکاڈمی دہلی۔
- 55- طاق نسایں۔ شاہد احمد دہلوی۔ اردو اکاڈمی بہاول پور۔
- 56- اردو ہندی ایک تاریخی جائزہ۔ جاوید اختر بھٹی۔ دارالکتاب لاہور۔
- 57- جنگ آزادی 1857ء کے دو خلیفہ روزنامے۔ محسن الدین حسن خان دہلیوالہ لال۔ تخلیقات لاہور۔
- 58- میرے زمانے کی دلی۔ ملا واسطی۔
- 59- آثارِ اہلناویہ۔ سر سید احمد خان۔ 3 جلد، مرتبہ خلیفہ الخیم مطبوعہ دہلی۔
- 60- سفرنامہ ہند۔ پروفیسر محمد اسلم۔ ریاض برادرز لاہور۔
- 61- برطانوی رائج ایک تجزیہ۔ ڈاکٹر مبارک علی۔ گلشن ہاؤس لاہور۔
- 62- کلیات اقبال (اردو) سنگ میل پبلی کیشنز لاہور۔
- 63- Delhi, Its Monuments and History. p. Spear. Oxford, Delhi
- 64- Twilight of Mughals. Percival Spear. Oxford.
- 65- Delhi Through the Ages. R.E. Frykenberg .
- 66- Delhi between two Empires. Narayani Gupta.
- 67- Ghalib. Ralf Russell. Oxford, Delhi.
- 68- اردو کے یادگار ادبی مصرعے۔ محمد یعقوب حاصر۔ ترقی اردو بیورو دہلی۔
- 69- اردو شاعری کا تنقیدی مطالعہ۔ ڈاکٹر منیل نگار۔
- 69- موہن لعل کا ضمیر۔ جہی رام گپتا۔ نکلن بکس لکھنؤ۔
- 70- دیوان غالب کامل کالی داس پگتارشا۔
- 71- ہندوستانی صحافت محمد رفیع صدیقی۔
- 72- دلی کالج میگزین قدیم دلی کالج نمبر۔

- دیوان غالب
- شرح دیوان غالب
- غالب کی شخصیات نظم
- اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ (حاکم علی)
- اردو ادب کی تاریخ (نور محمد)
- تاریخ ادب اردو
- تاریخ ادب اردو (نور محمد)
- انتخاب میں اردو (نور محمد)
- گزشتہ کھنڈ (نور محمد)
- محمد حسین آزاد (نور محمد)
- عمر وراز (نور محمد)
- اکبر الہ آبادی — حیات و کلام (نور محمد)
- آپ حیات
- اردو کا حال
- اردو زبان کیا ہے؟
- امیر خسرو کا ہندوی کلام
- ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مشنویاں
- ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری
- اردو نثر اور ہندوستانی ذہن و تہذیب
- جدیدیت کے بعد
- ترقی پسندی، جدیدیت، مابعد جدیدیت
- اسد اللہ خاں غالب
- بخش ملیانی
- سیح اللہ قریشی
- ڈاکٹر سلیم اختر
- ڈاکٹر جہم کاشمیری
- رام بابو سکیت، مرزا محمد سکری
- محمد اکرام چغتائی
- محمد اکرام چغتائی
- محمد اکرام چغتائی
- محمد اکرام چغتائی
- محمد اکرام چغتائی
- مرتبہ محمد اکرام چغتائی
- محمد حسین آزاد
- رضا علی عابدی
- ڈاکٹر سلیم اختر
- ڈاکٹر گوپی چند نارنگ
- ڈاکٹر گوپی چند نارنگ
- ڈاکٹر گوپی چند نارنگ
- ڈاکٹر گوپی چند نارنگ
- ڈاکٹر گوپی چند نارنگ
- ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

باغ و بہار
(اردو)
پروفیسر محمد علی شاہ

سیر کہسار
چند دن ناصر شاہ

فسانہ آزاد
چند دن ناصر شاہ
(اردو)

ظلم ہو شر با
پروفیسر محمد علی شاہ
(اردو)